قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جون 2014، قیمت -/15

ماہنامہ اردو دنیا
دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

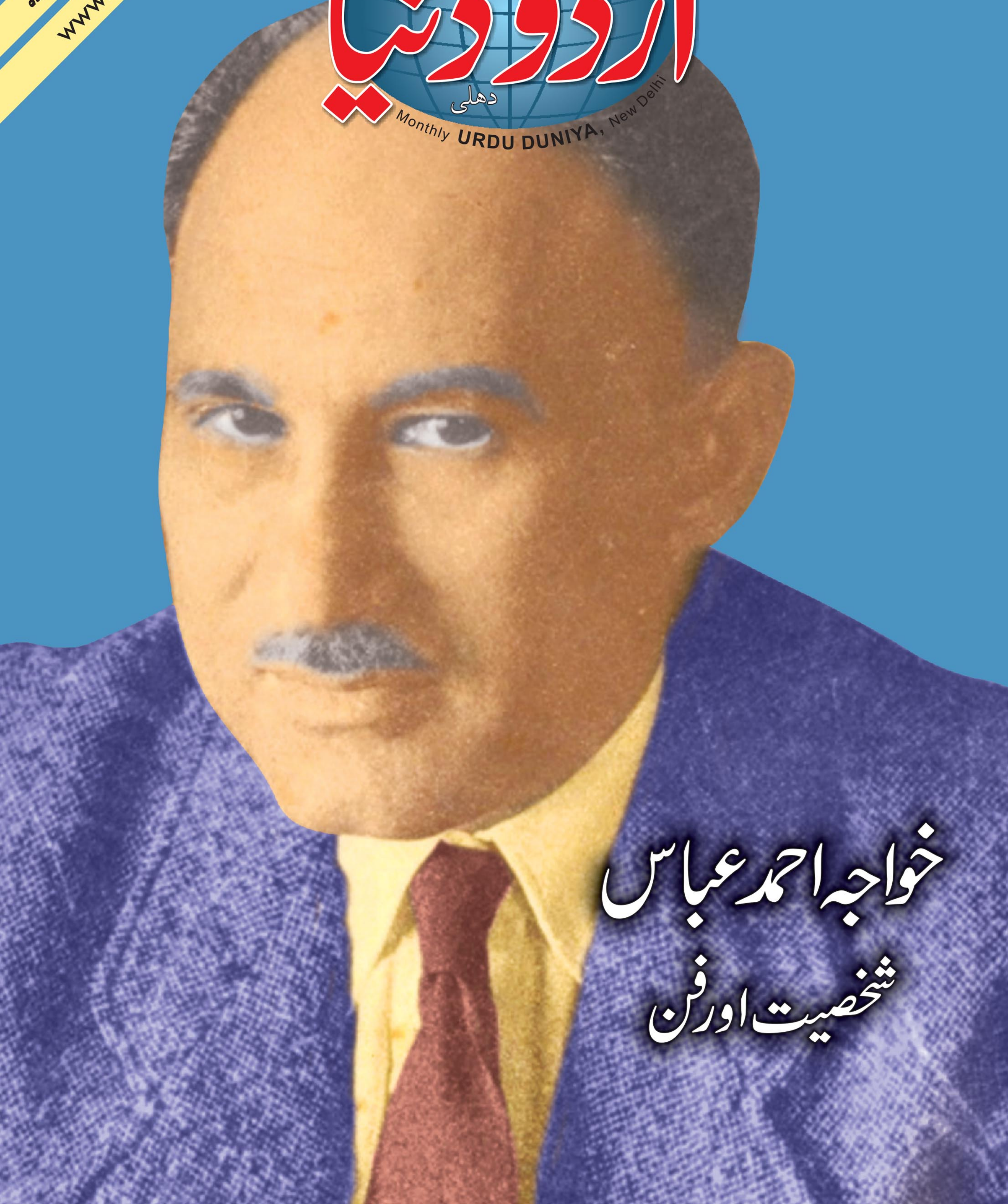

خواجہ احمد عباس
شخصیت اور فن

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:16، شمارہ:06، جون 2014

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: الیس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا

انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: منظر سبحانی

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

email: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746 فیکس: 011-26108159

ای میل: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 2

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو

پروفیسر عتیق اللہ — عبدالحی 8

خصوصی گفتگو

پروفیسر اختر الواسع — شاہد اختر 13

گوشہ خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس — ادارہ 15

خواجہ احمد عباس اور ترقی پسندی — علی احمد فاطمی 16

اردو کا ہمہ جہت عظیم فنکار — ارشاد انصاری 19

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کی اہمیت — قدسیہ نصیر 21

خواجہ احمد عباس کی ناول نگاری — شکیل احمد خاں 24

خواجہ احمد عباس کا فلم سنسار — اسرار انصاری 26

خواجہ احمد عباس کے تین عظیم تحفے — نصرت ظہیر 29

باکردار صحافی — ارتضیٰ کریم 31

اردو ادب و صحافت کے خواجہ — خورشید حیات 33

جہاں لنگڑے لولے مسکراتے رہتے ہیں — خواجہ احمد عباس 35

ابابیل — خواجہ احمد عباس 37

صد سالہ یومِ پیدائش

لمحہ بھر وصل کا شاعر: مجید امجد — محمد امتیاز احمد 39

زبان و تعلیم

اڈیشا میں فارسی زبان کا ارتقا — مطیع اللہ ناز ش 41

ادبی مباحث

ادب اور نفسیات — یوسف صابر 43

اردو ادب میں تذکرۂ کشمیر — عبدالرشید 45

شخصیات

علامہ شبنم کمالی — اشرف استھانوی 48

ایک نغمہ گر شاعر: ساحر لدھیانوی — رہنما شیخ 51

ہماری مطبوعات

پرانے لکھنؤ کی یادیں — مرزا جعفر حسین 52

ہم نے جنھیں بھلا دیا

پریم وار برٹنی — عابد علی خاں 57

تہذیب و ثقافت

اردو ادب اور تیسری دنیا — تسنیم فاطمہ 60

صحت

ڈینگو وائرس — بلال احمد 64

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 67

عالمی اردو نامہ

عالمی خبریں — ادارہ 77

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 80

ہماری بات

کچھ شخصیتیں سماج اور ادب کی زمین میں اتنی گہرائی اور اتنے پھیلاؤ کے ساتھ جذب ہو جاتی ہیں کہ ان کی اہمیت کا تو کیا اکثر ان کی موجودگی غیر موجودگی کا بھی احساس ہمیں نہیں رہتا۔ اردو زبان و ادب اور ہماری تہذیب کے لیے بالعموم اور عوام سے ادب کا رشتہ استوار کرنے والی ترقی پسند تحریک کے لیے بالخصوص، خواجہ احمد عباس ایک ایسی ہی شخصیت تھے۔ ان کے بارے میں جب ہم سوچتے ہیں، ان کے کاموں پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کے فکر و فن کی بات کرتے ہیں تب کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارے قومی سماجی اور ادبی شعور کو نکھارنے سنوارنے اور چمکانے میں ان کا کتنا بڑا ہاتھ تھا اور وہ بذاتِ خود کتنی بڑی ہستی تھے۔ خواجہ احمد عباس کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ اعلیٰ درجے کے فکشن نگار تھے۔ انگریزی اور اردو کی صحافت کو بے باکی و بے خوفی کا سبق پڑھانے والے ایڈیٹر اور کالم نگار تھے۔ سنیما کے میڈیم کو محض تفریح اور وقت گزاری کے دائرے سے باہر نکال کر اسے سماجی شعور کے ارتقا کا ہم سفر بنانے والے فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔ مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے روشن پہلوؤں کی تابناکی میں اضافہ کرنے اور ملکی و عالمی تبدیلیوں کا گہرا مشاہدہ و تجزیہ کرنے والے صحافی تھے۔ اور اس سب کے ماسوا مظلوموں، غریبوں، محنت کشوں، محروم طبقوں اور دبے کچلے لوگوں کے ہمدرد تھے۔ ان ہی کے لیے وہ افسانے اور ناول لکھتے تھے، یہی لوگ ان کی فلموں کے اہم کردار بنتے تھے اور ان کے ہی مسئلوں پر وہ اخبارات و رسائل میں رواں دواں کالم لکھتے تھے۔

خواجہ احمد عباس کی شخصیت کا سب سے روشن پہلو، جس نے انھیں صحیح معنوں میں خواجہ احمد عباس بنایا، یہ تھا کہ وہ کام کو عبادت اور ڈسپلن کو طریقۂ حیات نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان دونوں آدرشوں پر ہمیشہ عمل پیرا بھی رہے تھے۔ ان کے لکھے ہوئے ہزاروں کالم، سیکڑوں کہانیاں، درجنوں ناول، فلمیں اور رپورتاژ اس کے گواہ ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ الگ الگ طرح کے کام وہ ساتھ ساتھ کرتے رہتے تھے۔ صبح کو افسانہ لکھ رہے ہیں تو شام کو اپنا کالم لکھنے بیٹھ گئے۔ ابھی فلم کی شوٹنگ کے لیے لوکیشن ڈھونڈنے نکلے ہیں تو واپسی میں کسی ادبی جلسے میں شرکت ہو رہی ہے۔ رات میں فلم کا اسکرپٹ تحریر ہو رہا ہے تو دن میں ناول کا اگلا باب لکھا جا رہا ہے۔ لکھنے کا موڈ کیا ہوتا ہے، کیسا ہوتا ہے اس کا خواجہ کی زندگی میں دخل ہی نہیں تھا۔ سفر میں بھی کاغذ قلم ان کے ساتھ رہتے تھے۔ اس کے بعد چاہے ریلوے اسٹیشن کا مسافر خانہ ہو یا ریلوے کوچ یا ہوائی جہاز کی سیٹ، جب بھی جہاں کہیں بھی خواجہ صاحب کو وقت ملتا وہ کچھ نہ کچھ لکھنے بیٹھ جاتے۔ ارد گرد کا ماحول ان کی قوت انہماک پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا اور زندگی کے ایک لمحے کو بھی وہ بے کار نہیں جانے دیتے تھے۔

یہ سال خواجہ احمد عباس کی صدی کا سال ہے لہٰذا اس سے زیادہ مناسب و موزوں موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا ان کی زندگی اور کارگزاریوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے۔ موقع کے منصفانہ استعمال کی خاطر اس مرتبہ ہم نے کور اسٹوری کو موقوف کر کے اس کی جگہ خواجہ صاحب کے فن و شخصیت کو ایک گوشے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ان کے تحریر کردہ فکشن، ان کی صحافت اور فلمی زندگی سے متعلق مضامین تو شامل کیے ہی گئے ہیں، ساتھ میں ان کے کالم 'آزاد قلم' کی تحریروں کے نمونوں، ان کی سب سے پہلی کہانی اور بہت سی تصویروں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ امید ہے یہ گوشہ بھی 'اردو دنیا' کے گزشتہ خاص گوشوں کی طرح پسند کیا جائے گا۔

پچھلے دو تین برسوں میں ہم علی سردار جعفری، احتشام حسین، غلام ربانی تاباں، جاں نثار اختر اور ابن صفی جیسی اردو کی متعدد اہم شخصیتوں پر خاص گوشے پیش کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ قومی اور سماجی زندگی کے مختلف گوشوں اور شعبوں میں اردو زبان کی موجودہ صورت حال کیا ہے اس کو بھی ہم نے کور اسٹوریز کی شکل میں موضوع گفتگو بنایا ہے۔ مثلاً اقلیتوں کی تعلیمی ترقی اور اردو، سائبر اسپیس اور اردو، ادب، مذہب اور اردو، بچوں کا ادب اور اردو، ہندوستانی آئین اور اردو، مہاتما گاندھی اور اردو، علاقائی زبان و ادب اور اردو، ہندی زبان و ادب اور اردو، طباعت و اشاعت کی دنیا اور اردو، امیر خسرو اور یوم اردو وغیرہ۔ ان سبھی گوشوں اور کور اسٹوریز کے ذریعے ہم نہ صرف اردو زبان و ادب کے پورے منظرنامے کو پوری طرح سے سمجھنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں بلکہ ان کی بدولت 'اردو دنیا' ہندوستان میں سب سے زیادہ پڑھا اور خریدا جانے والا ادبی و سماجی اردو رسالہ بھی بن پایا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کامیابی میں ہمارے عزیز قارئین کی توجہ اور دلچسپی کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ قارئین کا یہ تعاون اسی طرح جاری رہے گا اور ہم مستقبل میں کامیابی کی نئی منزلیں سر کر سکیں گے!

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

محمد یاسر انصاری

شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

’اردو طباعت و اشاعت کی دنیا‘ سے معنون ’اردو دنیا‘ کا شمارہ مئی 2014 موصول ہوا۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے اپنے انٹرویو میں بے حد خوبصورتی کے ساتھ سینئر صحافی کی 90 سالہ زندگی کے تمام تجربات سے روشناس کروایا ہے۔ وقار ناصری کے مضمون ’عطیہ فیضی: ایک بھولی بسری داستان‘ پر نگاہ پڑتے ہی میں نے دلچسپی کے ساتھ مضمون کو پڑھنا شروع کیا کہ اس میں بھی عطیہ فیضی کی زندگی اور ان کے خطوط سے متعلق کچھ اور اہم و دلچسپ باتیں ہوں گی جیسا کہ اب تک ہم سب پڑھتے آئے ہیں۔ مگر مضمون کے آخر تک آتے آتے یہ بات صاف ہوگئی کہ جس عطیہ فیضی جیسی مشہور اور باصلاحیت شخصیت کو صرف اور صرف علامہ اقبال اور شبلی سے تعلقات اور ان کے خطوط کی بنا پر جانا اور سمجھا گیا، اس نے مسلم معاشرے میں عورتوں کے حقوق اور آزادی، تعلیمِ نسواں اور دیگر تمام برائیوں کے خاتمے کے لیے اہم لڑائی لڑی۔ اس بہترین مضمون کے لیے ہمیں وقار ناصری کا شکرگزار ہونا چاہیے، جنھوں نے مثبت زاویۂ نگاہ سے اس باصلاحیت شخصیت سے ہم سب کو روشناس کرایا۔ ’ادبی مباحث‘ کے کالم میں مضمون ’احتجاج کی ایک منفرد آواز: فیض‘ بھی قابلِ ستائش ہے۔ ڈاکٹر ثوبان سعید صاحب کا مضمون ’رامائن اور مسلمان‘ بھی بہترین مضامین میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر ثوبان سعید نے اپنے مضمون میں منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کے ترجمۂ بالمیکی رامائن کا ذکر کیا ہے، جسے مکمل طور پر نثر میں بتایا ہے۔ ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق کی دو گراں قدر تخلیقات اس وقت راقم السطور کے پیشِ نظر ہیں۔ ایک ’رامائن یک قافیہ‘ جو مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے اور ایک قافیے میں طویل شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ دوسری تخلیق ’شری رام ناٹک‘ ہے جو نثر میں ہے لیکن اس میں بھی درمیان میں اکثر مقامات پر شاعری کی مختلف اصناف کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ لہٰذا اسے بھی مکمل طور پر نثر میں نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں اگر ان دو تخلیقات کے علاوہ رامائن کے حوالے سے دوارکا پرشاد افق کی کوئی اور تخلیق ہے جو مکمل طور پر نثر میں ہو تو میں اس سے واقف نہیں ہوں۔

کرشن بھاوک

201-A، گورونانک نگر، اسٹریٹ نمبر 18-K، پٹیالہ، پنجاب

مئی کے شمارے میں ادارے نے اردو زبان سے متعلق کتب کی طباعت و اشاعت کی دنیا کو جس طرح مضامین کے توسط سے آشکار کیا ہے، وہ فقط اسی جریدہ کا حصہ ہوسکتا ہے۔ فیض جیسی شہرۂ آفاق ہستی پر مبنی مقالہ بحیثیت شاعرِ اعظم کی انفرادیت کی بخوبی نشان دہی کرتے ہوئے گویا کوزے میں سمندر کو ہی مقید کرنے کے ضرب المثل کو ہی صادق کرتا ہے۔ حسرت موہانی کی عہد ساز شخصیت کو بھی عاقل زیاد نے کاملاً اجاگر و نشان زد کیا ہے۔ کلی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ادارہ اردو زبان سے متعلق کوئی بھی پہلو نہیں چھوڑ رہا ہے۔ رہنما شیخ نے نغمہ گو شاعر ساحر لدھیانوی کی شخصیت، و شاعری کا معیاری محاکمہ و محاسبہ کیا ہے۔

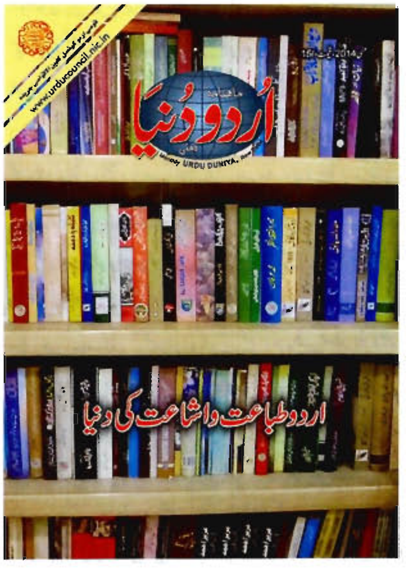

ترنم جبیں

ریسرچ اسکالر، جے این یو، نئی دہلی

مئی کا ’اردو دنیا‘ ہر بار کی طرح کافی اہمیت کا حامل ہے۔ لوگوں کی یہ شکایت ختم ہوجانی چاہیے کہ اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ جب تک NCPUL لگن و ایمانداری کے ساتھ اردو کی خدمت کرتا رہے گا۔ اردو اسی طرح دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہے گی۔

’اردو دنیا‘ کا معیار پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہوچکا ہے۔ محمد عارف اقبال کا مضمون ’اردو کتابوں کی فروخت کا منظرنامہ‘، ناظم علی کا ’جنوبی ہند کے پبلشرز کی اردو خدمات‘، ’علیم صبا نویدی کا ’تمل ناڈو میں اردو کتابوں کی اشاعت (ماضی اور حال کے تناظر میں)‘ ہمیں کافی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ احتشام الحق کا مضمون بھی کافی عمدہ ہے۔ ڈاکٹر شفیع ایوب کے ذریعے لیا گیا کلدیپ نیر کا انٹرویو کافی اچھا ہے، لیکن اس انٹرویو میں تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

’اردو دنیا‘ اپریل 2014 کا شمارہ اپنی امتیازی خصوصیتوں کے ساتھ سبھی حسن طباعت و کتابت، دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ مستند و حد درجہ گراں قدر، فاضلانہ اور محققانہ مضامین کا نادر نمونہ ہے بلکہ بعض مضامین تو قاموسی نوعیت کے ہیں۔ مندرجہ ذیل فاضلانہ اور گراں قدر مضامین سے اپنے محدود علم میں اضافہ ہوا: اردو رسالے اور اردو، رسالوں کی دنیا، ہندوستان میں غیر ملکی اداروں کے رسالے، جامعاتی سطح پر اردو کی تدریس، علی جواد زیدی فن و شخصیت، کیسے پڑھائیں اردو غیر اردو داں طلبا کو، کنہیا لال کپور اور اردو زبان و ادب— شخصیت کے تحت: ارونا آصف علی، تامل ناڈو میں اردو صحافت، شہر آہن جمشید پور اور تبصرے، مندرجہ ذیل قدیم رسالے اردو رسالوں میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا رسالہ منادی، ملا واحدی کا نظام المشائخ، ظفر الملک علائی کا الناظر، خواتین کا رسالہ عصمت۔ علی جواد زیدی ہندوستان کی جنگ آزادی کے سالاروں میں تھے۔ انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ وہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری رہے۔

رحمت کلیم امواوی

جواہر لعل نہرو یونیورسیٹی، نئی دہلی

روایت کے مطابق اپریل کا شمارہ بھی وقت معینہ پر حاصل ہوا، مشمولات دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خاص طور پر وہ مضامین جو ہندوستان میں اردو رسالے کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا۔ ہندوستان میں اردو زبان و ادب بڑی مضبوطی کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر رواں دواں ہے۔ ذاتی طور پر

میرا یہ ماننا ہے کہ قومی اردو کونسل، اردو کی ترویج وترقی کے معاملے میں دیگر تنظیموں پر فائق ہے۔ این سی پی یو ایل نے اردو کو فروغ دینے کے لیے جو کچھ اقدامات کیے ہیں اگر ہم اس کا مختصراً ہی جائزہ لیں تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ میرے اس دعوے میں کتنی صداقت ہے، ماہنامہ اردو دنیا، سہ ماہی فکر وتحقیق، ماہنامہ بچوں کی دنیا، بیشتر انگلش کتابوں کا اردو میں ترجمہ، موبائل میں اردو سافٹ ویئر کے شمولیت کی کوشش، اردو کتابوں کو آن لائن کرنا، جگہ جگہ پر اردو کی ترویج واشاعت کے لیے سمینار وسمپوزیم اور مشاعرے کروانا وغیرہ یہ وہ تمام کارنامے ہیں جن کے سہارے قومی کونسل اپنی پوری ٹیم کے ساتھ اردو کے تئیں بڑے خلوص ومحبت کا ثبوت فراہم کرتی آرہی ہے۔

محمد سعید پٹیل مہرونی

اقصیٰ نگر مہرون، جلگاؤں، مہاراشٹر

’اردو دنیا‘ کا اپریل 2014 کا شمارہ دستیاب ہوا۔ اردو رسائل سے متعلق خصوصی معلومات پر مبنی یہ رسالہ بڑے خاصے کی چیز ہوگیا ہے۔ نقش لائل پوری کا انٹرویو بھی فلمی دنیا کے کئی مخفی گوشوں کو وا کرتا ہے۔ البتہ نورالحسنین کے ناول پر لکھا جناب حسین الحق کا تبصرہ کچھ ادھورا سا محسوس ہوا۔

محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

اپریل کے ’اردو دنیا‘ کے سرورق پر رسالوں کی دنیا اور اردو عنوان دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس میں تمام ہندوستان کے معیاری مقبول رسالوں کا احاطہ کیا گیا ہوگا۔ ہماری بات میں مدیر نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد شائع ہونے والوں رسالوں کے موقف اور اس کی اشاعت اور رسالوں کی خصوصیات۔ صفات وکردار پر روشنی ڈالی اور پرنٹ میڈیا برقیاتی میڈیا دونوں کا تعاون پیش کیا۔ اشتیاق سعید کا مکالمہ نقش لائل پوری فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے۔ نقش لائل پوری کی زندگی کے نشیب وفراز سے آگہی حاصل ہوئی۔ میرے خیال میں تیلگو، ہندی، مراٹھی، تامل وغیرہ کے رسائل آج بھی نکلتے ہیں اور متعلقہ زبان کے افراد خرید کر پڑھتے ہیں۔ کاش اردو والے بھی ایسا کرتے تو آج رسالوں کا ایسا حشر نہیں ہوتا۔ سہیل انجم نے سرکاری، غیر سرکاری ادبی غیر ادبی رسالوں کی اشاعت، کوائف کو حقائق کے ساتھ بیان کیا اور اردو رسالوں کی بقا اور فروغ پر روشنی ڈالی۔ امتیاز علی تاج کے ڈراما انارکلی کا تجزیہ بھی نئے انداز سے کیا گیا ہے۔ اردو قارئین اور عبدالسلام صدیقی سے ایک معصومانہ سوال کرسکتا ہوں کہ انارکلی فسانہ ہے یا حقیقت؟۔

پرویز اشرفی

ڈی 321، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

’اردو دُنیا‘ ماہ اپریل 2014 کا شمارہ بہت اہم ہے۔ یہ امتیازی خصوصیات یعنی حسن طباعت وکتابت کے ساتھ ساتھ گراں قدر اور بصیرت افروز مضامین کا مجموعہ ہے۔ کور اسٹوری کے تحت نصرت ظہیر کا مضمون ’اردو رسالے اور اردو‘، سہیل انجم کا ’رسالوں کی دُنیا‘، شگفتہ یاسمین کا مضمون ’ہندوستان میں غیر ملکی اداروں کے اردو رسالے‘، ڈاکٹر زرنگار کی تخلیق ’ادب اطفال اور بچوں کی دنیا‘، ’بچوں کی دُنیا اور دوسرے رسالے‘، ’جدید تکنیکی وسائل اور اردو زبان‘، امتیاز علی تاج کا ڈراما ’انارکلی‘، محمد شمیم اختر کا مضمون ’طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری اور فکر تونسوی‘ وغیرہ بے حد معیاری مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں زبان وادب اور شخصیات پر مبنی مضامین بھی اچھے ہیں، بالخصوص اختر ’اورینوی کی افسانہ نگاری‘، ’خاموش طبیعت افسانہ نگار کی موت‘۔ شہر بین کالم کے تحت نیاز احمد آسی کا مضمون ’شہر آہن جمشید پور‘ قابل تحسین ہے۔

ڈاکٹر وکیل احمد رضوی

صدر شعبۂ اردو، امگڑھ کالج رامگڑھ

’اردو دنیا‘ کا ہر شمارہ اہم ہوتا ہے۔ اس کے بیشتر موضوعات میں بھرپور معلومات ہوتی ہے۔ اپریل 2014 کا شمارہ بھی بہت خوب ہے۔ اردو رسالے اور اردو کے عنوان سے نصرت ظہیر، سہیل انجم اور شگفتہ یاسمین کی کور اسٹوری ایک تلخ حقیقت ہے۔ لیکن اردو دنیا دیکھ کر احساس محرومی جاتی رہتی ہے۔ بڑے سے بڑے اسٹال پر دیدہ زیب رسالوں کے درمیان پہلی نظر میں اپنی ظاہری ہیئت اور مشمولات اردو رسالوں کے وقار کو بلند کرتا ہے۔ قومی اردو کونسل کا بچوں کی دنیا اردو کی گراں قدر خدمت انجام دے رہا ہے۔ جامعاتی سطح پر اردو کی تدریس پروفیسر صغیر افراہیم کا نہایت مفید مضمون ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لیے ملکی سطح پر اردو زبان وادب کی قدآور شخصیتوں کو مل بیٹھ کر ایک ایسا نصاب تیار کرنا چاہیے، جو ہمیں اردو زبان وادب کے ابتدائی مراحل سے واقف کرانے کے ساتھ ساتھ حال کو خوش گوار اور مستقبل کو تابناک بنانے کی کوشش کرے۔ ادبی مباحث کے طور پر دم توڑتی ہوئی اصناف مثنوی اور ڈرامے کی اہمیت سے ہمیں روبرو کرایا گیا ہے۔

مرزا عبدالقیوم ندوی

اورنگ آباد، مہاراشٹر

جناب مدیر صاحب ماہ اپریل کا اردو دنیا کا خصوصی شمارہ بعنوان ’رسالوں کی دنیا اور اردو‘ موصول ہوا، پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اردو رسائل پر اتنا معلوماتی شمارہ اس سے قبل میری نظر سے نہیں گزرا۔ آپ کا اداریہ اچھا ہی ہوتا ہے۔ اس شمارے میں نصرت ظہیر کا مضمون ’اردو رسالے اور اردو‘ بھی خوب ہے۔ اسی طرح محترمی سہیل انجم کا مضمون ’رسالوں کی دنیا‘ تو یقیناً اس لائق ہے کہ اس کی ہزاروں کی تعداد میں فوٹو کاپی کر کے تقسیم کیا جائے۔ جلگاؤں کے صحافی مشتاق کریمی کا مضمون ’بچوں کی دنیا‘ مبنی برحقیقت ہے، انھوں نے موجودہ اردو رسائل کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ میں جو بات کہنے جارہا ہوں کوئی شکایتاً نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس طرح کے رویہ سے ہم جیسے زمینی سطح پر کام کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ نصرت ظہیر صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا کہ ’’ایک دن اخباروں نے خبر چھاپی کہ ’بچوں کی دنیا‘ کے پانچ ہزار شمارے ایک ہی دن میں ایک ہی شہر میں فروخت ہوگئے جو ایک عالمی اردو ریکارڈ ہے۔ یہ واقعہ مالیگاؤں میں پیش آیا۔ کسی نے بتایا کہ ’بچوں کی دنیا‘ کی ایک لاکھ سے زیادہ کاپیاں صرف ساٹھ دنوں میں فروخت ہوئی ہیں اور یہ بھی اردو رسالوں کا ایک ورلڈ ریکارڈ ہے۔ اس کے بعد یہ خبر آنے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا کہ ’بچوں کی دنیا‘ کی تعداد اشاعت 67 ہزار تک پہنچ چکی ہے اور یہ اردو کے کسی بھی جریدے کی سب سے زیادہ اشاعت کا ہندوستانی ریکارڈ ہے۔ ہندی اور مراٹھی کے اخباروں میں بھی اس رسالے کا تذکرہ آیا۔‘‘

یہ ذکر تو کیا کہ ایک دن میں اتنی کاپیاں فرخت ہوگئیں۔ آگے یہ بھی لکھا کہ ’’یہ واقعہ مالیگاؤں میں پیش آیا‘‘ یہ بات غلط ہے۔ یہ کارنامہ مالیگاؤں میں نہیں اورنگ آباد میں ہوا ہے۔ اخبارات میں مالیگاؤں کا کہیں ذکر نہیں۔ موصوف آگے لکھتے ہیں کہ ’’کسی نے بتایا کہ بچوں کی دنیا کی ایک لاکھ سے زیادہ کاپیاں صرف ساٹھ دنوں میں فروخت ہوئی ہیں۔‘‘ کیوں صاحب ’کسی نے بتایا‘ کی جگہ بتانے اور بیچنے والے کا نام لینا کوئی گناہ ہے کیا؟ یا کوئی شجر ممنوعہ ہے؟ جناب پورا پیراگراف پڑھیے اس میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ ’بچوں کی دنیا‘ جو مہاراشٹر کے سینکڑوں گاؤں میں پہنچ رہا ہے اور صرف ساٹھ دنوں میں اس کی ایک لاکھ کاپیاں فروخت ہوئی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوا ہے، کون سی مشنری کام کر رہی ہے، محنت کرنے والے کا ذکر سرسری طور پر ہی سہی، آجاتا تو کیا اچھا ہوتا؟ ہاں اس میں میری تصویر ضرور ہے، مراہٹی اخبار کی کٹنگ بھی ہے، میں نے جو پوسٹر بنایا تھا وہ بھی ہے، اگر اس کے نیچے ایک لائن کا کیپشن لکھ دیا جاتا کہ یہ کیا ہے، تصویر میں کون کھڑا ہے، مراہٹی میں کیا لکھا ہوا ہے یا اگر بتا دیا جاتا تو نصرت صاحب کا کیا جاتا، ہاں البتہ یہ ضرور ہوتا کہ میرا حوصلہ بلند ہوتا خوشی ہوتی کہ چلو ہماری محنت کی قدر کی

جارہی ہے۔ یہ بات بھی بتانا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں نے صرف اورنگ آباد میں سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کے سالانہ سو (100) ممبر بنائے ہیں۔ اسی طرح اردو دنیا کے تین سو (300) سالانہ خریدار بنائے ہیں۔ میں آپ سے دست بدست عرض کرتا ہوں کہ مجھے بتایا جائے کہ میرے علاوہ بھی کوئی شخص ہے جو ایک شہر میں اردو دنیا اور فکر و تحقیق کے اتنے زیادہ سالانہ ممبر بنا پایا ہو۔ بچوں کی دنیا کا تو ذکر ہی چھوڑ دیجیے اس کے مستقل سالانہ 1600 خریدار بنائے ہیں۔ قصہ مختصر اگر آپ لوگوں کو میری بات بری لگی ہو تو معافی کا خواستگار ہوں، امید ہے دامن عفو و درگزر میں جگہ دیں گے۔

متذکرہ حوالوں کی درست اور مصدقہ معلومات مضمون نگار کو نہیں تھی۔ مراسلہ نگار نے یہ حوالے دے دیے، اس کے لیے شکریہ (ادارہ)

شکیل سہسرامی

یو ایس بی ایل سی پٹنہ

اُنچاس رنگوں سے مزین اُنچاس خانوں والا خوش نما سرورق لیے اپریل 2014 کا تازہ ترین اردو دنیا کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ہر بار کی طرح اس بات کا اداریہ بھی ذہنی بیداری عطا کرتا ہے۔ اداریہ انتہائی سلیس اور سنجیدگی سے بھرا پڑا ہے۔ نقش لائل پوری کے انٹرویو میں اشتیاق صاحب کا خصوصی اشتیاق جھلکتا نظر آتا ہے۔ انٹرویو کا نواں سوال اور اس کا جواب اچھا لگا جواب آج کل پر زیادہ صادق آتا ہے اردو رسالوں سے متعلق سبھی مضامین بھرپور ہیں۔ اردو دنیا کا کمال یہ ہے کہ اس رسالے میں ہر ذائقے کی تخلیق پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ وہ بھی سیر حاصل۔ امتیاز علی تاج صاحب کی امتیازی تخلیقی انارکلی پوری دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ ارونا علی صاحب کو سمجھنا عام ذہن کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور رینوی صاحب کا پٹنہ آج بھی ان کی یادوں سے آباد ہے۔ شہر آہن سے متعلق نئی نئی معلومات سے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ سجاد صاحب کا مضمون بے حد خوش کن ہے۔ تبصرہ و تعارف اتنا اچھا ہوتا ہے کہ ایک بار پڑھنے سے جی نہیں بھرتا ہے۔

سلیم انصاری

جبل پور

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ کئی معنوں میں اہم ہے۔ اردو رسائل کے حوالے سے اس شمارے میں خاصا مواد جمع کر دیا گیا ہے جس کے لیے آپ یقینی طور پر قابل مبارکباد ہیں۔ سہیل انجم اور شگفتہ یاسمین کے مضامین ہمیں اردو کے رسائل کی تاریخ اور ان کی ارتقا سفر کے بارے میں خاطر خواہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اب اردو کے رسائل نئی ٹیکنالوجی کی روشنی میں نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہے ہیں، اور ان کی ترسیل بھی گلوبل ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں اردو زبان و ادب کا وقار اور دائرہ وسیع ہوا ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ اردو میں ادب کی تخلیقی صورتِ حال معیار کے اعتبار سے زیادہ خوش آئند نہیں پھر بھی یہ بات اطمینان بخش ہے کہ اردو زبان کے پھیلاؤ کے امکانات مزید روشن ہوئے ہیں اور اس کی خوشبو سرحدوں کو عبور کرتی جارہی ہے۔ ہمیں اس بات کا کھلے طور پر اعتراف کرنا چاہیے کہ اردو کی مقبولیت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات قابل قدر ہیں۔

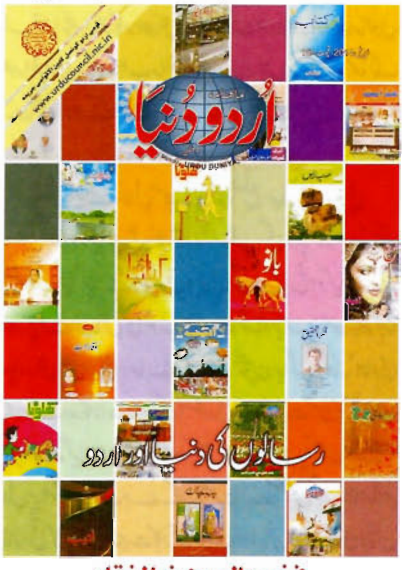

فخر عالم بن ذوالفقار

سنسار پور، ضلع لکھیم پور کھیری

'اردو دنیا' اپریل 2014 کا شمارہ بشکل بحرِ علم نظر نواز ہوا۔ اداریہ اور کور اسٹوری دونوں بے مثال ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم کا مضمون 'جامعاتی سطح پر اردو کی تدریس' میں اردو کی درس و تدریس کے حوالے سے پروفیسر صاحب نے جن دشواریوں کی طرف توجہ دلائی ہے وہ قابل غور ہے۔ اسکول و مکتب کا جب جامعاتی سطح پر ہی ہماری ایجوکیشن پالیسی اتنی خستہ حال ہے تو بہتر مستقبل کے خواب دیکھنا بے ایمانی ہوگا۔ اس کے علاوہ مارچ 2014 کے شمارے سے بھی راقم کو ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ صفحہ 48 پر محمد طیب شمس صاحب کے مضمون 'ذوق کا نظریہ تعلیم' میں ذوق کا ایک شعر یوں رقم کیا گیا ہے:

وقت پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

ٹھیک یہی شعر اس کے اگلے صفحے (نمبر 49) پر یوں درج ہے:

وقت پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

ان دونوں اشعار میں شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ 'جیسی' اور 'جیسے' میں تفریق ہے۔ صحیح لفظ کیا ہے؟

صحیح لفظ جیسے ہے (ادارہ)

الحاج شفیق احمد

استاد مدرسہ انوار العلوم، رام نگر، ضلع بارہ بنکی

ماہ نامہ اردو دنیا شمارہ اپریل 2014 کے سرورق پر لکھا ہوا 'رسالوں کی دنیا اور اردو' نیز مختلف رسالوں کی خوبصورت تصاویر کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ حسنِ انتخاب، حسن طباعت و کتابت کے ساتھ ساتھ معلومات سے بھرپور بصیرت افروز مضامین کا ایک نایاب تحفہ ہے۔ چمکتے ہوئے سورج کی طرح یہ بات عیاں ہے کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے جو کام کیا جارہا ہے اس کا فائدہ براہِ راست قوم و ملت کو ہو رہا ہے۔ ہماری بات میں مدیر نے اردو زبان و ادب کے ارتقا میں اردو رسالوں کے اہم کردار پر گفتگو کرتے ہوئے عصر حاضر میں اردو رسالوں کا جو جائزہ پیش کیا ہے وہ پوری طرح سے حقیقت پر مبنی ہے۔ آج بھی انٹرنیٹ کے اس دور میں رسالوں کی اہمیت باقی ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گی۔ کور اسٹوری میں شامل سبھی مضامین بڑے ہی دلچسپ انداز میں قلمبند کیے گئے ہیں۔ نصرت ظہیر صاحب کا مضمون 'اردو رسالے اور اردو' کیا ہی دلچسپ اور معلومات سے بھرپور ہے۔ اردو اور اردو رسالوں کے متعلق بہت ہی اچھی تجویز پیش کی ہے کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان اور اردو کے ہر رسالے کو محض اسلامی رسالہ بنانے کی ہر کوشش کو ناکام کیا جائے ساتھ ہی سرکاری سطحوں پر اردو زبان کو ترقی اور فروغ دینے کے جتنے بھی موقعے موجود ہیں ان سے استفادہ حاصل کیا جائے صرف اردو کا مرثیہ پڑھنے سے کام چلنے والا نہیں ہے۔ سہیل انجم کا مضمون 'رسالوں کی دنیا' بہت ہی مفکرانہ اور محققانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر شائع ہونے والے اردو کے رسالوں کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے جو کہ معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ کئی ملکوں کی سیر کراتا ہے۔ زرنگار کا مضمون 'ادب اطفال اور بچوں کی دنیا'، مشتاق کریمی کا مضمون 'بچوں کی دنیا اور دوسرے رسالے' بہت ہی خوبصورت انداز میں قلمبند ہیں۔ قومی اردو کونسل کے ذریعے بچوں کی دنیا جیسا خوبصورت اور معیاری رسالہ کی اشاعت بچوں کو اردو زبان و ادب سے جوڑنے کی نہایت عمدہ کوشش ہے۔

محمد سجاد حسین سجاد پورنوی

مقام: سیواٹولی، وایا: بائسی، ضلع: پورنیہ، بہار

'اردو دنیا' اپریل 2014 کا شمارہ عمدہ و دیدہ زیب طباعت کے ساتھ ساتھ معیار و توازن میں بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ نصرت ظہیر صاحب کا 'اردو رسالے اور اردو' اور جناب سہیل انجم کا 'رسالوں کی دنیا' جیسے وقیع و گراں قدر مضامین شامل اشاعت ہیں، جن سے ہندوستان میں اردو صحافت اور اردو سے دلچسپی و لگاؤ کا

بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ سہیل انجم کے مضمون میں سالنامے، ماہنامے، سہ ماہی، پندرہ روزہ ہفت روزہ اور روزنامے تقریباً معیاری وغیر معیاری رسائل وجرائد تعارف وتذکرہ اور تصاویر کے ساتھ زینت اشاعت ہوئے ہیں لیکن صوبہ بہار کے واحد ادبی، علمی، تحقیقی اور مذہبی رسالے سہ ماہی 'المجیب' کا نام تک نہ آنا باعث حیرت واستعجاب ہے، چونکہ اردو زبان وادب میں 'المجیب' کی بے لوث خدمات کا ایک جہان معترف رہا ہے، 2013 کا 656 صفحات پر مشتمل خصوصی شمارہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے معروف ومشہور رسائل سہ ماہی 'دیوان' پٹنہ، ماہنامہ 'خضر راہ' اور ششماہی 'الاحسان' الہ آباد جیسے موقر رسالے بھی تعارف وتذکرہ سے رہ گئے ہیں۔

ظہیر ایس خان
بیاول، ضلع جلگاؤں

اپریل 2014 کا شمارہ تھوڑی تاخیر سے ملا۔ حسب معمول رسالہ خوشنما اور معیاری مشمولات پر مبنی ہے۔ ہاں موجودہ شمارہ کے صفحہ نمبر 19 پر 'بچوں کی دنیا اور دوسرے رسالے' اس عنوان کے تحت مشتاق کریمی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ ہم اردو والے اس بات کا رونا روتے ہیں کہ ریاستی ومرکزی سرکاریں اردو اخبار و رسائل نہیں نکالتیں مثال کے طور پر مہاراشٹر اردو اکادمی کا امکان، مدھیہ پردیس اردو اکادمی کا رسالہ، راجستھان اکادمی کا نخلستان، ہریانہ کا جمنا تٹ اور تعمیر ہریانہ دہلی حکومت کا پالیکا سماچار وغیرہ اور حکومت مہاراشٹر کا لوک راجیہ متواتر نہیں نکلتے۔ موصوف نے اس کا تو رونا رویا نہیں بلکہ یہ بات جگ ظاہر ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے قومی کونسل فکر وتحقیق، بچوں کی دنیا، اردو دنیا بڑے طمطراق و معیار کو قائم رکھتے ہوئے شائع کر رہی ہے اور یہ تینوں رسائل اردو دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ قلمکار کے مضمون سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ہی نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ اردو میں رسالے نکالنے کی ایک ہوڑ مچی ہوئی ہے۔ کچھ لوگ انکساری وخاکساری سے اپنے رسائل نکالتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ بچوں کی دنیا کے وجود میں آنے کی وجہ سے ان کی رسائل کی ترسیل میں کوئی فرق آیا ہو۔ واقعہ یہ بھی ہے کہ ہمارے رسائل ان قلمکاروں کو جن کی تخلیقات ان کے رسائل میں شائع ہوتی ہیں انھیں محنتانہ تو دور اعزازی کاپی بھی نہیں دی جاتی۔ آپ کی کاوشوں کے ہم معترف ہیں اور آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شریف الدین خاں
سابق ادھیکشک، سہ ضلع آیوروید ادھیکاری، رائے پور

اپریل کے شمارے میں اردو رسالوں کے متعلق تفصیل سے مقالے شائع ہوئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ کہاں سے اردو رسائل شائع ہو رہے ہیں اور اردو کی آبیاری اور توسیع میں کتنا اہم رول ادا کیا ہے۔ بچپن سے ہی ہمارے گھر میں مختلف رسائل آتے تھے جن میں شمع، بانو، کھلونا، غنچہ، بجنور، شبستاں، خاتون مشرق، آستانہ، دین دنیا، بیسویں صدی، مولوی، پیام مشرق، شاعر، آجکل اور دیوان مفتون سنگھ کا شمع قابل ذکر ہیں۔ آئینہ جو اس وقت بہت خوبصورت رسالہ رہا اس طرح سوویت دیش جو 12 زبانوں میں شائع ہوتا تھا اور سوویت یورپین جو ماسکو سے شائع ہوتا تھا۔ درمیان میں اردو اور اردو رسالوں کا مشکل دور رہا مگر اب فضا پھر سازگار ہو رہی ہے۔ لوگ اردو اور اردو رسالوں اور اخباروں کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔ بیرونی ممالک سے بھی اردو کے اچھے رسالے شائع ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر شمیم دیوبندی
فیض کلینک، لال مسجد دیوبند، ضلع سہارنپور، یوپی

اردو دنیا اپریل کا شمارہ 'رسالوں کی دنیا اور اردو' سے منسوب کیا گیا ہے۔ سرورق دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا کہ نئے اور پرانے رسائل کی خوب صورت تصاویر اپنے منھ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔ کئی رسالے دیکھ کر تو بچپن جاگ اٹھا۔ 'ہماری بات' بے حد کارآمد ہے۔ کور اسٹوری میں نصرت ظہیر کا مضمون مزہ دے گیا۔ ان کے علاوہ سہیل انجم، شگفتہ یاسمین، زرنگار دل پر اچھی دستک دے گئے۔ صحت سے متعلق شمس الاسلام فاروقی کا مضمون بہت کارآمد ثابت ہوا۔ خبرنامہ اتنا ہی وزن رکھتا ہے۔ جتنا دوسرے حصے میں دیگر تخلیقات۔

اقبال مجید اللہ
پلاٹ نمبر 69، یوسف کالونی، پربھنی (مہاراشٹر)

'اردو دنیا' کا ماہ اپریل 2014 کا شمارہ ایک طرح سے اردو رسالوں کی دنیا کا خصوصی اور دستاویزی شمارہ ثابت ہوا۔ آپ نے اپنے اداریے میں اس حقیقت کا بھی اظہار کیا ہے کہ جب اردو رسالے کی بات آتی ہے ہمارے ذہن میں صرف ادبی رسالہ ہوتا ہے۔ ایک ایسے اردو رسالے جس میں ادب کے علاوہ مذہب، سیاست، سماج، معیشت، تعلیم، قانون، سائنس، انٹرنیٹ جیسے اہم شعبوں پر مشتمل ہوا ایسے اردو جریدے کا انتظار ہے۔ فروغ اردو کونسل نئی دہلی اس صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے اس کے ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سماجی وسیاسی علوم کے موضوعات پر کم از کم دو یا تین مضامین اس کے لیے مختص کرے تاکہ ان علوم میں بھی پڑھنے لکھنے والوں کی دلچسپی برقرار رہے گی۔

عزیز اسرائیل
مدیر اعلیٰ سہ ماہی 'اردو ریسرچ جرنل' A-71، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

جب سے اردو دنیا نے مختلف موضوعات پر خصوصی گوشوں کا آغاز کیا ہے نئے نئے موضوعات پر گوشے سامنے آرہے ہیں۔ خاص طور پر خواجہ اکرام الدین نے موضوعات میں جدت طرازی سے کام لیا ہے۔ اردو دنیا کے اپریل کے شمارے میں آپ نے 'اردو رسالوں کی دنیا اور اردو' پر ایک اہم گوشہ نکالا۔ سرورق پر ان رسالوں کو دیکھ کر دل خوش ہوگیا جنھیں ہم ایک زمانے سے پڑھتے آئے ہیں۔ اردو رسالے ہمیں ادبی سرگرمیوں سے واقف کراتے ہیں۔ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہم عصر ادب کس رخ پر جارہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انھی رسالوں نے کئی ادبی تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ خصوصی گوشہ میں سہیل انجم کا مضمون 'رسالوں کی دنیا' اس گوشہ کا حاصل ہے۔ سہیل انجم کے پاس صحافت سے متعلق معلومات کا خزانہ ہے۔ محترمہ شگفتہ یاسمین نے اگرچہ اس حوالے سے ایک نئے موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن انھوں نے کویت سفارت خانہ سے اردو میں شائع ہونے والے رسالے کا ذکر نہیں کیا۔ اگر معلوم کیا جائے تو اس طرح کے اور بھی رسالے ہوسکتے ہیں انھوں نے صرف دو تین رسالوں کے تعارف تک ہی اپنے مضمون کو محدود رکھا۔ اردو میں کئی رسالے آن لائن بھی شائع ہوتے ہیں۔ ماہنامہ 'سمت'، سہ ماہی اردو اسکالر کی دنیا' اور حال ہی میں راقم کی زیرادارت شائع ہونے والا سہ ماہی 'اردو ریسرچ جرنل' بھی انھی رسائل میں شامل ہے۔ اگر ایک مضمون اردو کے برقی رسائل پر بھی شامل کرلیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ صغیر افراہیم کا مضمون فکر انگیز ہے۔ مشاہیر ادب میں علی جواد زیدی کی شخصیت اور ان کے کلام کا انتخاب بھی خوب ہے۔ البتہ ڈرامہ انارکلی پر لکھا گیا مضمون ایک روایتی انداز کا ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں اور مضامین کی جگالی کرتا نظر آتا ہے۔ 'کتابوں کی دنیا' میں شائع ہونے والے تبصروں پر مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی
عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' عصر حاضر کا ایک اہم ترین، معلوماتی اور معیاری رسالہ ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ گزشتہ تقریباً پندرہ سالوں سے اردو کے جن رسائل کا پابندی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہوں اس میں ماہنامہ 'اردو دنیا' سرفہرست ہے۔ یہ رسالہ اپنے آغاز سے ہی اردو کے عام رسالوں سے کافی مختلف ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ گزشتہ پندرہ سالوں کے دوران یہ رسالہ صوری اور معنوی لحاظ سے کئی بار نئی تبدیلیوں سے بھی دوچار ہوا ہے مگر اس کی ہر تبدیلی معیار ومزاج کی برقراری کے باوجود اس میں مزید وسعت وہمہ گیری کا باعث ثابت ہوئی ہے اور وقت حالات کے پیش نظر انھیں مثبت تبدیلیوں نے 'اردو دنیا' کو ایک عالمی معیار کا بہترین علمی وادبی رسالہ بنا

دیا ہے۔ یہ خبر بھی باعث مسرت ہے کہ طوطی ہند حضرت امیر خسرو کی یوم پیدائش 3 مارچ 1253 کو یوم اردو کے طور پر منانے کی قومی کونسل کی تجویز کو حکومت ہند نے منظوری عطا کردی ہے لہٰذا اس کے لیے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی خصوصاً مستحق مبارکباد ہیں۔ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ بابت مارچ 2014 پیش نظر ہے۔ حسب دستور رسالہ اپنی مشمولات، ترتیب وتہذیب، مواد اور گٹ اَپ ہر لحاظ سے 'کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست' کے مترادف ہے۔ اس شمارے میں حضرت امیر خسرو سے متعلق کوراسٹوری کے طور پر جو چار مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ موقع و محل کے اعتبار سے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ دیگر مضامین میں 'زبان کی تدریس اور بچوں کا ادب'، 'مولانا محمد حسین آزاد کی تعلیمی اور تدریسی خدمات'، 'افسانچوں کی عالمی گونج'، 'بڑا ہے درد کا رشتہ' وغیرہ اور مستقل کالم معلوماتی اور کارآمد ہیں۔

منظر عباس

معاون ایڈیٹر روزنامہ ہمارا نعرہ، پٹنہ، بہار

قومی کونسل دہلی نے وہی کام انجام دیا ہے جیسے 'خزاں میں بہار آگئی ہو۔ ہر طرف قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے کاموں کو سراہا جارہا ہے۔ اردو زبان کا بام عروج کی منزل پر پہنچنے میں آپ کا بھرپور تعاون ہے۔ آپ کی محنتوں سے نئے ادیبوں کو، شعرا کو کافی تقویت ملی ہے ان کی کتابوں کی خریداری سے آپ نے ان کے عزم وحوصلے میں نئی روح پھونکی ہے۔ اردو کو ہندوستان میں اور بیرونی ملکوں میں آپ کی محنتوں نے جو روشنی بخشی ہے وہ تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھی جائیں گی۔

ڈاکٹر ولایت محمد حسین حسرت

ازسونی گام اننت ناگ کشمیر

'اردو دنیا' کا گوشہ علی سردار جعفری دیکھا۔ رنگارنگ مضامین کی ایک جیتی جاگتی آپ بیتی جلوہ فگن تھی، سچ مانیے پورا شمارہ بہت پسند آیا۔ جعفری صاحب کا جمہور نامہ جو آپ نے غالباً 11 ستمبر 1946 میں تحریر فرمایا ہے، انتہائی دلکش ہے۔ راقم نے حال ہی میں اقبال کے 'ساقی نامہ' کا کشمیری میں ترجمہ کیا ہے مگر جمہور نامہ دیکھ کر محسوس ہوا کہ جعفری صاحب کا اصل ادبی اور سیاسی منظر نامہ آپ اپنی مثال کا ہے۔

حضور سہسوانی

راز منزل، چودھری محلہ، سہسوان

'اردو دنیا' کے مارچ 2014 کے شمارے میں کرشن بھاوک کے خط میں راشد انور راشد کے جاں نثار اختر سے متعلق مضمون میں استعمال لفظ 'کریہہ' کا صحیح املا 'کریۂ' لکھا ہے۔ جو درست نہیں ہے۔ 'کریہہ' ہی درست ہے، دیکھیں فیروز اللغات (ص 1006) کریہہ الصوت۔ کریہہ منظر۔ اسی سے مرکب ہے۔ موصوف نے اپنے مضمون 'امیر خسرو- شیریں زبان اور رنگین بیان شاعر' میں حسب ذیل شعر کوٹ کیا:

نہ معلوم یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

پہلا مصرعہ خارج از وزن ہی نہیں ہے۔ شعر بھی اس طرح درست نہیں ہے۔ خلیق الزماں نصرت صاحب کی مرتبہ کتاب برمحل اشعار میں یہ شعر یوں درج ہے:

خدا جانے یہ کس کی جلوہِ گاہِ ناز ہے دنیا
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی (امیر لکھنوی)

مگر میری معلومات کے مطابق یہ شعر اس طرح ہے جو درست بھی لگتا ہے:

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

پروفیسر جمال نصرت

روشنی، 509/148، اولڈ حیدرآباد، لکھنؤ

'اردو دنیا' مارچ 2014 ملا۔ ہر بار کی طرح یہ بھی بہت اہم شمارہ ہے اور سبھی مضامین بہت خوب ہیں۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ فوراً خط لکھ دیتا لیکن محمد سفیان صاحب کے شہد: ایک قدرتی غذا اور لاجواب دوا پڑھا اور پھر اپنی نجی پریشانی کے لیے استعمال شروع کیا اور سوچا کہ اثر بھی ہوجائے تو پھر آپ کو خبر کروں۔ یہ سانس کی شکایت میں میں نے استعمال کیا اور بہت فائدہ ہوا تو پھر اب 15 دنوں کے استعمال کے بعد آپ کو اور سفیان صاحب کو شکریہ پیش ہے اور خط اس لیے کہ دوسروں کو بھی یہ معلومات ہوجائے۔ ڈاکٹر صبیحہ انور صاحبہ کا ترجمہ شدہ مضمون اب کوئی نہیں آتا ہے یہاں، جو مشہور افسانہ نگار رام لعل صاحب کے سلسلے سے ہے دیکھا۔ بہت جذباتی اور سچائی پر مبنی تحریر ہے۔ ایک اور مضمون 'افسانچوں کی عالمی گونج' بھی بہت خوب ہے۔ مضمون ای۔اردو بکس بہت اچھا ہے۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم

صدر شعبۂ اردو، جمشید پور، ویمنس کالج

ماہنامہ 'اردو دنیا' خوبصورت مصوری، خطاطی، حسین و دلکش رنگوں کے امتزاج اور عالمانہ مضامین، سائنس و ٹکنالوجی کی جدید ترین تحقیقات سے آراستہ ایک ایسا منفرد وجید ترین رسالہ ہے، جس کی ورق گردانی سے لہو میں گردش اور ذہن میں ترنگیں اٹھنے لگتی ہیں۔ ہر چند کہ قاری کی دلچسپی اور دلجمعی کو برقرار رکھنے کے تمام تر سامان موثر انداز میں آپ اراکین 'اردو دنیا' مہیا کراتے رہتے ہیں تاہم موجودہ عہد میں اردو کو جو مسائل ومشکلات درپیش ہیں ان کا تدارک مختلف عنوانات سے کرنا ایک اہم کارنامہ ہے۔ مضامین وتحقیقات کی ترتیب وتزئین میں آپ اراکین 'اردو دنیا' کی داد نہ دینا ادبی حق تلفی ہوگی۔ تحقیقی مضامین کے باب میں ایسے ایسے نادر نکات پہ اس شمارے کے مشمولات میں روشنی ڈالی گئی ہے، جن سے تحقیق کی نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ عوامی حقوق پہ مبنی حق اطلاعات کے حوالے سے اداریہ نگاری میں سیر حاصل بحث عام و خاص کے مفادات کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے۔ جو قابل ستائش ہے۔

تشنہ اعجاز

خیرآباد، بگہا، مغربی چمپارن، بہار

مجھے کہنے دیجیے کہ اردو دنیا نے ادھر جو رخ اپنایا ہے وہ دنیائے اردو میں ایک نئے انداز کی پہچان ہے۔ اردو کا قدیم قاری ہونے کے ناطے یہ برملا کہہ سکتا ہوں کہ آپ لوگ قاری کے لیے اب بہت ساری چیزیں پیش کررہے ہیں اور آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کے اراکین ومعاونین نہایت ایماندار اور دیانت دار ہیں۔ سب اپنی اپنی ذمے داریوں کی ادائیگی بھرپور انداز میں کررہے ہیں۔ شمارے سے جاں نثار اختر مرحوم کے بارے میں کافی جانکاری ملی۔ مارچ کے شمارے میں رام لعل صاحب کے صاحب زادے نے جو بیانات وتاثرات دیے ہیں اسے پڑھ کر میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آج اردو کے قاری کم ہوتے جارہے ہیں۔ بیشتر رسائل وجرائد ایسے ایسے موضوعات لارہے ہیں کہ جنھیں قاری ہضم نہیں کرپارہا ہے۔ ادھر اردو دنیا نے نئی کروٹ لی ہے۔ آپ لائق مطالعہ موضوعات دے رہے ہیں۔

رونق جمال

'کائنات' اسٹریٹ نمبر 9، آدرش نگر، درگ چھتیس گڑھ

فروری کا شمارہ کافی تاخیر سے اور مارچ کا شمارہ وقت پر مل گیا۔ فروری کے شمارے میں مالیگاؤں اردو کتاب میلے کی روداد پڑھ کر اردو زبان و ادب کی مقبولیت دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ روداد اور تصویروں کے ذریعہ لگا کہ میں بھی میلے میں موجود ہوں۔ مارچ کے شمارے میں ایم اے حق صاحب کا مضمون 'افسانچوں کی عالمی گونج' ایک بھرپور مضمون ہے۔ حق صاحب نے مضمون لکھ کر افسانچے کا حق ادا کردیا ہے۔

آفاق فاخری

آپ کا موقر جریدہ 'اردو دنیا' پابندی کے ساتھ زیر مطالعہ رہتا ہے۔ اردو دنیا کا اپنا ایک مخصوص رنگ وآہنگ ہے۔ ماہ فروری 2014 کا شمارہ جاں نثار اختر اور غلام ربانی تاباں کے نام منسوب ومعنون ہے۔ گویا حق بحقدار کے مصداق ہے۔ اس شمارے کا صفحہ صفحہ پُراز معلومات اور دلچسپ ہے۔ اردو کتاب میلہ (مالیگاؤں) کی رپورٹ نہایت حوصلہ افزا اور امید افزا ہے جس سے پوری اردو دنیا کو ایک اطمینان بخش پیغام جائے گا۔ بہرحال مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ■

عبدالحی

میں بین العلومی تنقید کا حامی ہوں

عتیق اللہ

سید محمد عتیق اللہ تابش جنھیں دنیائے ادب عتیق اللہ کے نام سے جانتی، پہچانتی اور مانتی ہے۔ اردو کی وہ شخصیت ہیں جس سے صرف نظر کرکے آپ خاص طور سے جدید اردو ادب کی تفہیم کے سفر پر زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ شاعری ہو یا تنقید دونوں میدانوں میں پروفیسر عتیق اللہ نے اپنی شناخت کو ممتاز کیا۔ بڑے ادیبوں کو بڑا اس لیے بھی مانا جاتا ہے کہ وہ مختلف ذرائع اور پہلوؤں سے اپنے بڑے پن کو نمایاں کرتے چلتے ہیں۔ لیکن عتیق اللہ نے یہ نہیں کیا۔ نہ انھوں نے ہر رسالے میں اپنے انٹرویو چھپوائے، نہ ادبی اجتماعات میں خود کو سب سے نمایاں رکھنے کا ڈھب اپنایا۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں "پڑھنا پڑھنا اور پڑھنا، لکھنا لکھنا اور لکھنا" ان کی سب سے بڑی مصروفیت ہے۔ اردو کے اہم ترین عصری ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی نے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو جاننے اور سمجھنے کے لیے جو انٹرویو لیا ہے اس کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں (ادارہ)

عبدالحی: سب سے پہلے آپ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں پوچھنا چاہوں گا؟ اپنی تعلیم و تربیت اور پرورش کے بارے میں ہمارے قارئین کو کچھ بتائیں؟

عتیق اللہ: اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں کئی مرتبہ عرض کرچکا ہوں۔ مختصراً یہ کہ 1949 میں شہر اجین (مدھیہ پردیش) میں پیدائش ہوئی۔ والد مرحوم کا تعلق ضلع مردان (پاکستان) سے تھا۔ ساتویں درجے تک وہیں فقہ کی تعلیم پائی تھی ذریعۂ تعلیم فارسی تھا، پشتو مادری زبان تھی۔ عربی زبان سے بھی خاصی واقفیت تھی۔ ان کی روزمرّہ کی زبان نے ان تینوں زبانوں سے ترکیب پائی تھی۔ چوں کہ 14-13 برس کی عمر میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر لاہور اور پھر دہلی اور پھر بھوپال بعد ازاں اجین میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ہم نے انھیں بے حد بے نیاز اور مستغنی پایا۔ بہت بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ضلع ناواگئی (پاکستان) اور اس کے اطراف میں ان کے حصے میں آئی ہوئی کاشت کی زمینیں تقریباً 17000 ایکڑ ہیں۔ 1954 اور پھر 1970 میں زمینوں کی تقسیم والد صاحب کی نگرانی ہی میں ہوئی تھی۔ انھوں نے یہ سارا اثاثہ ہم تینوں بہن بھائیوں کے نام کردیا تھا۔ یہ کاغذات اس وقت بھی ہماری تحویل میں ہیں۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد جو سیاسی صورتِ حال میں ابتری پیدا ہوئی تھی اور جو بے یقینی کی کیفیت ہمارے ذہنوں میں جڑ پکڑ چکی تھی وہ ہنوز قائم ہے۔ یہ سارا علاقہ سوات کے تحت آتا ہے جو اپنی فطری خوبصورتی اور زرخیزی میں عدیم المثال کہلاتا ہے۔ لیکن گزشتہ دس پندرہ برسوں سے یہاں آگ برس رہی ہے۔ بالخصوص سوات کے لوگ نسلاً پٹھان ہیں لیکن نسبتاً امن پسند اور نرم خو ہیں۔ یہاں کی خاص پیداوار انگور اور چلغوزے ہے۔ والد صاحب نے اجین ہی میں حفظ کیا، امامت کی اور درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ اتنے بڑے زمیں دار ہیں اور نہ انھیں کوئی قلق اور تاسف ہی تھا۔

والدہ کا تعلق بھوپال سے تھا۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ 1915 میں ایک بڑے مقصد کے ساتھ اجین منتقل ہوئیں کہ یہاں تعلیم نسواں کی طرف کوئی توجہ ہی نہ تھی۔ مسلم لڑکیوں کے لیے کوئی اسکول تھا نہ کوئی ادارہ۔ ان دونوں بہنوں نے اجین میں جو اسکول کھولے تھے انھیں 1922 میں ایک معاہدے کے تحت سرکار نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ 1954 تک ایک اسکول جو اب مدار گیٹ اردو ہائر سیکنڈری اسکول کہلاتا ہے، ہمارے گھر ہی میں واقع تھا۔ بڑا معصوم اور بے نیاز تھا ہمارا خاندان، کبھی سرکار سے کرایہ بھی طلب نہیں کیا

گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہر صبح گھر کا سارا سامان ایک کمرے میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ سارا سارا دن اسکول چلتا، شام کو وہ سارا سامان واپس اپنے مقام پر رکھ دیا جاتا۔ دوسرا اسکول مرزا واڑی میں واقع تھا۔ یہ بھی والدہ ہی کا قائم کردہ تھا۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ اسکول ہی میں کچھ عرصے کے لیے ہماری رہائش تھی وہیں کھانا بھی پکتا، وہیں رات بسر ہوتی اور وہیں کلاسیز بھی ہوتیں۔ بڑی بہن نے 1940 میں ورنا کیولر (گوالیار) سے مڈل پاس کیا تھا۔ اجین والوں کو بھی یہ علم نہیں ہوگا کہ مسلمانوں میں وہ پہلی مڈل تھیں جنھوں نے بڑنا گر اور دیواس میں جا کر لڑکیوں کے اسکول بھی کھولے تھے۔ زچگی میں 1948 میں ان کا انتقال ہو گیا۔

میں نے اجین ہی سے ایم اے (انگریزی ادبیات) اور پھر اردو میں ایم اے کیا۔ کچھ برسوں تک اجین ہی میں اسکولی سطح پر تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ 1971 میں مولانا آزاد کالج اورنگ آباد میں تقرر ہو گیا۔ اورنگ آباد کو محبت آباد کہنا چاہیے۔ یہ شہر اردو زبان و ادب کا بہت بڑا مرکز ہے۔ لوگ بے حد مخلص اور مہمان نواز ہیں۔ اپنی تہذیب سے جس قدر لگاؤ ہے اُسے میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔ یہاں کی فضاؤں میں اردو رچی بسی ہے۔ جتنے اردو اسکول یہاں واقع ہیں اتنی تعداد کسی اور شہر میں نہیں پائی۔ اردو کے جتنے طلبا کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم پا رہے ہیں اپنے شمار میں ان کا مقابلہ کوئی اور شہر نہیں کر سکتا۔ انگریزی تعلیم کا فروغ بھی یہاں اردو کی ترقی میں مانع نہیں آ سکا۔ گھروں گھر اردو اخبار پڑھے جاتے ہیں۔ کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ پابندی کے ساتھ رسائل خریدے جاتے ہیں۔ اردو کے تئیں جو رغبت یہاں نظر آتی ہے اسے میں شوق، لگن اور دیوانگی کے علاوہ تہذیبی مشن کا نام دینا چاہوں گا۔ اورنگ آباد کے قرب و جوار میں جو اضلاع واقع ہیں وہاں بھی کم و بیش یہی صورت ہے۔ یہاں کے لوگوں نے اپنی تہذیبی وراثت کا جس طور پر تحفظ کیا ہے وہ ہمارے دوسرے نام نہاد لسانی اور تہذیبی مراکز کے لیے نمونہ بن سکتا ہے۔ اورنگ آباد میری اہلیہ کا وطن ہے اور میرے لیے وہ وطنِ ثانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آدھی سے زیادہ عمر عزیز کا حصہ اورنگ آباد اور دہلی میں گزر گیا۔ اجین اب محض ایک یادِ دیرینہ ہے جو اکثر خواب میں طلوع ہوتا رہتا ہے۔ اورنگ آباد ہی کو اب میں نے اپنا وطن مان لیا ہے۔ جب موقعہ ملتا ہے وہاں کی راہ لیتا ہوں اور خوب سرشار و سیراب ہو کر واپس لوٹتا ہوں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں نے 1976 میں وہیں سے یعنی مرہٹواڑہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ میرے نگراں پروفیسر نعیم الدین صاحب (مرحوم) تھے۔ دہلی یونیورسٹی میں 1976 ہی سے پڑھاتا رہا لیکن باقاعدہ تقرر 1978 میں ہوا اور 2005 میں سبکدوش۔ بڑے تلخ و شیریں زمانے دیکھے۔ اُس عزت سے ہمیشہ بچتا رہا جو بڑی ذلتوں کے بعد میسر آتی ہے۔ چاپلوسوں نے جو مرتبے پائے وہ دیکھے اور نااہلوں نے جو عزت پائی وہ بھی دیکھی۔ صاحب علم کو گوشہ نشین دیکھا اور ان کی ناقدری بھی دیکھی۔ دہلی اب جعلی اور مصنوعی یعنی Pseudo کا ادیبوں کا مرکز بنتی جا رہی ہے۔ سیاست کے توسط سے جس نے بازی مار لی اسی کے پوبارے ہیں۔ مجموعی طور پر ہماری پوری قوم جس طرح اخلاقی زوال کی شکار ہے یہ دورِ حاضر کی بات نہیں ہے۔ صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔

ع ح: اردو کی جانب کس طرح راغب ہوئے؟ اردو ہی کیوں؟ کسی اور زبان یا سبجیکٹ کو آپ نے کیوں نہیں اپنایا؟

عتیق اللہ: جس زمانے میں ہم نے اپنا تعلیمی سفر شروع کیا تھا۔ سائنس اور کامرس کی طرف عمومی طور سے توجہ کم سے کم تھی۔ آزادی کے فوراً بعد ہمارا مسئلہ 'تعلیم' تھا ہی نہیں۔ پوری قوم بے یقینی کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ بڑی بے چارگی اور عدم تحفظ کا عالم تھا۔ ہمارے مکانات کسٹوڈین کی نذر ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ نوکریوں سے بھی مستعفی ہونا پڑا تھا۔ اردو کو اسکول بدر کر دیا گیا تھا۔ انتظامیہ کی نظر میں ہم مشکوک و مشتبہ تھے۔ آئے دن سی آئی ڈی ہمارے والدین کو تنگ کیا کرتے تھے۔ کبھی بھی فساد رونما ہو جاتا اور گھر جیل خانے بن جاتے۔ ایک خوف کی تلوار سروں پر لٹکی رہتی۔ ایسے ماحول میں تعلیم میں باقاعدگی کیسے آ سکتی تھی۔ بھوپال بھی منتقل ہونا پڑا۔ جہاں تیسری درجے تک تعلیم پائی۔ وہاں بھی مہاجرین کا جمِ غفیر تھا۔ عزیزوں کے گھر کبوتروں کے کابک بن گئے تھے۔ لوگ عموماً بے روزگار تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بڑا افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ان تجربات سے ہم ہی نہیں پوری قوم گزر رہی تھی۔ وقت بدل چکا ہے لیکن حالات نہیں بدلے ہیں۔ پوری قوم خوف زدگی کے عالم میں زیست بسری پر مجبور ہے۔ کچھ روشنی کی کرنیں ان اندھیروں میں نمودار ہوتی رہتی ہیں جو ہمارے لیے تھوڑا بہت ڈھارس کا سامان ضرور مہیا کر دیتی ہیں۔ دیکھیے اس حبس کی کیفیت سے کب نجات ملے۔ اتنی طویل گفتگو کا مقصد محض یہ بتانا تھا کہ کسی نہ کسی طور پر تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور جیسے تیسے وہ منزل سر کی جو میرے لیے اب بھی ایک خیال ایک خواب ہی ہے۔

ع ح: آپ کے اشعار سے ایسا لگتا ہے کہ شاعری آپ کا پہلا عشق ہے اور بعد میں تحقیق و تنقید کی طرف آئے، کیا یہ درست ہے؟

عتیق اللہ: شاعری سے سفر ضرور شروع کیا لیکن مطالعے کا شوق لڑکپن سے تھا اور وہ بھی 'نگار' جیسے رسائل کو پڑھنے کا۔ ابھی زیروکس مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ میں لائبریری میں گھنٹوں نقل کیا کرتا تھا۔ بیش تر چیزیں سمجھ سے باہر تھیں لیکن سمجھنے کی تڑپ تھی۔ کریم اللغات گھر ہی میں تھی لیکن اس سے بھی کچھ مدد نہیں ملتی۔ شہر میں کوئی ایسا نہیں تھا جو میری مشکل کو آسان کرتا۔ میرے بھانجے (اقبال حیدری) جو عمر میں مجھ سے 20 برس بڑے تھے۔ کراچی منتقل ہو چکے تھے۔ مسلمانوں میں وہ پہلے طالب علم تھے جنھوں نے اجین میں کرسچن انگریزی اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ انٹرنس پاس ہی کیا تھا کہ تقسیم وطن کا بگل بج گیا اور وہ پورے خاندان کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ تازہ کار ذہن رکھتے تھے، آزاد نظم اور معریٰ کی ہیئت انھیں مرغوب تھی۔ 'ساقی' میں چھپا کرتے تھے۔ پاکستان میں انھوں نے Crime and Punishment کا ترجمہ کیا تھا۔ ٹینی سن، ورڈز ورتھ اور بلیک کی نظموں کے ترجمے کیے تھے۔ 'جامِ نو' کراچی کے دس بارہ برس تک مدیر رہے۔ Economic Review جاری کیا جو اقتصادیات کے موضوع پر پاکستان سے شائع ہونے والا پہلا جریدہ کہلاتا ہے۔ اقبال حیدری کا ایک شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ایک ادھورا 'منظوم سفرنامہ' جسے انھوں نے امریکہ ہی میں لکھا تھا۔ ایملی برونٹے کے ناول Wuthering Heights اور تھامس ہارڈی کے ناول Tess of the D'Urbervilles کا ترجمہ بھی انھوں نے کیا تھا جو ادھورے پڑے رہ گئے اور ناگہانی موت نے انھیں آ دبوچا۔ ان کی شخصیت اور علم کے شوق نے مجھ پر گہرا اثر قائم کیا۔ شاعری میرے ضمیر کی آواز بن چکی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ نثر کی طرف آؤں گا۔ البتہ مطالعے کے شوق نے شاعری کے شوق کو متاثر ضرور کیا۔ اگرچہ تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور چوتھا تکلم کے نام سے جلد ہی شائع ہوگا۔ جتنی بے دردی کے ساتھ مجھے شاعری کرنی چاہیے تھی وہ نہیں کر سکا۔ اچھے شعر کا ایک خاص تصور ہے، اس معیار کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ بھرتی کی شاعری میرے یہاں کم سے کم ملے گی۔ بے حد بری اور پھسپھسی شاعری سے بازار گرم ہے۔ اس کی داد دینے والوں کی بھی کمی نہیں۔ میں بس حیرت کے ساتھ دیکھتا اور پڑھتا رہتا ہوں اور اپنی شاعری سے

موازنہ کرتا رہتا ہوں۔

ع ح : تنقید کو آپ نے زیادہ وقت دیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

عتیق اللہ: میں نے تنقید کو وقت نہیں دیا بلکہ تنقید نے میرا وقت لے لیا۔ دراصل کسی کالج یا یونیورسٹی میں استاد ہونے کے معنی ہیں آپ لائقِ اعتبار ہو گئے۔ نہ صرف لائقِ اعتبار بلکہ متداول اور مستعمل اصطلاح میں نقاد کا ٹھپّہ آپ کی شخصیت پر لگ گیا۔ آپ خواہ بے مغز، سرسری اور صحافتی نوعیت کی زبان لکھتے ہوں یا اِدھر اُدھر سے نقالی کر کے نوٹس بناتے ہوں۔ اردو دنیا آپ کو بہر حال دانش ور قرار دینے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہے۔ سو دیکھتے دیکھتے ہم بھی نقاد بن گئے اور بعض اوقات ہمیں بھی دانش ور کی حیثیت سے خطاب کیا جاتا ہے۔ گم راہ ہونے کے لیے اس قسم کے خطاب کافی ہیں۔ ہم بھی اس چکر میں پھنس گئے۔ شاعری کی دیوی انھیں پر مائل بہ التفات ہوتی ہے جو 24 گھنٹے اسی کے نشے میں سرشار رہتے ہیں۔ خدا نے اگر آپ کو تخلیقی شعور عطا کیا ہے تو مسلسل اس کی جلا کاری ضروری ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود تنقید سے میں چھٹکارا نہیں پا سکا۔ تنقید کا پیشہ اگر آپ نے اختیار کیا ہے تو پھر دنیا کے کسی اور کام کے لائق نہیں رہیں گے۔ تنقید مسلسل مطالعے کا تقاضہ کرتی ہے۔ آپ شاعری کرتے ہیں، کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں لیکن تنقید بڑی ذمے داری کا کام ہے۔ ایک اچھا تنقید نگار جتنی محنت کرتا ہے اس کا عوض اسے عشرِ عشیر بھی نہیں ملتا۔ پتہ نہیں یہ نیک کام ہے کہ نہیں تاہم تنقید لکھنا نیکی کر دریا میں ڈال کے برابر ہے۔

ع ح : آپ نے کن نقادوں اور ادبی نظریوں کا اثر قبول کیا؟

عتیق اللہ: میں نے یوں تو کسی کا اثر قبول نہیں کیا ہے۔ لیکن ہمارے بزرگ نقادوں جو بڑے بڑے کام کیے ہیں وہ طالبِ علمی کے زمانے سے مطالعے میں رہے ہیں، ان سے لاشعوری طور پر میری بصیرت کو جلا ملی ہے۔ آل احمد سرور، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، سید عابد علی عابد، وزیر آغا، محمد حسن، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور وارث علوی نے جو غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں وہ تو نئی نسلوں کی توفیق سے باہر ہیں۔ ہم لوگ توتلی زبان میں کچھ تو بھی محض گنگنا رہے ہیں اور اسی پر سینے چوڑے کر کے داد پر داد وصول کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ہم میں سے بعض تو اپنے ہاتھ سے اپنی پیٹھ تھپتھپاتے رہتے ہیں۔ اپنا کبھی تجزیہ نہیں کرتے اور نہ تقابل۔ ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھیں تنقید کے نام پر لفاظی کا فن خوب آتا ہے۔ ہمارے زمانے میں جتنی بے مصرف، سطحی، بے مغز اور پھسپھسی تنقید لکھی گئی ہے وہ انھیں سے منسوب ہے۔ چوں کہ میں بھی اردو کا استاد ہوں اس لیے ان تمام چیزوں کا مجھ پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اسی لیے آپ سے کہتا ہوں کہ خدارا مجھے نقاد نہ کہیں

ع ح : ہم یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ تنقید میں آپ کا موقف کیا ہے۔ یعنی ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعدِ جدیدیت جیسے موضوعات پر آپ نے بھی کافی لکھا ہے۔ ان مباحث میں سرگرم حصہ بھی لیتے رہے ہیں تو آپ کے نزدیک کون سا تصور یا تھیوری لائقِ اعتنا ہے۔ کیا تخلیق کار کو کسی تھیوری کے تحت لکھنا چاہیے۔

عتیق اللہ: پہلی بات یہ عرض کرتا چلوں کہ تخلیق کار کو نئے سے نئے ادبی اور فلسفیانہ تصورات کا علم ضرور ہونا چاہیے۔ نہ صرف یہ بلکہ جہاں تک ہو سکے مختلف علوم سے بھی واقفیت ہونی چاہیے۔ زندگی کے وسیع تر تجربات وغیرہ مل کر اُس کی ایک آگاہ شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی تھیوری یا کسی نظریے کو رہ نما بنائے۔ ان ادیبوں نے زیادہ اہم کام کیے ہیں جو میمنہ کے چکر میں پھنسے اور نہ میسرہ کے۔ نقادوں کے اقتدار کی جنگ سے وہ لاتعلق ہی رہتے ہیں۔ میں انھیں متبادل تخلیق کار کہتا ہوں۔ جیسے ترقی پسند تحریک کے شور سے بے نیاز ہو کر منٹو، ن م راشد، اختر الایمان، مجید امجد، منیر نیازی لکھتے رہے۔ جدیدیت کی پُرزور آندھی کی زد سے قرۃ العین نے اپنے آپ کو بچایا۔ حالی اور غالب بھی اپنے عہد کے عمومی مذاق سے بے پرواہ تھے۔ اسی لیے وہ اپنے زمانوں میں متنازع رہے۔ ایسے ادیبوں کو بعد کی نسلیں ہی صحیح شکل میں پہچانتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ متبادل ادب پر زور دیتا رہا ہوں جس کی آواز اپنے عہد کے شور میں سب سے علیحدہ سنائی دے۔

جہاں تک میرے تنقیدی موقف کا سوال ہے۔ میں بین العلومی تنقید کا حامی ہوں۔ ایسی تنقید محض کسی ایک تھیوری، کسی ایک نظریے، کسی ایک تصور پر اکتفا نہیں کرتی۔ ادب خود بھی بین العلومی ہوتا ہے اور وہ روزمرہ کی زندگی میں ہم خود بھی بین العلومی ہوتے ہیں۔ کبھی ہم سیاست اور معاشرتی صورتِ حال پر گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی اپنا اور کبھی دوسرے کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ کبھی ہمارا مسئلہ اقتصادی ہوتا ہے۔ کبھی چیزوں کو سمجھنے کے لیے فلسفیانہ بصیرت سے بھی کام لیتے ہیں۔ صبح کا اخبار، انٹرنیٹ اور ٹی وی نے ہمیں پہلے سے زیادہ بین العلومی بنا دیا ہے۔ زندگی کو سمجھنے کے لیے محض ایک نظر کی نہیں کئی نظروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں اسے کئی زاویوں سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اس سے جوجھنا پڑتا ہے۔ ادب بلکہ تخلیقی ادب بھی ہم سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس وژن سے کام لیں جو زندگی سے پھوٹ کر نکلا ہے۔ ہم زندگی نہیں جیتے ایک مسلسل جنگ لڑتے ہیں اور ہر تخلیق ایک جنگ ہی ہے جب تک کہنیاں نہ چھِل جائیں، ٹخنے نہ پھوٹ جائیں، ادھر اُدھر سے ہڈیاں نہ چٹخیں بڑا ادب

تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔ جس کا فن شدتِ وجود یعنی Intensity of Existence کا مظہر ہے وہی زیادہ اثر گیر بھی ہوتا ہے اور وقت کی ہر قید سے ورا بھی ہوتا ہے۔ ہر بڑا ادیب، ادب لکھتا ہی نہیں، ادب جیتا بھی ہے۔ تنقید سے زیادہ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ خود ادب کے تقاضے کیا ہیں یعنی کوئی تخلیق ہم پر کس قسم کا اثر قائم کررہی ہے۔ اگر آپ صاحب علم ہیں اور ایک آگاہ شخصیت رکھتے ہیں تو آپ کا تاثر آپ کو دھوکہ نہیں دے گا۔ آپ اپنے تاثرات کی چھان پھٹک کر کے ہی کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ پہلے تاثر ہی کو آخری تاثر کہہ کر نچنت ہو جائیں گے۔ ہر تخلیق یکے بعد دیگرے کئی قرأتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ بار بار ہمیں دھوکہ بھی دیتی ہے۔ وہ کبھی پوری برہنہ نہیں ہوتی۔ پوری برہنگی میں وہ کشش نہیں ہوتی جو چاک سے جھلک مارنے والا حصہ فراہم کرتا ہے۔ میں اپنے عملِ نقد میں اسی لیے بے حد محتاط واقع ہوا ہوں۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لیے کافی وقت لگاتا ہوں۔ اپنے آپ سے بحث کرتا ہوں، جھگڑتا ہوں اور بہت بعد میں جا کر کوئی رائے قائم کرتا ہوں۔

ع ح: تنقید کے موجودہ منظرنامے پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟ کلیم الدین احمد نے کہا تھا کہ اردو میں تنقید ہے ہی نہیں، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تنقید پر زوال آرہا ہے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں؟

عتیق اللہ: اچھی بری تنقید سے کوئی دور خالی نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اچھی تنقید کے مقابلے میں بری تنقید کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے یہ بات تقریباً 80 برس پہلے کہی تھی۔ اس وقت یقیناً تنقید کے نام پر لفاظی زیادہ تھی۔ تاثراتی نوعیت کی تحریروں کو بڑا درجہ حاصل تھا یا بعض بے حد عمدہ تدریسی نوعیت کے کام تھے، جن کی اپنی مخصوص افادیت اور حدود تھیں، کلیم الدین احمد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے 'جرأتِ انکار' سے کام لیا۔ حالی کے بعد جرأت انکار کی یہ دوسری مثال تھی۔ کلیم الدین نے ایف آر لیوس کے عملِ نقد کو نمونہ بنایا تھا۔ ایلیٹ بھی انھیں بے حد عزیز تھا، لیکن المیہ یہ کہ کلیم الدین کی زبان تنقیدی نہیں ہے۔ وہ فلسفیانہ مغز سے عاری ہے۔ ان کے یہاں تکرار ہی تکرار ہے۔ یہاں تک کہ کہیں کہیں جذبوں میں برافروختگی کا رنگ شامل ہونے کے باعث تحریر کی متانت کو نقصان پہنچا ہے۔ انھوں نے تاثراتی تحریروں کا خوب خوب مذاق اڑایا اور خود بھی اس کی تیز رو سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ کلیم الدین کے بعد ہماری تنقید نے بڑی لمبی جست لگائی ہے۔ مغرب میں تنقید کی روایت کئی صدیوں کو محیط ہے۔ وہ بے حد علمی، فلسفیانہ، اوریجنل اور مجرد ہے۔ اس کا مقابلہ ہم اپنی تنقید کے اثاثے سے ہرگز نہیں کریں گے۔ موجودہ زمانوں میں تنقید کی کثرت دیکھ کر دماغ میں ایک ہی شبہ جگہ بنانے لگتا ہے کہ کہیں تخلیق بلکہ بہتر تخلیق کی رفتار سست تو نہیں پڑ گئی۔ تنقید کو تخلیق اساس ہونا چاہیے جب کہ نظری مباحث میں ہماری تنقید زیادہ الجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اچھی تنقید ہمیشہ بہتر تخلیق کے لیے فضا سازی کا کام انجام دیتی اور اچھے ادب کی طرف مائل کرتی ہے کہ کسی ادیب کو ہمیں پڑھنا چاہیے تو کیوں؟ اس کے پاس اس کے جواز اور دلائل ہوتے ہیں۔ بعض بزرگوں نے اس ذیل میں یقیناً بہت اعلیٰ درجے کے کام کیے ہیں۔ جن سے یہ تقویت ملتی ہے کہ مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ معشوق بھی ہے اور اس کی کمر بھی ہے۔

ع ح: آپ کا اہم ترین کام ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ ہے، آپ کی نسل کے ناقدین بہت بہتر رہے ہیں اور تنقید کو تنقید کے طور پر برتا ہے لیکن آپ کے بعد کی نسل کے ناقدین کیا تنقید کو ویسے ہی برت رہے ہیں؟ برصغیر کے تناظر میں کن نقادوں سے متاثر ہوئے ہیں؟

عتیق اللہ: جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اچھی اور بری تنقید ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہے۔ ہمارا دور بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ شمیم حنفی اور وہاب اشرفی نے کئی گراں قدر کام کیے ہیں۔ شمیم حنفی کا ذہن فلسفیانہ ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ یادداشت غیر معمولی اور بے حد حساس۔ ان کی تنقید کو میں بین العلومی کے خانے میں رکھتا ہوں۔ جس میں علم، عطر کی طرح رچا بسا ہوتا ہے۔ شمیم حنفی، دراصل، دو پاٹوں کے بیچ میں پس کر رہ گئے۔ ہم لوگ تنقید کے اُن کاموں کو اونچا مقام دیتے ہیں جن میں رعب و داب سے کام لیا گیا ہے۔ جن میں مغرب کے حوالوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ حوالوں کی بھرمار تو شمیم حنفی کے یہاں بھی ہوتی ہے لیکن یہ نظریاتی حوالے نہیں ہوتے۔ بات سے بات نکلنے کے دوران بیچ میں آدھمکتے ہیں۔ ویسے میں بتادوں، کہ اس قسم کے حوالوں سے بھی انھیں پرہیز کرنا چاہیے۔ یوں بھی وہ اپنی فکر اور اپنے استدلال میں بے حد اوریجنل واقع ہوئے ہیں۔ ضروری اور غیر ضروری حوالوں کی ٹھُس پیٹھ یہ بھی باور کراسکتی ہے کہ لکھنے والے کو اپنے آپ پر اعتماد کم ہے۔ حوالے ضخامت بڑھانے کے لیے ٹیکے کا

پروفیسر عتیق اللہ: حالات وکوائف

اصلی نام: عتیق اللہ

اسناد میں اندراج: سید عتیق اللہ تابش

تاریخ پیدائش: 2 جولائی 1942

جائے پیدائش: اجین (مدھیہ پردیش)

تعلیم: • انگریزی ادبیات (ایم۔اے)، 1970 • اردو ادبیات (ایم۔اے)، 1972 • پی ایچ۔ ڈی (اورنگ آباد، مہاراشٹر) 1976

پہلی تخلیق: غزل کا ایک شعر

کتابیں: (1) ایک سو غزلیں (مجموعۂ غزل) 1972 (2) قدر شناسی (تنقیدی مضامین) 1978 (3) تنقید کا نیا محاورہ (تنقیدی مضامین) 1984 (4) دلی میں اردو نظم آزادی کے بعد (تنقید و ترتیب) 1990 (5) پیچھے کوئی ہے (ڈرامہ) 2001 (6) بین کرتا ہوا شہر (شاعری) 1995 (7) ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ (تنقید و تحقیق) 1996 (8) بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب (تنقید و ترتیب) 2002 (9) ترجیحات (تنقیدی مضامین) 2002 (10) تعصبات (تنقیدی مضامین) 2005 (11) محمد حسین آزاد (تنقید) 2008 (12) عہدنا تمام کی شاعرہ: پروین شیر (تنقید و ترتیب) 2011 (13) بیانات (تنقیدی مضامین) 2011 (14) عبارت (غزلیں) 2011 (15) تنقید کی جمالیات (تنقید کی اصطلاح، بنیادیں، متعلقات) 2013 (16) تنقید کی جمالیات (مغربی شعریات: مراحل و مدارج) 2013 (17) تنقید کی جمالیات (مشرقی شعریات اور اردو تنقید کا ارتقا) 2013 (18) تنقید کی جمالیات (تصورات) 2013 (19) تنقید کی جمالیات (تحریکات و رجحانات) 2013 (20) تنقید کی جمالیات (مارکسیت، نومارکسیت، ترقی پسندی) 2013 (21) تنقید کی جمالیات (جدیدیت و مابعد جدیدیت) 2014 (22) تنقید کی جمالیات (ساختیات و پس ساختیات) 2014 (23) تنقید کی جمالیات (ادب و تنقید کے مسائل) 2014 (24) تنقید کی جمالیات (اصنافی تنقید) 2014 (25) تکلم (مجموعۂ نظم) (26) اسالیب (تنقیدی مضامین)

پتہ: سی 125، بسیرا اپارٹمنٹ، فلیٹ نمبر 5، جوہری فارم، نورنگر ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی

بھی کام کرتے ہیں۔

ع ح: ممتاز شیریں، سیدہ جعفر، صغریٰ مہدی جیسے کچھ گنے چنے ناموں کے علاوہ اردو میں خواتین تنقید نگار نہیں نظر آتی ہیں بلکہ طنز و مزاح لکھنے میں بھی خواتین پیچھے ہیں۔ آپ نے اس سلسلے میں لکھا بھی ہے، ہمیں بتائیں کہ آخر اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ خواتین نے طنز و مزاح اور تنقید کی جانب توجہ نہیں دی؟

عتیق اللہ: ہماری بیشتر خواتین نے فکشن میں اعلیٰ درجے کی کئی مثالیں قائم کی ہیں۔ یہ سلسلہ تقسیم وطن سے قبل سے چلا آرہا ہے۔ انھوں نے مقبول عام فکشن میں بھی بڑی عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مشرقی خاتون اور وہ بھی تخلیق کار خاتون بہ یک وقت تین ذمہ داریاں نبھاتی ہے۔ گھر اور بچوں کی ذمہ داری، ملازمت کی ذمہ داری اور ادب تخلیق کرنے کی ذمہ داری۔ تنقید نگار کو لائبریری کا کیڑا بننا پڑتا ہے۔ اسے کتابوں کے ڈھیر کے درمیان شب و روز گزارنے پڑتے ہیں۔ مختلف علوم اور نئے سے نئے ادب کو پڑھنا پڑتا ہے۔ جب کہیں وہ کچھ لکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ خاتون ادیبہ کو بقول ورجینا وولف ایک کمرہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ قرۃ العین، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، نثار عزیز بٹ، وغیرہ کی شکل میں جو ادب پیش کرچکی ہیں اور کررہی ہیں وہ تنقید کی کارگزاری سے زیادہ قیمتی اور زندہ رہنے والا ہے۔ تنقید تو تخلیق کار کے حق میں خاموش زہر ہے۔ اِدھر اُدھر کی واہ واہ کے ڈونگرے کیا بجتے ہیں وہ اپنی پٹری سے اُتر جاتا ہے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ ہماری خواتین محض شعر کہتی ہیں یا فکشن کی طرف راغب ہیں۔ کچھ بے حد عمدہ خود نوشتیں بھی انھوں نے لکھی ہیں۔ جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے خود مغرب میں اس کے دن لد گئے۔ سترہویں صدی کے بعد سے جو زوال شروع ہوا ہے اس کا اِتمام 'مزاح کی موت' پر ہوتا ہے۔ یوں بھی عمومی طور پر طنز ومزاح کو ہم نے دوسرا درجہ دے رکھا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں Sense of humour کی زبردست کمی ہے۔ اگر خواتین طنز و مزاح کی طرف مائل ہوگئیں تو مردوں کو طشت ازبام کرنے کا مسالہ ان کے پاس وافر ہے۔ ہمارے طنز ومزاح نگاروں کے لیے 'بیوی' (ایک خاص قسم کی) بیوی ہمیشہ نشانے پر رہتی ہے جو بیوی ہی نہیں پوری عورت ذات کی نمائندگی کرتی ہے۔ خواتین نے اگر ٹیڑھی نظر کو اپنا وطیرہ بنالیا تو یقیناً بہتوں کی خیر نہیں ہے اس لیے خواتین نے بہت سوچ سمجھ کر اس میدان میں قدم رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

ع ح: آپ نے افسانے بھی لکھے، شاعری بھی کی اور اردو ادب کے موجودہ منظرنامے میں ایک ذہین نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں، یہ بتائیں کہ ادب کی کس صنف نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟

عتیق اللہ: میں نے ایک فُل لینتھ ڈرامہ بھی لکھا ہے جو کتابی شکل میں شائع ہوچکا ہے۔ دوسرا ڈرامہ 'ہم سب ذلیل ہیں' اشاعت کے انتظار میں ہے۔ مجھے غزل اور نظم دونوں عزیز ہیں۔ 'تکلّم' نام سے میرا چوتھا مجموعہ کلام جو نظموں پر مشتمل ہے طباعت کے مرحلے میں ہے۔

ع ح: اکیسویں صدی کے ادبی منظرنامے پر آپ کی کیا رائے ہے؟ فکشن اور شاعری کے حوالے سے بتائیں؟

عتیق اللہ: یقیناً بہت اچھا فکشن لکھا جارہا ہے۔ بری مثالوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ہمیں ہر وقت بیدی اور منٹو کو معیار کے طور پر اخذ نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ ہندوستان میں اچھی شاعری کا فقدان ہے۔ موجودہ زمانوں کے شاعر جز وقتی شاعر ہیں۔ ان کی دلچسپیاں اور ذمے داریاں کئی صیغوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ اس لیے وہ جلد از جلد کچھ کہہ کر بری الذمہ ہونے کے درپے رہتے ہیں۔ انھیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ اپنے انفراد کو قائم کرنے کے لیے بھی پورے ایک منصوبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مختلف علوم اور مختلف زبانوں کی شاعری کے علاوہ ہماری اپنی کلاسیکی شاعری سے بھی ان کے رشتے ڈھیلے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں کوئی وژن ہی نہیں ہوتا اور نہ زبان و بیان میں وہ قوت ہوتی ہے کہ فوراً اپنی طرف متوجہ کرلے اور ہم انھیں مزید پڑھنے کے لیے بے چین ہوجائیں۔

ع ح: روزمرہ زندگی کی غیرادبی مشغولیات یا دلچسپی اور شوق کے بارے میں کچھ بتائیں؟

عتیق اللہ: پڑھنا، پڑھنا اور پڑھنا۔ لکھنا، لکھنا اور لکھنا۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حتیٰ کہ کبھی خبریں بھی نہیں سنتا۔ البتہ صبح کا اردو اور انگریزی اخبار میرے روزمرہ میں شامل ہے۔ ان کے بغیر میری صبح نہیں ہوتی۔ بیوی اور بچے کے لیے روز دو ڈھائی گھنٹے نکالتا ہوں۔ خوب خوش گپیاں کرتا ہوں۔ جن لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان کا ذکر کرتا ہوں۔ واقعات کو لطیفے کی شکل میں بیان کرکے ہنستا ہنساتا رہتا ہوں۔ میرا ذہن کھلا ہوا ہے۔ سب سے کھل کر ملتا ہوں۔ مجھے بند لوگ ہمیشہ تکلیف دہ محسوس ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ وہ لوگ تکلیف دہ ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور ہمیشہ دوسروں کی تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں۔ تشہیر بازی کا زمانہ ہے جسے پبلک ریلیشنگ کا فن آتا ہے اُسے اس کی قیمت بھی ملتی ہے۔ جسے یہ فن نہیں آتا اسے کوئی صدمہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے لوگوں کی بھی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

ع ح: اردو دنیا کے قارئین کے لیے کوئی پیغام...

عتیق اللہ: بس اتنا ہی کہوں گا کہ زندگی بہت مختصر ہے۔ جوانی اس سے بھی مختصر تر۔ آدمی کو ہمیشہ اپنا اور اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ بہت سے میدانوں میں منھ مارنے کے بجائے کوئی ایک میدان چن لینا چاہیے۔ اگر خدا نے آپ کو تخلیق کی استعداد بخشی ہے تو اس کی قدر کرنا چاہیے۔ روز بہ روز اسے جلا بخشنے کی ضرورت ہے۔ بے دردی کے ساتھ تخلیق کے عمل کو وقت دیا تو پھر آپ کو کسی تشہیر بازی کی ضرورت نہیں، نہ کسی کی چاپلوسی اور درباری آپ کو کوئی مستقل مقام دلاسکتی ہے۔ تحریر ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔

ع ح: اپنی پسند کے چند منتخب اشعار قارئین کی نذر کردیں تو بڑی عنایت ہوگی:

عتیق اللہ:

ہونٹوں سے ادا ہوتا ہوا لفظ ہی کب تھا
اِک سرخ گلابوں کا سماں برسرِ لب تھا

چاند اس کے آنگن میں رت جگے مناتا ہے
ڈوبتا ہے کب اس کو یہ بھی بھول جاتا ہے

عشق کے واسطے مہلت ہی کہاں ملتی ہے
سر پہ ہر وقت کوئی کارِ جہاں رہتا ہے

توڑ لے اپنے سبھی لمس کے رشتے مجھ سے
تاکہ محسوس نہ ہو عمر بہت لمبی ہے

ہم زمیں کی طرف جب آئے تھے
آسمانوں میں رہ گیا تھا کچھ

تھا سرِ جسم اِک چراغاں سا
روشنی میں نظر نہ آیا کچھ

میں آگیا تھا خود اپنے ہی پاؤں کے نیچے
چلا گیا وہ مری بے زبانیاں لے کر

■

Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

Prof Ateequllah, C-125, Flat No. 5,
Basera Apts. Johri Farm, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi - 110025

شاہد اختر انصاری

کمشنر برائے لسانی اقلیات

پروفیسر اخترالواسع

سے خصوصی گفتگو

شاھد اختر: آپ اپنے تعلیمی سفر پر روشنی ڈالیں:

پروفیسر اخترالواسع: میری پیدائش علی گڑھ شہر میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ایک استاد جناب محمد حنیف انصاری کے ذریعے ہوئی جنھوں نے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی پانچوں کتابیں پڑھائیں۔ تختی پر لکھنے کی مشق کرائی اور پھر چوتھی جماعت میں داخل کرادیا گیا۔ ثانوی سے لے کر بقیہ تمام تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ایم اے اسلامک اسٹڈیز، بی ٹی۔ ایچ اور ایم ٹی۔ ایچ کی اسناد وہیں سے پائی۔ بعدازاں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوا اور یکم دسمبر 1978 سے تدریسی زندگی کا آغاز ہوا جو ڈھائی مہینے کے وقفے کو چھوڑ کر مارچ 2014 تک جاری رہا۔

ش ا: اخترالواسع صاحب آپ کو کمشنر برائے لسانی اقلیات مقرر کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے آپ مبارک باد قبول کریں۔ آپ پہلے ایسے کمشنر ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ یہ کس طرح کا ادارہ ہے اور اس کا دائرہ کار کیا ہے۔

پروفیسر اخترالواسع: بہت شکریہ! یہ میرے لیے افتخار اور اعزاز کی بات ہے کہ 1957 میں اس منصب کے قیام کے بعد آج پہلی بار کسی اردو والے کو اس پر فائز کیا گیا ہے۔ جہاں تک اس کے قیام کی تاریخ اور ضرورت کا تعلق ہے وہ کچھ یوں ہے کہ 1956 میں جب لسانی بنیادوں پر آزاد ہندوستان میں ریاستوں کی تشکیل نو ہوئی تو اکثر ریاستوں میں ایسے تنازعات سامنے آئے کہ ایک زبان کے بولنے والے ایسی ریاست میں شامل کردیے گئے جہاں غالب ترین اکثریت کوئی اور زبان بولنے والی تھی۔ مراٹھی بولنے والوں کے کچھ علاقے کرناٹک میں، تیلگو بولنے والے تامل ناڈو میں شامل کردیے گئے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ ایک زبان کے بولنے والے اگر ایک جگہ اکثریت میں ہیں تو جگہ بدلتے ہی وہ اقلیت میں بدل جاتے ہیں۔ پھر وہ زبانیں بھی ہیں جن کا باقاعدہ کوئی اپنا صوبہ نہیں لیکن ان کے بولنے والے مختلف جگہوں پر پائے جاتے ہیں، اس صورت حال میں لسانی تنازعات کو مٹانے اور لسانی اقلیتوں کے حقوق اور مراعات کی نگرانی اور تحفظ کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایک ایسا خصوصی افسر ہونا چاہیے۔ یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ دستورِ ہند کی دفعہ 350-B کے ذریعے ایسے خصوصی افسر کی نامزدگی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دستورِ ہند کے بنیادی حقوق کی دفعہ 29 کے تحت ہر ہندوستانی شہری کو اپنی زبان، رسم خط اور ثقافت کو بنائے رکھنے اور فروغ دینے کا حق حاصل ہے اور اسی طرح دستور ہند کی دفعہ 350-A کے تحت ہر ہندوستانی بچے کو اپنی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ لہٰذا جو کچھ دفعہ 29 کے بنیادی حقوق اور دفعہ 350-A کی اسپرٹ ہے اس کی خلاف ورزی نہ ہو یہ ہماری ذمے داری ہے۔ دوسرے ضلعے یا تحصیل میں اگر کسی زبان کے جاننے والے پندرہ فیصد یا اس سے زیادہ ہیں تو اس زبان میں سرکاری احکامات، اشتہارات اور نوٹس شائع کیے جائیں، نیز صوبائی اور ضلعی سطحوں پر لسانی اقلیتوں کے مفادات کی نگرانی کے لیے موثر میکینزم کا قیام یہ سب ہمارے دائرۂ اختیار میں ہیں۔ اس میں اس طرح پورا ملک اور ساری زبانیں بلاتخصیص ہم سے جڑی ہوئی ہیں۔ ہمارا ایک فرض یہ بھی ہے کہ ہم لسانی اقلیتوں کو جو حقوق دستورِ ہند عطا کرتا ہے انھیں مناسب ذرائع سے مشتہر کرکے اس سے واقف کرائیں۔ کمشنر برائے لسانی اقلیات کے دفتر سے تمام ریاستوں اور مرکز کے زیرانتظام علاقوں کو ایک سوال نامہ بھیجا جاتا ہے اور ان سے موصولہ جوابات کی روشنی میں ایک مبسوط اور مفصل تجزیاتی رپورٹ تیار کی جاتی ہے جو صدرِ جمہوریہ ہند کو پیش کی جاتی ہے اور پھر ان کے توسط سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں رکھا جاتا ہے۔ یہ ایک سالانہ اور لازمی عمل ہے، جس سے ریاستی حکومتیں اور مرکز کے زیرانتظام علاقوں کی انتظامیہ ایک طرح سے محتاط رہتی ہیں کہ لسانی اقلیتوں کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی سے بچا جائے۔

ش ا: آپ کے اس عہدے پر آنے کے بعد اردو والوں میں خوشی کی لہر ہے اور آپ سے کافی امیدیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ آپ بتائیں کہ آپ کے کیا منصوبے ہیں؟

پروفیسر اخترالواسع: جیسا کہ میں نے آپ سے کہا ہے کہ یہ میرے لیے عزت وسعادت کی بات بھی ہے اور میں حکومت ہند اور صدر جمہوریہ ہند کا شکر گزار ہوں کہ ایک ایسے شخص کو جس کی مادری زبان اردو ہے اس دستوری عہدے پر تقرر کیا گیا اور ایک لسانی اقلیت کے طور پر اردو والے اگر اس پر خوش ہیں تو یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن ہماری کارکردگی اس پر منحصر ہوتی ہے کہ کوئی فرد، تنظیم یا ادارہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی یا ناانصافی کو لے کر تحریری طور پر ہم سے رجوع کرے تاکہ ہم متعلقہ ریاست یا سرکاری ایجنسی سے اس سلسلے میں وضاحت طلب کریں۔ اب اردو والے اپنے معاملات کو ان اداروں اور تنظیموں کے تحت ہمارے سامنے کب اور کس طرح پیش کریں گے، ہماری اردو سے متعلق کارکردگی اسی پر منحصر ہوگی۔ جہاں تک کچھ کرنے کا سوال ہے تو ایک اردو بولنے والے کی حیثیت سے کچھ معاملات پر ہم خود سے بھی کچھ کوششوں کا آغاز کررہے ہیں مثال کے طور پر اترپردیش میں اردو میڈیم سے ابتدائی تعلیم دینے کا سرکاری طور پر نظم نہیں ہے اور پرائیویٹ اسکولوں کو بھی اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہ دستور کی دفعہ 350-A کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ اس کا فوری طور پر تدارک ہونا چاہیے۔ اسی طرح دہلی میں اردو اسکول تو ہیں لیکن ان

میں اردو میڈیم ٹیچر اور پرنسپل اور وائس پرنسپل نہیں ہیں۔ زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس کے لیے باضابطہ اور باقاعدہ طور پر اردو اساتذہ کی تقرری نہ ہونا یا پھر ان کی تقرری کو اتنا موخر کرنا کہ بچے اردو کے بجائے کوئی دوسری زبان لینے پر مجبور ہو جائیں۔ اسی طرح این سی ای آر ٹی کے ذریعے اسکول کھولنے سے پہلے اردو میڈیم کے طلبا کے لیے نصاب کی فراہمی نہ ہونا وہ مسائل اور معاملات ہیں جن کے مناسب حل کے لیے ہم اپنی جیسی کوشش کریں گے لیکن میں پھر کہوں گا کہ بغیر اردو والوں کے سرگرم عمل ہوئے بہت زیادہ کامیابی ممکن نہیں ہے۔ زبانیں سرکاروں کی سرپرستی یا سرکاری اداروں کی مہربانیوں سے زندہ نہیں رہتی ہیں۔ بلکہ اپنے بولنے والوں کی طاقت کے بل پر اپنے وجود کو منواتی ہیں۔

ش ا: قومی اردو کونسل اور اردو اکادمی سے وابستگی کی بنیاد پر آپ کے کیا تجربات ہیں؟

پروفیسر اخترالواسع: قومی اردو کونسل ہو یا دہلی اردو اکادمی، مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ان اداروں نے حتی المقدور اردو کے فروغ اور اس کے استحکام کے لیے اپنی جیسی کوششیں کی ہیں۔ قومی اردو کونسل نے اپنے آپ کو کتابوں کی اشاعت تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ جدید تیکنالوجی کے ساتھ اپنے کو ہم آہنگ بھی کیا۔ اپنے کمپیوٹر لٹریسی پروگرام کے ذریعے نئی نسل کو روزگار کے نئے مواقع فراہم کرنے میں مدد دی۔ ساتھ ہی اطلاعاتی ٹیکنالوجی میں جو انقلابی ترقی اور تبدیلی سامنے آرہی ہے ان سے بھی آپ کو ہم آہنگ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ آج برصغیر میں ایک تہائی سے زیادہ علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں قومی اردو کونسل کے اشتراک اور تعاون کی رہین منت ہیں۔ عربی اور اردو خواندگی کے مراکز بھی قومی اردو کونسل کا بڑا کام ہے۔ قومی اردو کونسل نے جس طرح آن لائن اردو لرننگ کورس تیار کیا ہے اس کو بنظر تحسین دیکھا جارہا ہے۔ دہلی اردو اکادمی نے بھی دلی میں اردو کی تعلیم اور دہلی کی تاریخ اور اردو ادب و ثقافت کے فروغ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ انتہائی غیر معمولی ہیں۔ آج میرا رسمی طور پر دہلی اردو اکادمی سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن اپنے قیام سے آج تک دہلی اردو اکادمی نے جو قابل قدر کام کیے ہیں ان کی ستائش ہم سب پر فرض ہے۔

پروفیسر اخترالواسع: ہمیں خوشی ہے کہ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اقلیتوں کی تعلیمی بہبود سے متعلق جو کمیٹیاں بنائی ہیں ان میں ہماری واحد ایسی کمیٹی تھی جس نے مکمل رپورٹ 19 دسمبر 2013 کو پیش کردی۔ مرکزی وزارت اس پر غور وخوض کرہی رہی تھی کہ الیکشن آجانے کی وجہ سے ابھی واضح طور پر کوئی موثر عملی اقدام سامنے نہیں آسکا۔ اتنا ضرور ہوا ہے کہ سینٹرل اسکول میں اردو پڑھائے جانے کے لیے 20 بچوں کی جو شرط چلی آرہی تھی اس میں ہماری سفارش کے پیش نظر کچھ تخفیف ہوئی ہے جس سے کہ بہر حال ہم مطمئن نہیں ہیں۔ ہم نے اس رپورٹ میں یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ اسکولوں میں داخلوں کے فارموں میں تین خانے لازمی طور پر ہونے چاہئیں۔ ایک یہ کہ درخواست کنندہ کی مادری زبان کیا ہے؟ دوسرے اس کے ماں باپ اسے کس زبان میں تعلیم دلانا چاہتے ہیں؟ تیسرے یہ کہ وہ تیسری زبان کے طور پر کس زبان کو پڑھنا چاہتے ہیں؟ دوسرے ہم نے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ اردو میڈیم ٹیچرس کا ایک نیشنل رجسٹر بننا چاہیے اور یہ ذمے داری قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو سپرد کی جاسکتی ہے۔ اگر یہ دونوں سفارشیں مان لی جاتی ہیں تو کتنے لوگ اردو پڑھنا چاہتے ہیں یہ مسئلہ صاف ہوجائے گا اور دوسرے یہ کہ اردو اساتذہ کی کمی کا جو عذر تراشا جاتا ہے اس کی بھی قلعی کھل جائے گی۔ ہم نے تو اس میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ جامعہ اردو علی گڑھ کو جو ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ اردو دنیا میں فاصلاتی تعلیم کا یہ پہلا ادارہ رہا ہے کو ایک ڈیمڈ یونیورسٹی کا درجہ عطا کیا جائے۔ اب دیکھیے آنے والے دنوں میں اس رپورٹ پر کیا اور کس طرح عمل ہوتا ہے؟ یہاں پر بھی ایک بات اور کہنے کی اجازت دیجیے کہ ہم نے تو رپورٹ پیش کردی اور اردو والوں کے جو مطالبات اور منصوبے ہیں انھیں اس رپورٹ کا جز بنا دیا لیکن اب یہ اردو والوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ حکومتوں پر دباؤ بنائے کہ اِس رپورٹ میں درج سفارشات پر عمل درآمد ہوسکے۔

ش ا: آزاد ہندوستان میں سب سے بڑی اقلیتی ریاست میں اردو زبان کی حالت انتہائی افسوس ناک ہے، حالیہ دنوں میں آپ نے عزتِ مآب گورنر سے ملاقات کی تھی، حکومت اترپردیش اور آپ سے اس سمت میں کیا کرنے جارہے ہیں؟

پروفیسر اخترالواسع: دیکھیے اردو کی سب سے تشویش ناک حالت جس علاقے میں ہے وہ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے بیچ اور اس کے اردگرد کا علاقہ ہے۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اترپردیش میں جو کچھ ناانصافی اردو کے ساتھ اب تک ہوئی ہے اس کا اب فوری تدارک ہونا چاہیے۔ جب اترپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا دیا گیا ہے تو پھر اس کا چلن ہر سطح پر دکھائی بھی دینا چاہیے۔ یہی معاملہ تقریباً سرکاری دفاتر کی حد تک دہلی کا بھی ہے۔ جہاں اردو دوسری زبان تو بن گئی لیکن دفاتر میں اردو کے مترجم تک نہیں ہیں۔ اس پر جو کچھ ہم سے بن پڑے گا ہم کریں گے۔ لیکن جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے ایک سیکولر جمہوری نظام میں آپ کو دباؤ بنانا پڑتا ہے۔ اپنے حقوق کو منوانا پڑتا ہے۔ کوئی ایک فرد یا سرکاری ادارہ اکیلے سب کچھ کر ڈالے گا ایسا سوچنا صحیح نہیں ہے۔ ہم نے تو آغاز ہی اپنی سرکاری ذمے داری کا کیا۔ گورنر صاحب سے ملے ان کے سامنے اردو کا مقدمہ پیش کیا، انتخابات کے بعد وزیراعلیٰ کے سامنے بھی یہ سوال پیش کریں گے۔ ریاستی حکومت کے اعلیٰ ترین ذمے داروں کو اس سلسلے میں توجہ دلائیں گے لیکن ہم جانتے ہیں کہ جب تک اردو والے خود نہیں چاہیں گے اجتماعی طور پر جدوجہد نہیں کریں گے وہ کامیابی ہمارے حصے میں نہیں آئے گی، جو دراصل ہمیں مطلوب ہے۔

ش ا: آخر میں رسالہ 'اردو دنیا' کے تعلق سے آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

پروفیسر اخترالواسع: دیکھیے میں قومی اردو کونسل کی خدمات کا ہمیشہ سے مداح رہا ہوں۔ کم قیمت پر اردو والوں کی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ذوق کی تسکین اور معلومات کی فراہمی کا جو کام اردو دنیا کے ذریعے سے ہورہا ہے ساری اردو دنیا میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے دیدہ زیبی اور معنی آفرینی اس رسالے کا امتیاز بن چکی ہے۔ اردو دنیا میں کیا ہورہا ہے، اردو والوں کی خوشی ہو یا غم ان کے اعزاز واکرام ہوں یا کوئی بھی نمایاں کارکردگی، بلاگ سے لے کر بین الاقوامی سطح تک آپ کو اس کے ذریعے اس کی خبر مل جاتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے ایک طرف جدید ٹیکنالوجی سے اردو کو جوڑنے کے لیے ضروری قدم اٹھائے ہیں تو دوسری طرف 'بچوں کی دنیا' جیسا ایک شاندار مگر کم قیمت والا رسالہ نکال کر اردو کے ادب اطفال میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ 'فکر وتحقیق' کا سفر بھی جاری ہے اور اربابِ علم وادب میں اس رسالے نے اپنی جو ساکھ بنائی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ سفر کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور اسی طرح کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی منزلوں سے گزر کر نئی بلندیوں کو سر کرتا رہے، یہی میری دعا ہے!

■

Dr. Shahid Akhtar Ansari, Noor Nagar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 25

Prof. Akhtarul Wasey, A-110
Khan Abdul Gaffar Khan Enclave (Jamia Enclave)
JMI, Jamia Nagar, New Delhi-25

گوشہ خواجہ احمد عباس

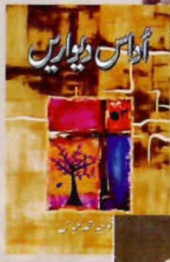

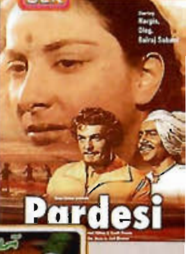

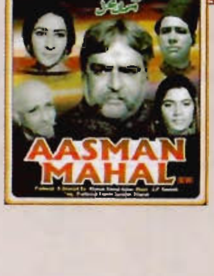

خواجہ احمد عباس کی شخصیت جتنی اوپر سے نظر آتی ہے اس سے کہیں زیادہ اوجھل رہتی ہے۔ جیسے سمندر میں تیرتے ہوئے برف کے پہاڑ۔ آئس برگ Iceberg۔ جو صرف ایک بٹا دس سمندر کی سطح پر نظر آتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے معصوم سے افسانے لکھے جنھیں نقادوں نے ترقی پسندانہ نعرے بازی کہہ کر نظر انداز کر دیا۔ ان کا پہلا ناول 'انقلاب' کوئی اردو پبلشر چھاپنے کو تیار نہیں ہوا۔ اس لیے وہ پہلے جرمنی میں، پھر روسی میں پھر انگریزی میں شائع ہوا اور آخر کار خود اپنے خرچ سے انھوں نے اسے اردو میں چھپوایا۔ اپنا پہلا افسانہ 'ابابیل' بھی انھوں نے اردو میں لکھا مگر ہر بڑے رسالے کے مدیر نے اسے واپس بھیج دیا اور آخر کار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مجلّے 'جامعہ' نے اس کی اشاعت کا اعزاز حاصل کیا اور عالمی ادب کے بہترین افسانوں میں اسے جگہ ملی۔ انھوں نے انسانی اور سماجی موضوعات پر ایک سے ایک عمدہ فلمیں بنائیں لیکن ہر فلم باکس آفس پر ناکام ہوتی رہی۔ لیکن اسی 'نعرے باز' افسانہ نگار کا اردو کے افسانوی ادب کو زندگی سے جوڑنے کا فارمولہ آگے چل کر افسانہ نگاروں کی عوامی مقبولیت کا اہم سبب بن کر سامنے آیا۔ اسی 'ناکام' فلم ساز نے آوارہ، شری چار سو بیس، میرا نام جوکر اور بابی جیسی فلمیں لکھ کر فلموں کی کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کرائے۔ بالی وڈ کی پہلی ملٹی اسٹارر فلم 'چار دل چار راہیں' بنا کر کمرشیل سنیما کو کامیابی کی ضمانت کا ایک نیا فارمولہ تھمایا اور ہندوستانی سنیما کو راج کپور اور امیتابھ بچن جیسے لیجینڈ دیے۔

خواجہ احمد عباس کی 'جنم صدی' پر زیر نظر گوشے کے تحت ہم نے اہم قلم کاروں کے مضامین کے ذریعے خواجہ احمد عباس کی ادبی، فلمی اور صحافتی شخصیت کے سبھی پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی پہلی کہانی 'ابابیل'، آزاد قلم کی چند تحریریں اور متعدد تصاویر بھی شامل کر رہے ہیں جن کی فراہمی کے لیے ہم محترمہ سیدہ سیدین حمید کے اور خواجہ صاحب سے غیر معمولی عقیدت رکھنے والے اردو نقاد پروفیسر ارتضیٰ کریم کے شکر گزار ہیں۔ بیشتر تصاویر ہم نے سیدہ سیدین حمید صاحبہ کی اجازت سے ان کی خواجہ احمد عباس سے متعلق ویب سائٹ abbaska.com سے لی ہیں۔ امید ہے گوشہ آپ کو پسند آئے گا۔

ادارہ

علی احمد فاطمی

خواجہ احمد عباس اور ترقی پسندی

خواجہ احمد عباس کی خوش قسمتی یا بدقسمتی یہ رہی کہ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب ترقی پسند افسانہ نگاروں، دانشوروں کی ایک بھیڑ تھی۔ ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور تحریک آزادی بھی۔ ایک سے ایک بڑے فن کار اپنی غیر معمولی تخلیقات کے ذریعے عظمت و شہرت کے جھنڈے گاڑ رہے تھے۔ پریم چند کے فوراً بعد ترقی پسند تحریک کے زیرسایہ جو نسل پروان چڑھی ان میں منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی چار ایسے بڑے اور غیر معمولی نام ہیں جنھوں نے اپنے غیر معمولی کارناموں، ہنگاموں، تنازعوں کے ذریعے اس عہد کے خاکسار، بے نیاز اور نام ونمود سے دور فنکاروں کو حاشیے پر لاکھڑا کردیا— انھیں میں تھے خواجہ احمد عباس، ہرچند کہ جو ان کا خاندانی پس منظر تھا۔ حالی کی جو عظیم روایت تھی۔ روشن خیالی کا جو کثیر سرمایہ تھا۔ علی گڑھ کی جو اعلیٰ تعلیم تھی وہ انھیں بڑا بنانے کے لیے بہت کافی تھی اور وہ بڑے تھے، ایماندار اور دیانت دار بھی لیکن زمانے کے تقاضے کچھ اور تھے— عباس حیات شناس اور کائنات شناس تو تھے لیکن شاید زمانہ شناس نہ تھے— اسی لیے وہ ابتداً ابابیل جیسی غیر معمولی کہانی لکھنے کے باوجود افسانہ نویسی کو پیشہ نہیں بنا سکے جیسے منٹو اور کرشن نے بنایا— وہ صحافت کی طرف گئے۔ کانگریس کی طرف گئے اور جواہر لال نہرو کی طرف گئے لیکن ترقی پسند تحریک سے الگ نہ ہوئے اور نہ افسانوی ادب سے— کبھی دور تھا جب ادب وصحافت باہم شیر وشکر تھے۔ حالی، آزاد، شرر، سرسید، پریم چند، ابوالکلام آزاد سبھی ادیب تھے اور صحافی بھی— شاعری کی، ڈرامے بھی لکھے اور مضامین وانشائیے بھی لیکن جیوں جیوں علم بڑھتا گیا۔ وقت گزرتا گیا ادب اور سماج میں خانہ بندی ہوتی گئی ادب اور صحافت دو الگ الگ خانے ہوگئے— اردو کے مغرور ادیبوں نے صحافت کو نیچی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا حتیٰ کہ غزل گویوں نے نظم نگاری کو بھی منہ نہیں لگایا۔ اردو کے رومانی انشاپردازوں نے تو پریم چند کو آسانی سے قبول نہیں کیا چہ جائیکہ خواجہ احمد عباس۔ اسی لیے اردو ادب وتنقید میں خواجہ احمد عباس کو وہ مقام اور حیثیت نہیں ملی جس کے وہ حقدار تھے۔ الزام یہ تھا کہ وہ صحافی زیادہ ہیں افسانہ نگار کم، الزام ان لوگوں نے زیادہ لگایا جو نہ معتبر صحافی تھے اور نہ محترم فنکار بس نقاد تھے اور نقاد کے اپنے زاویے اور فیصلے ہوا کرتے ہیں۔ عزیز احمد جیسا بڑا نقاد اور فنکار بھی ایک جگہ خواجہ احمد عباس کے بارے میں یہ کہہ گیا— ''مجھے خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی—'' 'ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ' کے مصنف ڈاکٹر صادق نے بھی لکھا— ''خواجہ احمد عباس جذباتی قسم کے ترقی پسند تھے اور فن کے معاملے میں مقصدیت اور افادیت کے قائل ہیں اس لیے اپنے ہر افسانہ کو بامقصد اور افادی بنانے کی کوشش میں افسانے کا فن ان کی گرفت سے نکل جاتا ہے اور جو کچھ بچتا ہے وہ صحافت اور پروپگنڈے سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا—''

یہ سچ ہے کہ خواجہ احمد عباس اولاً صحافی تھے اور انھوں نے اپنے قلمی سفر کا آغاز صحافت سے کیا تھا لیکن وہ بچپن سے ہی افسانوی ادب کے سنجیدہ قاری تھے۔ انگریزی فکشن کا مطالعہ کرتے رہے۔ ان کے پسندیدہ فنکار تھے۔ سامرسٹ مام جن سے ایک بار ان کی ملاقات بھی ہوئی تو مام نے اپنی کتاب (All together) عباس کو دی تو اُس پر آٹوگراف کے ساتھ یہ جملے بھی لکھے—

خواجہ احمد عباس افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی، شودان چوہان اور دوسرے ادیبوں کے ساتھ کشمیر میں

''ان چیزوں کے بارے میں لکھو جنھیں تم بخوبی جانتے ہو اور جتنا ممکن ہو سکے سادہ لکھو—''

یہ جملے عباس کے دل و دماغ میں اُتر گئے اور انھوں نے صحافت کے ساتھ ساتھ افسانے لکھنے شروع کردیے۔ یوں بھی پریم چند کے افسانے اور انگارے کے ہنگامے کے بعد اردو کے بیشتر فنکار افسانہ نویسی کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور پریم چند کی حقیقت نگاری اور انگارے کی بے باکی کو مختلف زاویوں سے آگے بڑھا رہے تھے۔ خواجہ احمد عباس اپنی غیر معمولی ہمہ جہت صلاحیت کے ذریعے کئی شعبوں میں ایک ساتھ داخل ہوئے۔ ادب، صحافت، فلم، سیاست اور گاندھی و نہرو کی رفاقت— ان سب نے عباس کے قلم اور ذہن کو ایک ہی وقت میں افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نویس، مکالمہ نویس، فلم کار، ہدایت کار، اپٹا کے سرگرم رکن اور نجانے کیا کیا وہ ایک ہمہ جہت اور مختلف الصفات شخص اور فنکار تھے لیکن ان کی یہی ہمہ جہتی اور مختلف الصفاتی جہاں ان کے کھلے ذہن اور وژن کو بڑا کرتی ہے وہیں اردو والوں کے بند ذہن کے حوالے سے نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ محدود و مشروط قارئین و ناقدین نے اپنی پسند و ناپسند اور ترجیحات سے ان کو قبول کیا اور اکثر نے نہیں بھی کیا۔ لیکن خواجہ احمد عباس اس قبول اور عدم قبول کے جھگڑوں میں پڑے بغیر اپنے کام میں مصروف رہے۔ افسانہ پر افسانہ، ناول پر ناول، فلم پر فلم۔ صحافت اور کالم الگ— کوئی انھیں صفِ اوّل کا ادیب و فنکار مانے یا نہ مانے لیکن ان کی ایمانداری اور بے باکی پر شک نہیں کرسکتا— وہ اکثر اپنی باکی اور حق گوئی کی وجہ سے مباحثے اور تنازعے کا شکار رہے۔ ان کا تخلیقی ادب عدم توجہ کا شکار رہا۔ ہم عصروں، نقادوں میں کرشن چندر کے علاوہ کسی نے ان کی کتابوں پر مقدمہ، دیباچہ وغیرہ نہیں لکھا جب کہ ان دنوں ترقی پسندوں میں یہ رواج تھا۔ سردار جعفری نے کرشن، منٹو اور دوسرے فنکاروں پر مقدمے و مضامین لکھے لیکن عباس کی کسی کتاب پر انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ عباس نے ان سب باتوں کی فکر بھی نہیں کی اور نہ شکایت۔ جابجا وہ خود ہی اپنے فکر و فن کے بارے میں لکھتے رہے۔ 'نیلی ساری' مجموعہ میں لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی ترقی کا راز ہم آہنگی میں ہے۔ بھائی چارے میں ہے آپسی میل جول میں ہے اور اتفاق میں ہے۔ اس لیے میں ان چیزوں کے حق میں ہوں جو ہم آہنگی اور اتحاد میں فروغ دیتی ہیں اور ان سب کے خلاف ہوں جو ان کا کاٹ کرتی ہیں۔ میں اپنی کہانیوں کے ذریعے بہتر انسان کی تخلیق کرنا چاہتا ہوں۔''

اپنے ایک طویل مضمون 'میں کون ہوں' میں ایک جگہ یہ لکھتے ہیں:

''تقریباً سب بھاری بھرکم نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ میں ادیب نہیں اخبار نویس ہوں اور میرے افسانوں میں صحافتی انداز سراسر جھلکتا ہے۔ یہ بھی آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ میں اعلیٰ ادب کی تخلیق کرنے کے بجائے اخباروں میں پڑھی پڑھائی خبروں کو افسانوی رنگ دے کر افسانے کے نام پر چھپوا دیتا ہوں۔ اس لیے آپ کو کوئی تعجب نہ ہوگا کہ کہانی مجھ پر وحی کی طرح نازل نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی ذاتی تجربے، مشاہدے یا کسی اخبار میں پڑھے ہوئے واقعات پر مبنی ہوتی ہے۔''

ان جملوں سے اتفاق اور اختلاف کے پہلو نکل سکتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عباس کے پاس تخلیق کا ایک نظریہ تھا۔ ایک مقصد تھا حالانکہ کچھ لوگ مقصد کو ہی بے مقصد سمجھتے ہیں اور اسے مقصدی ادب کہہ کر سبک کردیتے ہیں۔ عباس کے ایک دوست اور اہم افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے عباس کی شخصیت پر ایک مضمون لکھتے ہوئے آخر میں صاف طور پر کہا:

''ہمارے دوسرے بہت سے دوستوں کی طرح عباس مقصدی ادب کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی دل و دماغ کو ہم آہنگ کرکے لایا تو نتیجہ اچھا نکلا ورنہ محض آواز ہو کر رہ گیا۔ بلکہ شور—''

بعض دیگر ہم عصروں اور نقادوں نے بھی کچھ اسی قسم کے الزامات لگائے اور یہ الزام صرف عباس پر ہی نہیں پورے ترقی پسند ادب پر لگایا جاتا ہے اور اسے مقصدی ادب کہہ کر دوسرے نمبر کا ادب ثابت کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ خواجہ احمد عباس نے مقصد کو اہمیت ضرور دی لیکن کہانی کے فن، قصہ پن اور کیفیت و تاثر کو برقرار رکھنے کی بھی کوشش کی اور اکثر اس میں کامیاب بھی ہوئے اور کبھی کبھی ناکام بھی۔ بڑے سے بڑا فنکار ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا۔ منٹو، بیدی، کرشن بھی کبھی کبھی ناکام ہوئے ہیں لیکن ان سب نے بڑی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے بھی بڑی کہانیاں لکھی ہیں: ابابیل، سردار جی، معمار، زعفران کے پھول، دیا جلے ساری رات، بارہ گھنٹے، اتار چڑھاؤ، ایک پائیلی چاول، نیلی ساری، وغیرہ نہ صرف خواجہ احمد عباس کی بلکہ اردو کی عمدہ کہانیاں ہیں۔ ایک فنکار اپنی زندگی میں چند اچھی کہانیاں اور دو ایک ناول بھی چھوڑ جائے تو وہ اسے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوا کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو صرف ایک کہانی۔ ایک شعر سے بھی فنکار زندہ رہ جاتا ہے لیکن یہ سب یونہی نہیں ہوتا اس کے پیچھے فنکار کی اپنی تپسیا، محنت لگن، غور و فکر اور مقصد برابر کام کرتا رہتا ہے۔ ادب میں مقصدیت کا ہونا ایسا شجر ممنوعہ نہیں ہے جو بڑے ادب کی تخلیق میں مانع ہو۔ ہر شے کا اپنا ایک مقصد ہوتا ہے۔ خدا نے یہ کائنات بے مقصد نہیں بنائی۔ انسان کی

تشکیل بھی بے مقصد نہیں پھر ادب کس طرح بے مقصد ہوسکتا ہے۔ مقصدیت کا الزام لگانے والے ترقی پسندی یا اشتراکیت کی مخالفت کرنے والے اکثر خود بے مقصد ہوجاتے ہیں۔ ادب میں اس نوعیت کی باتیں کرنا غیرادبی وغیرتنقیدی ہی نہیں بلکہ غیراخلاقی اور غیرانسانی بھی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر ضیاءالدین نے اپنی کتاب 'خواجہ احمد عباس' میں ایک جگہ صاف طور پر کہا:

عباس آسمانوں کی طرف نهیں اُڑتے۔ مبالغے پر حقیقت کو ترجیح دیتے هیں۔ جذباتیت پر عقلیت کو، خوبصورتی پر انسانیت کو۔ انهیں معلوم هے که انسان محض عیش نهیں وه مرکب هے۔ مختلف جذبات اور احساسات کا مجموعه هے۔ متضاد جبلیات کا اس کے خمیر میں مختلف قوتیں کام کرتی هیں۔ عباس جاهلوں، جذباتیوں اور اعتقاد پرستوں کے افسانه نگار نهیں هیں۔ وه پڑھے لکھے باشعور بالغ اذهان کے افسانه نگار هیں۔ وه افسانه نگاروں کے افسانه نگار هیں۔

''اردو ادب کے لیے یہ خوش آئند بات نہیں ہے کہ افسانے پر لکھے جانے والے نقادوں میں سے بیشتر نے ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں غیرذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا ہے اور ان کی کوششوں کو سرے سے نظرانداز کیا ہے۔''

جانے انجانے میں یہ سب رویے اس لیے بھی اپنائے گئے کہ عباس غیرمعمولی صحافی تھے۔ اس لیے ان کے تخلیقی ادب میں صحافتی موضوعات یا رویے کا در آنا فطری تھا اور ادب میں صحافت کا دخل ہو یہ بات محدود و مشروط فنکاروں و نقادوں کو منظور نہیں۔ وہ عشق انسانی سے زیادہ عشقِ جسمانی کے قائل ہیں۔ وہ للکار سے زیادہ فریاد کے قائل ہیں۔ وہ رزم سے زیادہ بزم کے قائل ہیں اور عباس انسان اور انسانیت کے قائل ہیں۔ ان کے ادب کا مطلب اور مقصد محض اپنی ذات ونظریے کا فروغ نہیں بلکہ انسانیت کا فروغ ہے۔ تبھی تو ان کے ایک اور دوست اور ممتاز افسانہ نگار کرشن چندر نے عباس کے بارے میں لکھا:

''عباس آسمانوں کی طرف نہیں اُڑتے۔ مبالغے پر حقیقت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جذباتیت پر عقلیت کو، خوبصورتی پر انسانیت کو۔ انھیں معلوم ہے کہ انسان محض عیش نہیں وہ مرکب ہے۔ مختلف جذبات اور احساسات کا مجموعہ ہے۔ متضاد جبلیات کا اس کے خمیر میں مختلف قوتیں کام کرتی ہیں۔ عباس جاہلوں، جذباتیوں اور اعتقاد پرستوں کے افسانہ نگار نہیں ہیں۔ وہ پڑھے لکھے باشعور بالغ اذہان کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ افسانہ نگاروں کے افسانہ نگار ہیں۔''

اور یہ بالکل سچ ہے کہ وہ افسانہ نگاروں کے افسانہ نگار ہیں۔ نقادوں کے نہیں۔ اسی لیے عباس پر افسانہ نگاروں نے زیادہ لکھا نقادوں نے کم اور ادب تو محض نقادوں کے لیے لکھا بھی نہیں جاتا بلکہ انسانوں کے لیے لکھا جاتا ہے جو گردش صبح و شام میں پھنسے زندگی سے نبرد آزما ہوتے رہتے ہیں اور جن کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ عباس نے انھیں پر قلم اٹھایا اور انھیں اس طرح زندہ کردیا جیسے گھیسو، مادھو، کالو بھنگی، منگو کوچوان، لاجونتی، آپا، آنندی وغیرہ زندہ ہوگئے۔ اسی طرح 'سردار جی' امر ہوگئے۔ ابابیل کا سفاک کسان بھی نیلی ساری کی سلیمہ بھی اور بعض دوسرے کردار جو اپنے حسن و جمال سے امر نہیں ہوئے بلکہ اپنی بدصورتی، بدحالی سے امر ہوئے اور انھیں امر بنایا۔ خواجہ احمد عباس کے قلم نے۔ اس کی سادگی اور حقیقت نگاری نے۔

خواجہ احمد عباس پر کئی زاویوں سے طولانی گفتگو کی جاسکتی ہے جس کی گنجائش اس مقالے میں نہیں۔ یہ تو محض ایک تاثر ہے ایک خراج ہے— ہر فنکار کی طرح خواجہ احمد عباس میں بھی کمیاں اور کمزوریاں تھیں جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ ایک روشن دماغ صحافی اور انسانیت پرست افسانہ نگار تھے۔ ان کی فلموں کا بھی ایک مقصد تھا۔ ایک پیغام، وہ اپنا کے بنیادگزاروں میں تھے تو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی معماروں میں سے تھے۔ وہ 1939 میں کلکتہ کی کانفرنس میں شریک ہوئے تو پھر زندگی بھر اس سے وابستہ رہے اسی طرح ہفتہ وار بلٹز کے کالم پابندی سے دہائیوں تک لکھتے رہے۔ وہ باقاعدہ مارکسسٹ نہ تھے اور نہ ہی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے، وہ صوفیانہ راستوں سے اور خاندانی روایتوں سے انسان دوست تھے۔ وہ نہرو سے بے حد متاثر تھے ان کا سیکولرزم اور سوشلزم اور شفاف شخصیت انھیں ہمیشہ متاثر کرتا۔ عباس کی ترقی پسندی مشرقی نوعیت کی انسان دوستی سے پھوٹی تھی جس کی وہ مزید جدید نظریات سے آبیاری کرتے رہے۔ عباس ادب وصحافت کو زندگی بدلنے اور سماج کو برابر کرنے کا بہترین آلہ سمجھتے تھے۔ وہ وقتی آزادی اور لمحاتی خوشی کے قائل نہ تھے وہ دہائیوں اور صدیوں کے ادیب تھے۔ شاید اسی لیے ظفر پیامی نے لکھا ہے:

''خواجہ احمد عباس لمحوں کے نہیں یگوں کے ادیب تھے۔ انھیں ان حشرات الادب کے پیمانوں سے نہیں پرکھا جاسکتا ہے۔ جن کی نسلیں جلد جلد بدل جاتی ہیں اور حشرات الارض کی مانند نئی برسات کے انتظار میں فنا ہوجاتی ہیں۔''

ادیب و فنکار تو پیدا ہوتے رہے لیکن خواجہ احمد عباس جیسے مخلص، محنتی، ایماندار اور سچے دل و دماغ سے لکھنے والے ادیب صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں— اور صدیوں تک کے لیے اپنے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔

■

Prof. A. A. Fatmi, Dept of Urdu, University of Allahabad, Allahabad - 211001 (UP)

▫ ارشادانصاری

اردو کا ہمہ جہت عظیم فنکار

خواجہ احمد عباس

زمانے نے ہمیشہ عظیم فنکاروں کو جنم دیا ہے۔ میر، سودا، غالب، سرسید، شبلی اور اقبال جیسے عظیم شعرا و ادبا اپنے مخصوص زمانے اور عہد کی پیداوار تھے۔ ان شعرا و ادبا کو مقبول بنانے میں جہاں ان کی تخلیقی اور علمی صلاحیتیں کارفرما رہی ہیں، وہیں انھیں ابدی حیثیت بخشنے میں ان کے زمانے اور ماحول کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا ہے، جس کی آنچ میں تپ کر انھوں نے اپنے فن کو کندن بنایا اور ادب میں وہ نقوش چھوڑے جس کا عکس کبھی دھندلا نہیں سکتا۔

ترقی پسند تحریک کی پہلی ترقی پسند مصنّفین کانفرنس کے ساتھ جس کا آغاز بیسوی صدی کی تیسری دہائی میں (1936) ہوا نہ صرف سیاسی، سماجی اور معاشی بلکہ ادبی لحاظ سے بھی کافی کارآمد ثابت ہوئی۔ ادب میں پرانی قدروں، روایتی قصّوں کو بالائے طاق رکھنے اور زمانے اور سماج کی عکاسی پر زور دیا جانے لگا۔ اس فعال انگیز دور نے بعض ایسی شخصیتوں کو بھی جنم دیا جنھوں نے اپنی کثیرالجہات خوبیوں سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔ خواجہ احمد عباس کی شخصیت اسی عہد کی دین ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقی اور علمی صلاحیتوں سے نہ صرف اردو ادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا بلکہ اپنی عملی زندگی میں وہ کارنامے انجام دیے جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

خواجہ احمد عباس کی پیدائش رواں سال سے ٹھیک 99 سال قبل 7 جون 1914 میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم حالی کے ذریعے قائم کیے گئے اسکول حالی مسلم ہائی اسکول میں حاصل کی۔ 15 برس کی عمر میں وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے علم کی تشنگی بجھانے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کا رُخ کیا جہاں سے 1932 میں ایم اے (انگلش) اور 1935 میں وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ بی اے کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہی انھوں نے اپنی علمی زندگی کا آغاز (نیشنل کال) اور (ہندوستان ٹائمز) جیسے اخبارات میں بلا معاوضہ کالم لکھنے سے کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار (Aligrah Openion) جاری کیا۔ 1935 سے 1947 تک ممبئی کے کرانیکل اخبار سے وابستہ رہے۔ اسی دوران اخباروں کے فلمی کالم بھی لکھتے رہیں۔ موصوف کی شادی 1947 میں مجتبائی خاتون سے ہوئی جن کا انتقال 1958 میں ہوا۔ 1947 کے آغاز میں ہی اخبار ممبئی کرانیکل کو خیر آباد کہہ کر Blitz اخبار میں چلے گئے۔ 1975 سے 1976 تک انڈین فلم ڈائریکٹر ایسوسی ایشن کے صدر کے طور پر کام کیا۔

خواجہ احمد عباس ایک بیباک صحافی تھے۔ انھوں نے زمانۂ طالب علمی سے ہی اس میدان میں قدم رکھا۔ ملک کی آزادی میں انھوں نے اپنی صحافت سے اہم کردار ادا کیا۔ لیکن ان کی شخصیت محض صحافی تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ کئی جہتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ بیک وقت ایک اعلیٰ سیاسی لیڈر، پروڈیوسر، اسکرپٹ رائٹر اور اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار تھے۔ ان کا پہلا افسانہ 'ابابیل' تھا جو جامعہ دہلی سے 1937 میں شائع ہوا۔ اردو کے افسانوی ادب میں انھوں نے تقریباً 11 افسانوی مجموعے چھوڑے ہیں جو اپنے مخصوص زبان و بیان، اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں:

(1) ایک لڑکی (اوّل افسانوی مجموعہ جو دو جلدوں میں شائع ہوا)

(2) زعفران کے پھول (1948 میں ممبئی سے شائع ہوا)

(3) اندھیرا اجالا (اس میں ہندی افسانے بھی شامل ہیں)

(4) کہتے ہیں جس کو عشق (اس میں تین طویل افسانے شامل ہیں جس کی اشاعت 1954 میں ہوئی)

(5) میں کون ہوں (15 افسانوں کا مجموعہ جو 1949 میں منظر عام پر آیا)

(6) نیلی ساری (1982)

(7) گیہو اور گلاب (17 افسانوں کا مجموعہ جو 1965 میں شائع ہوا)

(8) پاؤں میں پھول

(9) بیسوی صدی کے لیلیٰ مجنوں

(10) نئے دھرتی نئے انسان

(11) دیا جلے ساری رات (1959 میں)

ناول:

(1) انقلاب (اس افسانے کا روسی ایڈیشن بھی شائع ہوا)

(2) چار دل چار راہیں (1959)

(3) رقص کرنا ہے اگر

ڈرامے:

(1) جو بیدہ

(2) یہ امرت ہے

(3) چودہ گولیا

موصوف نے دو رپورتاژ بھی لکھے:

(1) مسافر کی ڈائری (1924 میں دہلی سے شائع ہوا)

(2) سُرخ زمین اور پانچ ستارے

غرض کہ خواجہ احمد عباس نے ادب کی بیشتر اصناف کو چھوا اور اس میں اپنی انفرادیت کے عمدہ نقوش بھی چھوڑے ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی انھوں نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ اردو ادب میں انھوں نے ڈرامے، ناول اور رپورتاژ بھی لکھے لیکن ان کی شہرت ان کے افسانوں کی وجہ سے ہے۔ ان کے افسانے بھی ترقی پسند موضوعات مثلاً بھوک، معاشرتی ومعاشی نظام کی فرسودگی، جنس، زمین، کھیت، کارخانے، کسان، مزدور، کلرک وغیرہ کے ارد گرد ہی گردش کرتے ہیں جو اس دور کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں کا موضوع رہا۔ لیکن موضوع کی یکسانیت کے باوجود ہر افسانہ نگار اپنی مخصوص طرز اسلوب کی بنا پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ خواجہ احمد عباس کی شناخت بھی ان کے مخصوص طنزیہ اور بیباک انداز تحریر کی وجہ سے اپنی جگہ قائم ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں ان کے جرات منداور بیباک لہجے کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ لیکن ان کی یہ بیباکی منٹو اور عصمت کی بیباکی سے بہت مختلف ہے اور پریم چند کی شائستگی سے بہت قریب دکھائی دیتی ہے۔ دو ہاتھ، گندم اور گلاب، دانہ کی کہانی، زعفران کے پھول، اندھیرا اجالا، ممبئی رات کی باہوں میں جیسے افسانے خالص ترقی پسند موضوعات کو سمیٹے ہوئے ان کے منفرد انداز تحریر کی بہترین مثالیں ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں نے اگرچہ رومانیت سے دامن چھڑا کر براہ راست اظہار مطلب پر زور دیا لیکن بعض ادیب وشاعر ایسے بھی تھے جنھوں نے یکسر طور پر رومانی اسلوب کو خیر آباد نہیں کیا بلکہ اپنے مخصوص رومانی اسلوب میں ہی ترقی پسند موضوعات کو پیش کرتے رہیں۔ خواجہ احمد عباس کے افسانوں کا اسلوب اگرچہ رومانی اسلوب سے بالکل مختلف ہے لیکن ان کے کئی افسانے

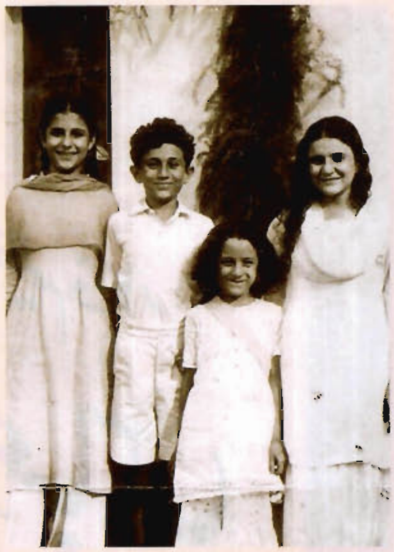

خواجہ احمد عباس کے بھتیجے بھانجیاں سیدہ، انور، بینا اور نرگس

ایسے بھی ہیں جن میں رومانی فضا موجود ہے۔ اندھیرا اجالا، ممبئی رات کی باہوں میں اور دیا جلے ساری رات جیسے افسانوں میں رومانیت کا رنگ موجود ہے۔ افسانہ 'دیا جلے ساری رات' محبت کے موضوع پر لکھا گیا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ایک محبوبہ اپنے عاشق کی موت کے بعد بھی اس کا انتظار کرتی ہے۔ اس افسانے کے مطالعے

خواجہ احمد عباس نے ادب کی بیشتر اصناف کو چھوا اور اس میں اپنی انفرادیت کے عمدہ نقوش بھی چھوڑے ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی انھوں نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ اردو ادب میں انھوں نے ڈرامے، ناول اور رپورتاژ بھی لکھے لیکن ان کی شہرت ان کے افسانوں کی وجہ سے ہے۔

سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خواجہ احمد عباس کے یہاں نہ صرف طنزیہ لب ولہجہ موجود ہے بلکہ ان کے فن میں ایسی فنی خوبیاں بھی ہیں جو انھیں صف اوّل کا افسانہ نگار بناتی ہیں۔

اردو افسانہ نگاروں نے ہر دور میں افسانے کو زمانہ اور سماج کی عکاسی کا ذریعہ بنایا ہے۔ آزادی کے بعد برپا ہونے والے فسادات نے اردو افسانے کو نئے موضوعات سے آشنا کیا۔ ملک میں فسادات پھوٹنے سے جہاں عام لوگ متاثر ہوئے وہیں شاعر و ادیب بھی اس دلخراش سانحہ سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ لہٰذا قتل، افلاس، غربت، جنسی استحصال وغیرہ جیسے موضوعات پر بے شمار افسانے لکھے گئے۔ خواجہ احمد عباس نے بھی ایک حساس فنکار کی طرح سماج میں برپا ہونے والے فسادات کو موضوع بنایا۔ اجنتا، میجر رفیق مارا گیا، انتقام، اردو، واپسی کا ٹکٹ، شکر اللہ وغیرہ خواجہ احمد عباس کے اس دور کے بہترین افسانے ہیں۔ اس دور میں لکھے گئے ان کے افسانے زیادہ تر انسان دوستی کے نظریے پر مبنی ہیں۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ 'اجنتا' اور 'میری موت' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ 'میری موت' میں انھوں نے شیخ برہان الدین اور ایک سکھ کردار کے ذریعے انسان دوستی کی بشارت دی ہے۔ شیخ برہان الدین سکھوں سے نفرت کرتا ہے لیکن جب ایک سکھ ہی اس کی جان بچانے کے لیے خود قربان ہوجاتا ہے تو اس کی آنکھوں سے نفرت کا پردہ ہٹ جاتا ہے اور ندامت کا پہلو اس پر ایسا غالب ہوتا ہے کہ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گولی لگنے سے سردار جی کی نہیں بلکہ اس کی موت ہوگئی ہے۔ یہ افسانہ اپنے اسلوب، پلاٹ اور موضوع کے لحاظ سے فسادات کے تناظر میں لکھے گئے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔

اس طرح خواجہ احمد عباس نے ترقی پسند تحریک کے موضوعات پر افسانے لکھ کر ہر محاذ پر ترقی پسند ادیب ہونے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ افسانوں کے علاوہ ان کے ناول بھی اردو ادب میں کافی مشہور ہوئے اور یہ ادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہیں لیکن انھیں شہرت ان کے افسانوں کے بدولت ہی ملی۔ انھوں نے رپورتاژ اور ڈراموں کے ذریعے بھی ادب میں اضافہ کیا۔ ادبی زندگی سے ہٹ کر انھوں نے اپنی عملی زندگی میں بھی بحیثیت فلم ڈائرکٹر، پروڈیوسر اور اسکرپٹ رائٹر کے طور پر کام کیا۔ لہٰذا اپنی ان کثیر الجہات خوبیوں کی بنا پر انھوں نے ادب اور زندگی کے دوسرے شعبہ حیات میں جو کارنامے انجام دیے وہ کبھی بھلائے جانے کے قابل نہیں لیکن یہ مقام افسوس ہے کہ آج اردو ادب میں ان کے کارناموں کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔

■

Irshad Ansari, H-No: 1/A, BL: 23, Kelabagan, Jagatdal-24 pgs (N) (W.B)

قدسیہ نصیر

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کی اہمیت

سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی جیسے مشہور و معروف اردو افسانہ نگاروں کے ہم عصر خواجہ احمد عباس ایک قابلِ ذکر افسانہ نگار ہیں جو ترقی پسند مصنّفین کے اہم ستون تھے۔ خواجہ احمد عباس کا پہلا افسانہ 'ابابیل' 1935 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شائع ہونے والے رسالہ 'جامعہ' میں شائع ہوا، جس کا ذکر انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں بھی کیا ہے۔ یہ افسانہ بقول عباس تیرہ جگہوں سے واپس آنے کے بعد 'جامعہ' میں شائع ہوا۔ شائع ہوتے ہی اس افسانے کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں مثلاً جرمن، انگریزی، فرانسیسی، روسی، عربی، چینی، سویڈش وغیرہ میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس افسانے کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جرمن زبان میں افسانوں کا ایک انتخاب شائع ہوا جس میں ہندستان کی تین کہانیاں لی گئیں۔ ایک رابندر ناتھ ٹیگور کی، ایک ملک راج آنند کی اور ایک خواجہ احمد عباس کی۔ اسی طرح ملک راج آنند اور اقبال سنگھ نے کہانیوں کا جو انتخاب شائع کیا اس میں بھی 'ابابیل' شامل ہے۔

خواجہ احمد عباس کو ادیب اور قلم کار بنانے کے پیچھے سب سے بڑا محرک تھا ان کے خاندان کا ادبی اور علمی ماحول۔ ان کے خاندان کے کئی لوگ جو اُن کے ہم عمر یا بزرگ تھے ادب میں کافی شہرت رکھتے تھے۔ قدرت نے انھیں ایسے خاندان میں پیدا کیا جو علم و فن میں یکتا تھا۔ گھر کا ماحول نہایت ادبی اور علمی تھا۔ جس سے عباس کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر ہونے میں مدد ملی۔ عباس نے اس کا اعتراف پروفیسر محمود الٰہی کو فروری 1983 میں دیے گئے ایک انٹرویو میں خود بھی کیا ہے:

"ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا جس میں کتابیں تھیں، رسالے تھے، ہماری عورتیں، گھر کی عورتیں، اردو کے اکثر رسالے جو عورتوں کے لیے لکھے جاتے تھے انھیں منگاتی تھیں اور پڑھتی تھیں۔ تو جب ہم بالکل چھوٹے تھے تو ان کی زبانی سنا کرتے تھے ان کو اور جب بڑے ہو گئے تو پھر پہلی دفعہ ہم نے 'گودڑ کا لال' اور اس کے بعد 'فسانہ آزاد' پڑھا۔ سات آٹھ برس کا تھا میں کہ جب رضائی اوڑھ کر رات کو 'فسانۂ آزاد' پڑھا کرتا تھا۔"

ہماری زبان، دہلی، 22 اکتوبر 1987 ص 8

اردو ادب کی اہم ترین شخصیت، خواجہ الطاف حسین حالی عباس صاحب کے پرنانا تھے۔ آپ کے والد کا نام خواجہ غلام السبطین تھا۔ مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین آپ کے چچا زاد بھائی تھے۔ پانی پت میں حالی مسلم ہائی اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عباس علی گڑھ پہنچے۔ علی گڑھ کے تعلیمی ماحول میں وہ سب سے زیادہ اپنے چچا زاد بھائی خواجہ غلام السیدین سے متاثر ہوئے۔ غلام السیدین خود ایک ماہر تعلیم اور ادیب تھے۔ انھوں نے عباس کی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ علی گڑھ میں عباس ان کی ہی سرپرستی میں رہے۔ ان کی ذاتی لائبریری سے استفادہ کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"علی گڑھ میں گیارہ بارہ برس کی عمر میں گیا تھا۔ اور وہاں کسی ہاسٹل میں نہیں رہتا تھا بلکہ میرے برادر بزرگوار چچا زاد بھائی خواجہ غلام السیدین جو وہاں پروفیسر آف ایجوکیشن تھے، ان کی سرپرستی میں رہتا تھا۔ ان کا گھر جو تھا وہ بذات خود ایک لائبریری تھا۔ یعنی ہر کمرے میں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ تو یہ کتابوں کی صحبت مجھے پہلے نصیب ہوئی اور لکھنے کی رغبت بعد میں پیدا ہوئی۔"

خواجہ احمد عباس، مقدمہ، دیا جلے ساری رات، ص 22

ایسے خاندان میں آنکھ کھولنے اور ایسے ماحول میں پرورش پانے والے خواجہ احمد عباس کو ادیب تو بننا ہی تھا۔ قلم سے ان کا رشتہ خاندانی وراثت کے طور پر انھیں ملا تھا۔ لیکن عباس صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ ان کے کارنامے ناول نگاری اور صحافت سے لے کر فلم سازی

تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پہ ان کی حیثیت اردو ادب میں ایک افسانہ نگار کی ہی ہے۔ 'ابابیل' کے شائع ہونے کے بعد ایک طویل عرصے تک مختلف ادبی رسالوں خاص طور پر 'ادب لطیف' 'افکار' 'سیپ' اور 'نیا دور' وغیرہ میں ان کی مختلف کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ ان کا پہلا افسانوں کا مجموعہ 'ایک لڑکی' کے نام سے شائع ہوا جو بہت مقبول ہوا۔ ان کا ادبی سفر نصف صدی کو محیط ہے۔ اس مدت میں انھوں نے تین سو سے زائد افسانے لکھے۔ خواجہ احمد عباس کے شائع شدہ افسانوی مجموعے مندرجہ ذیل ہیں:

(1) ایک لڑکی (2) پاؤں میں پھول (3) زعفران کے پھول (4) میں کون ہوں؟ (5) دیا جلے ساری رات (6) پانچ دانے پیار کے (7) پیار کی پکار (8) گیہوں اور گلاب (9) چراغ تلے اندھیرا (10) پیرس کی ایک شام (11) کہتے ہیں جس کو عشق (12) بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں (13) نئی دھرتی نئے انسان (14) نیلی ساڑی (15) سونے چاندی کے بت (اس مجموعہ میں فلم پر مضامین اور فلمی اداکار کے خاکے بھی شامل ہیں) (16) ماڈرن الف لیلیٰ

ایک لڑکی خواجہ احمد عباس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ 'ایک لڑکی' کے متعلق انور سدید رقم طراز ہیں:

''یہ 1938 کے مسلم معاشرے کی کہانی ہے اور اس کی نمائندہ سلمیٰ تھی جس نے مسلمانوں کے واحد دارالعلوم میں داخلہ لے کر مخلوط تعلیم کی ابتدا کی تھی اور اس پر ایک مقدمہ کورٹ میں دائر کیا گیا جو سلسلہ در سلسلہ چلتا رہا... یہ افسانہ تکنیک کے اعتبار سے بھی منفرد ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی وہ کٹیلی طنز ہے جو افسانہ کے باطن میں موجود اور پڑھنے والوں کے دل کی طرف براہ راست تیر افگنی کرتی ہے۔''

دریافت، مرتبہ، وزیر پانی پتی، کراچی، ص 71

جس دور میں خواجہ احمد عباس نے افسانہ نگاری کی ابتدا کی اس دور کی افسانہ نگاری میں مجموعی حیثیت سے تین خصوصیات نمایاں ہیں۔ پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر افسانہ نگار کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ افسانہ اور زندگی کی حقیقتوں میں ربط ہونا چاہیے۔ اس دور کے افسانوں کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ لکھنے والوں کے مزاج اور شخصیت کا بہت گہرا پرتو ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ افسانہ نگار اسلوب اور فن میں نئے نئے تجربے کرنے سے نہیں گھبراتے۔ خواجہ احمد عباس صاحب کے یہاں بھی یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں اس لیے ان کا شمار ان ممتاز ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو افسانہ نگاری کو وقار بخشا۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا تھا۔ وہ سماج میں مساوات کے زبردست حامی تھے۔ 1947 کے فسادات نے ہر حساس فنکار کو رلایا۔ رامانند ساگر نے 'اور انسان مرگیا' جیسا ناول اور کرشن چندر نے 'ہم وحشی ہیں' جیسی کہانی لکھی۔ خواجہ احمد عباس جیسا حساس فنکار اپنے قلم کو بھلا کیسے روک سکتا تھا۔ انھوں نے فسادات کے موضوع پر 'میں کون ہوں' اور 'میری موت' جیسے افسانے لکھے۔ میں کون ہوں نام کے مجموعے میں کل گیارہ افسانے شامل ہیں۔ اور یہ تمام افسانے

فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ افسانہ 'میری موت' پہلے 'سردار جی' کے نام سے شائع ہوا۔ لوگوں نے اسے بے حد پسند کیا۔ لیکن یہی افسانہ جب ہندی (دیوناگری) میں چھپا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ خواجہ احمد عباس پر مقدمہ چلایا گیا۔ حالانکہ عباس صاحب کا مقصد کسی قوم یا فرقے کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں تھا۔ تاہم انھوں نے اظہار افسوس کیا اور بعد میں یہ افسانہ 'میری موت' کے نام سے مجموعے میں شامل کیا گیا۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں پر یہ الزام عائد کیا جانے لگا کہ وہ محبت کی کہانیاں نہیں لکھتے۔ وہ اپنے افسانوں میں ہمیشہ بھوک، بے کاری اور بیماری کا رونا روتے ہیں۔ عباس صاحب نے اس الزام کا جواب دیا' کہتے ہیں جس کو عشق'، 'شکر اللہ کا' اور 'مسوری' جیسے افسانے لکھ کر۔ یہ تینوں طویل افسانے ان کے مجموعے' کہتے ہیں جس کو عشق' میں شامل ہیں۔ یہ افسانے عشقیہ موضوع پہ ضرور ہیں مگر ان کا تعلق روایتی عشق سے نہیں ہے۔

عباس صاحب کا تعلق بمبئی کی فلمی دنیا سے بڑا گہرا تھا۔ اس لیے ان کے کئی افسانوں میں بمبئی کی زندگی اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ 'پاؤں میں پھول' ایسا ہی ایک خوبصورت افسانہ ہے جس میں فلمی دنیا کی زندگی کو اندر تک جھانک کر دیکھنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

عباس صاحب کے افسانوں پر مقصدیت حاوی ہے اس لیے کہیں کہیں افسانے کا فن مجروح ہوتا ہے۔ مگر ان کو اس کی فکر نہیں ہے۔ وہ تو افسانے کے ذریعے اپنی فکر کو قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ کشمیر اور کشمیر کے حسن پر اردو کے کئی افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے ہیں۔ کرشن چندر نے تو کشمیر کے حسن کو بھرپور ڈھنگ سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ عباس صاحب کے افسانہ 'زعفران کے پھول' کا تعلق بھی کشمیر سے ہے۔ لیکن یہاں کشمیر کا حسن نہیں ہے بلکہ ڈوگرا حکمرانوں کے ظلم و تشدد کے خلاف کشمیری عوام کی صدائے احتجاج کی کہانی نمایاں ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک دیہاتی لڑکی زعفرانی ہے۔ زعفرانی شیخ محمد عبداللہ کی تقریریں کر متاثر ہوتی ہے اور ایک انقلابی بن کر سماج کو تبدیل کرنے کا خواب دیکھنے لگتی ہے۔ اس افسانے میں فن کی سطح پر عباس صاحب نے تجربہ کیا ہے۔ اسی لیے بعض ناقدین 'زعفران کے پھول' کو افسانہ کے بجائے رپورتاژ قرار دیتے ہیں۔ لیکن عباس صاحب ناقدین ادب کی تنقید سے گھبراتے نہیں تھے۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'نیلی ساڑی' مکتبہ جامعہ سے 1983 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے آخر میں وہ اپنی افسانہ نگاری کے متعلق رقمطراز ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی ترقی کا راز ہم آہنگی میں ہے۔ بھائی چارے میں ہے۔ آپسی میل جول اور اتفاق میں ہے۔ اس لیے میں ان چیزوں کے حق میں ہوں جو ہم آہنگی اور اتحاد کو فروغ دیتی ہیں اور ان سب کے خلاف ہوں جو ان کی کاٹ کرتی ہیں۔ میں اپنی کہانیوں کے ذریعے بہتر انسان کی تخلیق کرنا چاہتا ہوں۔''

خواجہ احمد عباس میں دوسروں کی اچھی چیزوں کو اپنا لینے کا حوصلہ بھی تھا اور نت نئے اسلوب تلاش کر کے انھیں بے جھجک سامنے لانے کی جرأت بھی۔ اجتماعی زندگی کے مسائل فرد کے ذہن اور دل و دماغ پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کا مطالعہ عباس صاحب نے بڑی باریک بینی سے کیا ہے اور فرد کے فکری اور جذباتی ردعمل کو

خواجہ احمد عباس اور ان کی فیملی

ایک خاص انداز میں اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کا جو مشاہدہ کیا اس سے نئے نئے موضوعات سامنے آئے۔ ان نئے موضوعات کے اظہار کے لیے عباس صاحب نے نت نئے تجربات کیے۔ کچھ تجربے کامیاب ہوئے اور کچھ ناکام رہے۔ تجربات کی کامیابی یا ناکامی کا ان پہ کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ بنے بنائے راستے پر چلنے کے بجائے اپنا راستہ خود بناتے تھے اور موضوع کے لحاظ سے اسلوب اپناتے تھے۔

ایسا ہی ایک تجربہ ہمیں ان کے افسانہ 'مونتاژ' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ 'مونتاژ' ہر لحاظ سے ایک منفرد افسانہ ہے۔ اس افسانے میں خواجہ احمد عباس نے فن مصوری کی تکنیک کو فلم سازی کی معرفت اختیار کیا ہے۔ بظاہر غیر متعلق، بے ربط، بے میل اور بے معنی مناظر میں ایک خاص ڈھنگ سے ربط پیدا کرنے کو فلمی تکنیک میں مونتاژ کہتے ہیں۔ عباس صاحب نے اس افسانے میں مختلف غیر متعلق واقعات اور خبروں کو سلسلہ وار لکھ کر افسانے کی شکل دی ہے۔ ان میں زیادہ تر اخباروں کی سرخیاں یا واقعات کا ذکر ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ایک کہانی ہے جو عدالت میں ایک عورت کے خلاف مقدمے کی شکل میں چل رہی ہے۔ پھر بیچ بیچ میں خبروں کی سرخیاں ہیں اور ان ہی سے مماثل اس کہانی کے مرکزی کردار گنگا کی کہانی ہے۔ ان تمام واقعات کو یکجا کر کے ایک نئے تکنیکی تجربے کو افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی جیسے افسانہ نگار ہندستان کی جہالت، توہم پرستی، فرقہ واریت، عدم مساوات اور دوسری تمام سماجی برائیوں کے خلاف مختلف نوعیت کے افسانے لکھ رہے تھے۔ خواجہ احمد عباس کا ذہن شاید ان میں سب سے زیادہ انقلابی تھا اسی لیے اکثر مقام پر انھوں نے فن پر فکر کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے نظریات کی ترسیل کے لیے افسانے لکھے۔ ایسا ہی ایک افسانہ 'گیہوں اور گلاب' بھی ہے۔ یہ قدرے طویل افسانہ ہے۔ افسانے کے عنوان سے ہی ہم چونک پڑتے ہیں کہ بظاہر 'گیہوں' اور 'گلاب' میں کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔ لیکن ان دونوں لفظوں کا استعمال عباس صاحب نے یوں ہی نہیں کیا ہے۔ یہ دو لفظ زندگی کے دو مختلف دھاروں کی علامت بن جاتے ہیں۔ گیہوں علامت ہے محنت، مشقت اور مادیت کی جبکہ گلاب عیش و عشرت اور جمالیات کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ دونوں میں ایک کشمکش ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے گیہوں اور گلاب میں سے کس کا وجود زیادہ ضروری ہے۔ خواجہ احمد عباس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے گیہوں کو گلاب پر یا گلاب کو گیہوں پر فوقیت دینے کے بجائے دونوں کے وجود اور دونوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ ورنہ کارل مارکس کے نظریات پر ایمان رکھنے والے عباس سے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ گلاب کی اہمیت کو یکسر نظر انداز کر دیتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ گیہوں اور گلاب کے حامیوں کے درمیان کشمکش دکھاتے ہوئے اس حقیقت کو منکشف کرنا چاہتے ہیں کہ زندگی کے لیے دونوں کا وجود بے حد ضروری ہے۔ گیہوں پیٹ کی آگ بجھانے کے کام آتا ہے۔ بھوک مٹا کر ہمیں قوت و توانائی عطا کرتا ہے تو گلاب سے ہمیں ذہنی آسودگی ملتی ہے۔ گلاب ذہن کو تازگی اور فرحت عطا کرتا ہے۔

ترقی پسند افسانہ نگاری کے حوالے سے جن چار ناموں کا ذکر سب سے پہلے آتا ہے وہ ہیں منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت۔ ان چاروں کے ساتھ خواجہ احمد عباس کا نام شامل کر کے انھیں 'ترقی پسند افسانہ نگاری کے عناصر خمسہ' قرار دیا جا سکتا ہے۔ صاحب طرز انشاپرداز مہدی افادی نے اپنے ایک مضمون میں محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی اور سرسید کو 'اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ' لکھا ہے۔ اپنے اس مضمون میں مہدی افادی نذیر احمد، حالی، شبلی اور سرسید کے کارناموں کی تعریف کرنے کے بعد محمد حسین آزاد کی عظمت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سرسید سے معقولات الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں لیکن 'آقائے اردو' یعنی پروفیسر آزاد صرف انشاپرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔''

فیروز احمد، مرتب: انتخاب مہدی افادی، ص 65

مہدی افادی کے انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ کرشن چندر کے افسانوں سے اگر 'کشمیر' الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں بچتا، بیدی گھریلو معاملات کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے، منٹو سے طوائفوں کی زندگی لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے، عصمت بھی جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے عورتوں کے مسائل کے ساتھ ہی چل سکتی ہیں لیکن خواجہ احمد عباس ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کو ان میں سے محض ایک سہارے کی ضرورت نہیں۔ ان کے یہاں بے پناہ تنوع اور رنگارنگی ہے۔ موضوعات ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے نظر آتے ہیں۔ جس طرح آقا کے سامنے سیکڑوں غلام کھڑے حکم کے منتظر ہوں اسی طرح موضوعات خواجہ احمد عباس کے سامنے دست بستہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

■

Dr. Qudsia Nasir, Hasan Manzil, Rahat Road, Kareem Chak, Chhapra, Bihar, 841301

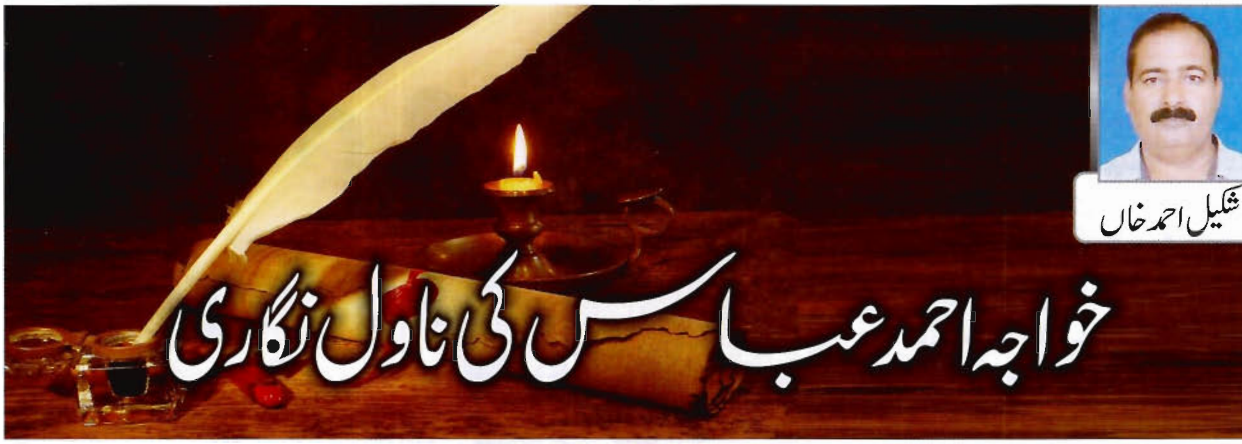

شکیل احمد خاں

خواجہ احمد عباس کی ناول نگاری

خواجہ احمد عباس بیک وقت صحافی، فلم اسٹوری رائٹر، فلم ڈائریکٹر، پروڈیوسر، مقرر، سماجی کارکن، افسانہ نگار اور ناول نگار سب کچھ تھے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ ہم یہاں خواجہ احمد عباس اور ان کی ناول نگاری سے متعلق گفتگو کریں گے۔ خواجہ احمد عباس نے درجن بھر ناول لکھے۔ ان کے ناولوں کو پڑھنے کے بعد شدت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ وہ اپنی فلموں کے لیے کہانیاں لکھتے تھے۔ ان کے ناولوں میں کسی فلسفیانہ فکر کی تلاش بے سود ہے۔ البتہ ان کے یہاں موضوعات کی رنگارنگی بہت ہے۔ گاؤں، دیہات اور کسانوں کے مسائل سے لے کر ممبئی کی فلمی دنیا کی چکاچوند تک خواجہ صاحب کے ناولوں کی دنیا بہت وسیع ہے۔

1942 میں ناول 'انقلاب' لکھ کر خواجہ احمد عباس نے ناول نگاری کی ابتدا کی۔ یہ ناول انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ یہ ایک ضخیم تاریخی ناول ہے۔ خود خواجہ صاحب کے بیان کے مطابق انھوں نے اگست 1942 میں یہ ناول انگریزی میں لکھنا شروع کیا۔ 1949 تک یعنی سات برس میں خواجہ صاحب اس ناول کے تیرہ باب لکھ سکے۔ یہ ناول امرتسر کے جلیاں والا باغ حادثہ سے شروع ہو کر گاندھی- ارون معاہدہ 1929 پر ختم ہوتا ہے۔ اردو کا یہ ضخیم ناول پہلے انگریزی میں لکھا گیا اور سب سے پہلے 1954 میں جرمن زبان میں شائع ہوا۔ اس کے اگلے برس یعنی 1955 میں یہ ناول 'سین اندی' کے نام سے روسی زبان میں چھپا۔ 1956 میں انگریزی میں اس ناول کی اشاعت ہوئی۔ دنیا کی کئی اور زبانوں میں چھپنے کے بعد یہ ناول 1960 میں ہندی میں شائع ہوا، اور جب کوئی اردو ناشر اسے چھاپنے کو تیار نہ ہوا تو خواجہ صاحب نے خود اپنے خرچ سے 1975 میں اسے اردو میں شائع کیا۔ خواجہ احمد عباس خود لکھتے ہیں:

"کوشش کرتا رہا کہ اردو کا کوئی پبلشر اس ناول کو چھاپنے کو راضی ہو جائے لیکن اس کی ضخامت دیکھتے ہی 'نہیں' کہہ دیتے تھے۔ پڑھنے کی تکلیف کسی نے نہ کی۔ جب کوئی تیار نہ ہوا تو اپنے اکسٹھویں سال میں میں نے خود اس کی کتابت کرائی۔ خود چھپوایا اپنے خرچ سے خود شائع کیا۔ (تعداد اشاعت ایک ہزار) دیکھیں کتنے برس میں یہ بکے گا۔"

خواجہ احمد عباس اپنے بھائی اظہر عباس، کے جی سیدین، بہن احمد فاطمہ، بھتیجی مینا کے ساتھ

(انقلاب کی کہانی (انقلاب)، ص6)

ناول انقلاب کا مرکزی کردار انور ظلم و استحصال کرنے والوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔ ناول کے قاری کو یہ اندازہ کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی کہ ناول کا مرکزی کردار انور دراصل خواجہ احمد عباس ہی ہیں۔ خواجہ صاحب کی خودنوشت سوانح I am not an Island اور ناول انقلاب کا موازنہ کیا جائے تو خواجہ صاحب اور انور کی زندگی میں بہت کچھ ایک جیسا ملے گا۔ ان کے عادات و اطوار میں زبردست مماثلت نظر آئے گی۔ ان دونوں کے قد وقامت میں بھی مشابہت ہے۔ دونوں کو کسانوں، مزدوروں اور غریب لوگوں سے بے پناہ ہمدردی ہے۔ دونوں ان کے لیے فکرمند رہتے ہیں جو دن رات محنت کرنے کے باوجود بھوکے اور ننگے رہتے ہیں۔

پلاٹ، کردار نگاری اور مکالمہ کے لحاظ سے یہ ایک کامیاب ناول ہے۔ طوالت کو اس ناول کی ایک کمزوری ضرور مانا جاتا ہے مگر اس کا پلاٹ بے حد منظم اور مربوط ہے۔ خواجہ صاحب اپنے کرداروں کے نفسیات سے خوب واقف ہیں، اس ناول میں بھی انور کے ظاہر و باطن سے خواجہ صاحب خوب واقف ہیں اور واقف کیوں نہ ہوتے کہ اس کردار میں وہ خود موجود ہیں۔

'انقلاب' کے علاوہ خواجہ احمد عباس نے 'ساحل اور سمندر'، 'چار یار'، 'فاصلہ'، 'شیشے کی دیواریں'، 'میرا نام جوکر'، 'چار دل چار راہیں'، 'تین پہیے اور دنیا بھر کا کچرا'، 'رقص کرنا ہے اگر'، 'دو بوند پانی'، 'بمبئی رات کی بانہوں میں' اور 'سات ہندوستانی' جیسے ناول لکھے۔ ان میں سے بیشتر ناول اردو کے علاوہ دیگر ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں بھی شائع ہوئے۔ سبھی ناولوں پہ فلمیں بنیں۔ ان میں قومی انعام یافتہ (National Award Winner) 'فلم سات ہندوستانی' بھی ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں 1947 میں ملک کی آزادی کے بعد بھی ایک زمانے تک گوا پر پرتگالیوں کا قبضہ تھا۔ گوا کو آزاد کرانے کے لیے ہندوستان کے ہر مذہب، ہر طبقے کے لوگوں نے جدوجہد کی۔ بہت قربانیوں کے بعد 1958 میں گوا آزاد ہوا اور ہمارے ملک کا ایک حصہ بنا۔

ناول 'سات ہندوستانی' گوا کی تحریک آزادی کی تاریخ ہے۔ گوا کو آزاد کرانے کے لیے کامریڈ آزاد آواز دیتے ہیں۔ کامریڈ آزاد کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے چھ جاں باز تیار ہوجاتے ہیں۔ انھیں خاص تربیت دے کر گوا بھیجا جاتا ہے۔ ان میں اترپردیش سے رام بھگت شرما، بہار سے انور علی، مدراس کا مہادیون، پنجاب کا جوگندر پال، بنگال کا سبودھ سانیال، مہاراشٹر کا سکھا رام شامل ہیں۔ گوا میں ساتویں ہندوستانی کے روپ میں انھیں ماریا ملتی ہے۔ ماریا ایک بہادر عیسائی لڑکی ہے جو ان چھ مردوں کے ساتھ مل کر گوا کی تحریک آزادی میں سرگرم ہے۔ اس ناول میں خواجہ صاحب نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمیں ذات، دھرم، مذہب کے نام پر تقسیم نہیں ہونا ہے بلکہ ایک ہندوستانی کے طور پر ملک کو ہماری ضرورت ہے۔ قومی اتحاد کا سبق خواجہ صاحب نے اس ناول کے ذریعے دیا ہے، کیونکہ ہمارے ملک کی ترقی اور خوش حالی قومی یکجہتی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ قومی اتحاد اس ناول کا خاص موضوع ہے۔ اسی ناول پر مبنی فلم 'سات ہندوستانی' وہ فلم ہے جو ہندوستان کے مقبول ترین فلم اداکار امیتابھ بچن کی پہلی فلم تھی۔

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے خواجہ احمد عباس کے ذاتی تعلقات تھے۔ خواجہ صاحب کے دل میں پنڈت نہرو کے لیے بڑی عزت تھی۔ آزاد ہندوستان کو ترقی کی راہ پر لے جانے کے لیے پنڈت نہرو کوشاں تھے۔ پنڈت نہرو کی خواہش پر خواجہ صاحب نے 'دو بوند پانی' فلم بنائی اور اسی فلمی کہانی کو ناول کی شکل میں بھی پیش کیا۔ یہ ناول دراصل راجستھان کے ریگستانی علاقے میں پانی کی قلت کو دور کرنے کی کہانی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو چاہتے تھے کہ راجستھان میں پانی کی قلت کو دور کرنے کے لیے نہر کی تعمیر کی جائے۔ اس کے لیے مقامی لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی ضرورت تھی۔ گنگا سنگھ اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے لیے خواجہ صاحب نے ایک مثالی گاؤں 'بھارتی گاؤں' تخلیق کیا ہے۔ جہاں ہندو مسلمان ایک ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ دوسرے تمام ناولوں کی طرح خواجہ صاحب کا یہ ناول بھی ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے لکھا گیا ہے، اس ناول کے ذریعے ناول نگار ملک کی ترقی اور وطن پرستی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔

'بمبئی رات کی بانہوں میں' بھی خواجہ صاحب کی ایک فلم ہے جسے انھوں نے بعد میں ناول کی شکل میں بھی

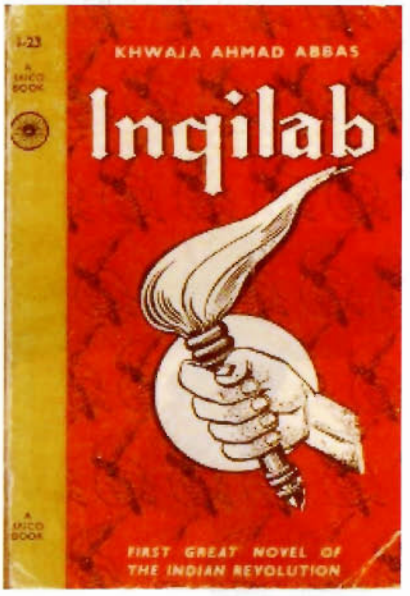

1942 میں ناول 'انقلاب' لکھ کر خواجہ احمد عباس نے ناول نگاری کی ابتدا کی۔ یہ ناول انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ یہ ایک ضخیم تاریخی ناول ہے۔ خود خواجہ صاحب کے بیان کے مطابق انہوں نے اگست 1942 میں یہ ناول انگریزی میں لکھنا شروع کیا۔ 1949 تک یعنی سات برس میں خواجہ صاحب اس ناول کے تیرہ باب لکھ سکے۔ یہ ناول امرتسر کے جلیاں والا باغ حادثہ سے شروع ہوکر گاندھی-ارون معاہدہ 1929 پر ختم ہوتا ہے۔ اردو کا یہ ضخیم ناول پہلے انگریزی میں لکھا گیا اور سب سے پہلے 1954 میں جرمن زبان میں شائع ہوا۔

پیش کیا۔ ناول کے پہلے حصے کا تعلق ایک صحافی کی زندگی سے ہے۔ دوسرا حصہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو دولت اور عورت کو اپنی کمزوری بنا لیتا ہے، صحافی امرکمار ایک اچھا انسان ہے، وہ دولت اور عورت کا لالچی نہیں ہے، اس لیے اس کی زندگی سکون اور عافیت سے گزرتی ہے۔ اس کے برعکس جانی کو دولت اور عورت کی ہوس ہے۔ یہ ہوس پرستی اسے برباد کر دیتی ہے۔ اسی طرح 'شیشے کی دیواریں' بھی ایک مقصدی ناول ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اور قیام پاکستان سے جو مسائل سامنے آئے ان کو موضوع بنا کر یہ ناول لکھا گیا ہے، اس ناول کے مرکزی کردار سلیم اور محمودہ مختلف ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ وہ برطانیہ اور امریکا بھی جاتے ہیں۔ لیکن مشرقی اقدار کی پاسداری کرتے ہیں۔ وہ مغرب میں رہ کر بھی مغربی تہذیب و تمدن کو اخلاقیات کے خلاف تصور کرتے ہیں۔

ناول 'چار دل چار راہیں' 1959 میں شائع ہوا، جس طرح میر امن کے 'باغ و بہار' میں چار درویشوں کی الگ الگ کہانیاں ہیں اسی طرح اس ناول میں چار کرداروں کی الگ الگ کہانیاں ہیں۔ یہ چار کردار چار الگ الگ دل رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کی چار الگ الگ راہیں ہیں۔ الگ الگ راہوں سے گزرتے ہوئے آخر میں یہ چاروں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اس ناول کی پہلی کہانی گاؤں کے ایک نوجوان گووند کی ہے۔ گووند ذات کا گوالا ہے۔ وہ گاؤں کے ایک برہمن پنڈت ہیرالال کی بیٹی رادھا سے پیار کرتا ہے۔ دوسری کہانی ایک طوائف کی ہے جو نواب سلطان آباد سے وابستہ ہے۔ تیسری کہانی گاؤں کے ایک غریب نوجوان کی ہے جو غربت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کر پاتا ہے۔ چوتھی کہانی چاولی دیوی کی ہے۔ چاولی کی شادی اس کی مرضی پوچھے بغیر ایک بوڑھے آدمی سے ہوجاتی ہے۔ لیکن حالات نے ان چاروں کو ایک مقام پر پہنچا دیا ہے اور ناول کا انجام طربیہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ احمد عباس کارل مارکس کے نظریات سے متاثر ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں ایک ایسے سماج کا تصور پیش کرتے ہیں جہاں اونچ نیچ نہ ہو، جہاں امیر غریب نہ ہوں، جہاں ذات پات نہ ہو۔ ایک ایسا سماج جہاں کوئی کسی کا استحصال نہ کرتا ہو۔ ایک ایسا سماج جو مساوات پر مبنی ہو۔ ان کے تمام ناول محنت کش عوام کے طرفدار ہیں۔ وہ اپنے ناولوں کے ذریعے مزدور اور محنت کش طبقے میں اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنے ناولوں کے ذریعے ایک ایسا صحت مند سماج تشکیل کرنا چاہتے ہیں جہاں محبت ہو، اخوت ہو، مساوات ہو، کسی پر کسی کو فوقیت نہ ہو۔ ان کے ناولوں کا ایک اور خصوصی موضوع قومی یکجہتی ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہیں۔ ان کا یقین تھا کہ قومی اتحاد کے بغیر ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہ اپنے بیشتر ناولوں میں اتحاد اور یگانگت کا تصور پیش کرتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کی ناول نگاری نے سماج کو ایک مثبت فکر دی ہے۔

■

Dr. Shakil Ahmad Khan, S/O Shabbir Ahmad Khan, Vill & Post- Lahwar, Via-Raiyyam Factory, Dist- Darbhanga - 847237 (Bihar)

اسرار اللہ انصاری

خواجہ احمد عباس کا فلمِ سنسار

خواجہ احمد عباس اردو زبان وادب کی اہم ترین اور مشہور و معروف شخصیت ہیں۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ترقی پسند تحریک اور اشترا کی نظریے نے جو چند گنے چنے معتبر دانشور ہمیں عطا کیے اِن میں موصوف کا نام منفرد شناخت کا حامل ہے۔ سرزمینِ حالی اور خانوادہَ حالی ایسے تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق کے سبب بچپن سے ہی ذہین وفطین ، زبان وادب اور نظریے پر مضبوط گرفت ومہارت اور فکرِ عالی سے مزیّن شخصیت پائی تھی۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی زبانوں سے ابتدائی عمر سے ہی لگاؤ کا انھیں بڑا فائدہ ملا، نیز تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر سرگرمیوں میں حصے داری، محنت وشائستگی اور بلند نظری بھی انھیں ورثے میں ملی تھی لہٰذا زبان وادب، سیاست، فکشن، صحافت، اسٹیج اور فلم سبھی محاذ پر انھیں یکساں شہرت ملی۔ان کی شخصیت ملک اور ملک کی سرحدوں سے باہر بھی معزز اور باعث اعزاز وافتخار سمجھی گئی۔اردو زبان وتہذیب سے پیدا شدہ کم شخصیات ایسی ہیں جنھیں ادب وسماج سے آگے دانشورانہ طبقے میں بھی اس قدر شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی جو خواجہ احمد عباس کے حصے میں آئی۔

خواجہ احمد عباس 7 جون 1914 کو ہریانہ کے پانی پت شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا خواجہ غلام عباس 1857 کی جنگِ آزادی کے شہید اور مضبوط سپاہی تھے نیز پانی پت کے پہلے شہید آزادی بھی تھے جبکہ والد خواجہ غلام السبطین علی گڑھ کے تعلیم یافتہ گریجویٹ تھے۔ ساتھ ہی والدہ مسرور خاتون الطاف حسین حالی کی پوتی اور ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اِس علمی و مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے کے سبب خواجہ احمد عباس کی تعلیم وتربیت پر بھی خاص دھیان دیا گیا اردو، ہندی، انگریزی کے ساتھ ساتھ قرآن اور مذہبی تعلیم حاصل کرنا بھی لازمی قرار دیا گیا۔ پانی پت کے مسلم ہائی اسکول سے پندرہ سال کی عمر میں خواجہ احمد عباس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1933 میں بی اے اور 1935 میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی اُن کی دوستی آل احمد سرور، اسرار الحق مجاز، حیات اللہ انصاری اور جاں نثار اختر جیسی شخصیات سے ہو چکی تھی۔

خواجہ احمد عباس نے علی گڑھ میں اپنے طالبِ علمی کے زمانے سے صحافت میں دلچسپی لینا شروع کی دہلی سے نکلنے

خواجہ احمد عباس کے فلم سنسار پر ایک نظر

نمبر	فلم کا نام	فلم میں کارکردگی	سنہ
(1)	نیا سنسار	منظرنامہ، کہانی	1941
(2)	نیچا نگر	منظرنامہ	1946
(3)	دھرتی کے لال	منظرنامہ، ہدایت کار، فلمساز	1946
(4)	ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی	منظرنامہ، کہانی	1946
(5)	آج اور کل	ہدایت کار	1947
(6)	آوارہ	منظرنامہ، مکالمہ	1951
(7)	انہونی	منظرنامہ، مکالمہ، کہانی، ہدایت کار، فلمساز	1952
(8)	راہی	ہدایت کار	1953
(9)	نغمہ	ہدایت کار	1953
(10)	منا	منظرنامہ، ہدایت کار، فلمساز	1954
(11)	دروازہ	ہدایت کار	1954
(12)	بارہ دری	کہانی	1955
(13)	جواب	ہدایت کار	1955
(14)	سب سے بڑا روپیا	ہدایت کار	1955
(15)	شہزادہ	منظرنامہ	1955
(16)	شری 420	منظرنامہ، مکالمہ، کہانی	1955
(17)	جاگتے رہو	منظرنامہ	1956
(18)	جلاد	منظرنامہ	1956
(19)	بڑا بھائی	منظرنامہ، مکالمہ، کہانی	1957
(20)	پردیسی	منظرنامہ، ہدایت کار	1957
(21)	محفل	ہدایت کار	1957
(22)	سٹّا بازار	منظرنامہ، مکالمہ، کہانی	1959

والے اخبار National Cell اور پھر علی گڑھ کے Aligarh Opinion میں کالم لکھنا شروع کیا۔ گویا اس طرح صحافت کے میدان میں اُن کا داخلہ ہوا اور قبلِ آزادی کے وہ مسلم یونیورسٹی کے پہلے ایسے طالبِ علم بن گئے جنھیں ان اخبارات میں خدمات انجام دینے کا اعزاز حاصل ہوا۔ علی گڑھ سے اپنی تعلیم کی تکمیل کے ساتھ ہی یعنی 1935 میں خواجہ احمد عباس نے مشہور انگریزی اخبار Bombay Chronical میں کالم نگاری کا آغاز کیا، 'آخری صفحہ' کے نام سے یہ کالم بہت مشہور رہا، یہاں ان کا خاص موضوع فلموں پر تنقیدی مضامین قلمبند کرنا تھا۔ آگے چل کر وہ اخبار کے فلم سیکشن کے ایڈیٹر بھی بنائے گئے۔ اِس کالم نگاری کے سبب فلمی حلقے میں اُن کی

> **خواجہ احمد عباس نے اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ہدایت کاری وفلمسازی کے میدان میں بھی قدم رکھا اور ملک کے عظیم سانحہ قحطِ بنگال کے موضوع پر مبنی فلم اِپٹا کے بینر تلے 'دھرتی کے لال' اپنی ہدایت میں بنائی۔ 1951 میں انھوں نے 'نیا سنسار' کے نام سے اپنی فلم کمپنی کی بنیاد رکھی اِس کے تحت ہندوستانی سماج کی بھرپور اور عمدہ طریقے سے عکاسی اپنی فلموں میں کی، ایسی فلموں میں 'انھونی'، 'منا'، اور 'راہی' خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔**

شہرت پھیل گئی نیز بڑی بڑی فلم کمپنیوں تک خواجہ احمد عباس کی ایک خاص پہچان بن گئی۔ اسی اثنا یعنی 1936 میں بامبے ٹاکیز کے اہلکاروں نے اُنھیں اپنی فلم کمپنی کے اشتہاری شعبے کے لیے جُزوقتی کام کی خدمات پر رکھا اِس طرح خواجہ احمد عباس کا فلموں میں داخلہ مزید بڑھتا گیا۔

فلم کی مشہور شخصیات دیویکا رانی اور ہمانشو رائے نے خواجہ احمد عباس کو اپنی فلم 'نیا سنسار' کا منظر نامہ لکھنے کی تجویز پیش کی جو 1941 میں ریلیز ہوئی۔ بحیثیت مصنف فلموں میں خواجہ احمد عباس کا یہ گویا پہلا قدم تھا۔ فلم نگاری کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی وہ منسلک رہے اور 'بلٹز اردو' کے ایڈیٹر بھی ہوگئے۔ خواجہ احمد عباس کے کالم نہ صرف فلمی تنقید بلکہ ہندوستانی سیاست کی عمدہ تاریخ بھی سمجھے جاتے تھے جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

اب انھیں فلم صنعت کے بڑے بڑے ہدایت کار اور فلم ساز مثلاً چیتن آنند، وی شانتا رام اور راجکپور وغیرہ قریب سے جاننے پہچاننے لگے تھے لہٰذا چیتن آنند نے پہلے 'نیچا نگر' اور پھر وی شانتا رام نے 'ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی' جیسی فلمیں لکھوائی۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ہدایت کاری وفلمسازی کے میدان میں بھی قدم رکھا اور ملک کے عظیم سانحہ قحطِ بنگال کے موضوع پر مبنی فلم اِپٹا کے بینر تلے 'دھرتی کے لال' اپنی ہدایت میں بنائی۔ 1951 میں انھوں نے 'نیا سنسار' کے نام سے اپنی فلم کمپنی کی بنیاد رکھی اِس کے تحت ہندوستانی سماج کی بھرپور اور عمدہ طریقے سے عکاسی اپنی فلموں میں کی، ایسی فلموں میں 'انھونی'، 'منا'، اور 'راہی' خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔ اکثر و بیشتر خواجہ احمد عباس کے لکھے ہوئے منظرناموں، کہانیوں کو موضوع اور اس میں موجود فکروفن کے پیش نظر انھیں فلم اور ملک کے اہم ترین اعزازات سے نوازا جاتا رہا۔ 1964 میں بنی فلم 'شہر اور سپنا' اور 'سات ہندستانی (1969)' کو قومی یکجہتی پر مبنی بہترین فلم کا 'نرگس دت ایوارڈ' دیا گیا۔ واضح ہو کہ 'سات ہندستانی' سے اینگری ینگ مین امیتابھ بچن کو بھی خواجہ

(23)	ہتھکڑی	ہدایت کار	1957
(24)	زندگی یا طوفان	کہانی	1957
(25)	چار دل چار راہیں	منظر نامہ، مکالمہ، ہدایت کار	1959
(26)	زرا بچ کے	ہدایت کار	1959
(27)	عید مبارک	ہدایت کار (مختصر دستاویزی)	1960
(28)	قاتل	ہدایت کار	1960
(29)	گرِ گیم سینچوری	ہدایت کار (مختصر دستاویزی)	1961
(30)	فلائٹ تو آسام	ہدایت کار	1961
(31)	پیار کی داستان	ہدایت کار	1961
(32)	گیارہ ہزار لڑکیاں	ہدایت کار	1962
(33)	روپ لیکھا	ہدایت کار	1962
(34)	مایا محل	ہدایت کار	1963
(35)	تین گھرانے	ہدایت کار	1963
(36)	شہر اور سپنا	ہدایت کار، منظر نامہ	1964
(37)	ہمارا گھر	ہدایت کار	1964
(38)	Tomorrow Shall Be Better	ہدایت کار	1965
(39)	آسمان محل	ہدایت کار	1966
(40)	بمبئی رات کی باہوں میں	منظر نامہ، مکالمہ، کہانی، ہدایت کار، فلمساز	1967
(41)	دھرتی کی پکار	ہدایت کار (مختصر دستاویزی)	1967
(42)	چار شہر ایک کہانی	ہدایت کار (دستاویزی فلم)	1968
(43)	سپنوں کا سوداگر	منظر نامہ، مکالمہ	1968
(44)	سات ہندوستانی	ہدایت کار، فلمساز	1970
(45)	میرا نام جوکر	منظر نامہ، کہانی	1970
(46)	دو بوند پانی	ہدایت کار	1972
(47)	بھارت درشن	ہدایت کار (دستاویزی)	1972
(48)	جوہو	ہدایت کار (ٹیلی فلم)	1973
(49)	بابی	منظر نامہ، کہانی	1973
(50)	کل کی بات	ہدایت کار (مختصر فلم)	1973
(51)	اچانک	منظر نامہ	1973
(52)	فاصلہ	ہدایت کار، فلمساز	1974
(53)	پاپا میاں اور علی گڑھ	ہدایت کار (مختصر دستاویزی)	1975
(54)	پھر بولو آئے سنت کبیر	ہدایت کار (مختصر دستاویزی)	1976
(55)	ڈاکٹر اقبال	ہدایت کار (مختصر دستاویزی)	1978
(56)	دی نیکسلائٹ	منظر نامہ، ہدایت کار	1980
(57)	ہندوستان ہمارا	ہدایت کار (مختصر دستاویزی)	1983
(58)	لو ان گوا	منظر نامہ	1983
(59)	ننگا فقیر	ہدایت کار (ٹیلی فلم)	1984
(60)	ایک آدمی	ہدایت کار	1988
(61)	آکانکشا	مکالمہ، منظر نامہ (ٹیلی فلم)	1989
(62)	حنا	کہانی	1991

احمد عباس نے بریک دیا نیز یہیں سے ملّینیم اسٹار نے اپنے کریئر کا آغاز کیا۔ فلم نگاری میں خواجہ احمد عباس کا قلم انتہائی زرخیز تھا تقریباً پانچ دہائیوں تک وہ ادب کے ساتھ ساتھ فلم پر بھی چھائے رہے۔

خواجہ احمد عباس کی ادب، فکشن، فلم اور صحافت جیسے موضوعات پر اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں ستر سے زائد تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔ ترقی پسند تحریک اور مختصر افسانہ نگاری کے بنیادگزاروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ موصوف کا لکھا ہوا ناول 'انقلاب' بہت مشہور ہوا۔ خواجہ احمد عباس نے روسی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، انگریزی اور عربی کی اہم تخلیقات جو عالمی ادب کے شاہکار کا درجہ رکھتی تھیں اُن کا ترجمہ بھی کیا۔

خواجہ احمد عباس کے فلم کریئر پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک انتہائی حساس، باشعور، ذمے دار اور دانشورانہ ذہن کے مالک تھے کہ انھوں نے ادب عالیہ کی اہم ترین کہانیوں کو بھی فلم کا جامہ پہنایا اور ہندوستانی ادب کی معروف ترین کہانی، ڈرامہ، ناول، افسانہ اور دستاویزات سے انتخاب کرکے اُن پر اپنی فلموں کی بنیاد رکھی۔ اسٹیج اور ڈرامے سے آپ کو گہرا لگاؤ تھا اسی لیے IPTA کے لیے بھی بہت کام کیا اور اس اہم ادارے نے ہمیشہ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

خواجہ احمد عباس نے ملک، حالات اور دنیا کے اچھوتے اور چبھتے ہوئے موضوعات و حادثات پر ہمیشہ نگاہ رکھی۔ غریبی، مفلسی، عام آدمی کے مسائل، دہشت گردی، استحصال، قدرتی آفات اور سماجی تضادات و نابرابری نیز غیرافادی پالیسیوں پر ان کی فلموں کی بنیاد رہا کرتی تھی۔ وہ کبھی بھی گلیمر زدہ فلم صنعت کے فریب میں نہ آئے اور ایسے حساس موضوعات پر اپنی کہانی اور اسکرپٹ کی بنیاد رکھی جس پر بڑے بڑے ہدایت کاروں اور فلمسازوں کو رشک آتا تھا۔ آرٹ فلموں کے بھی وہ دلدادہ تھے کہ اُن کی فلمیں اور ڈاکیومینٹریز حقیقی آرٹ کا نادر نمونہ ہیں۔ اسی لیے یہ فلمیں نہ صرف ملک بلکہ عالمی ادب، آرٹ، فلم اور ڈرامے کا حصہ ہیں اور بین الاقوامی فلمی میلوں میں انھیں اکثر سرفہرست رکھا گیا، فلموں کی فہرست دیکھ کر ہی اِن باتوں کا اعتراف کیا جاسکتا ہے۔

اسی لیے خواجہ احمد عباس ملک میں جس قدر مشہور ومعروف ہوئے اس سے کہیں زیادہ انھوں نے دنیا بھر میں شہرت حاصل کی۔ ملک وبیرون ملنے والے اعزازات سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کی فہرست ملاحظہ کیجیے۔

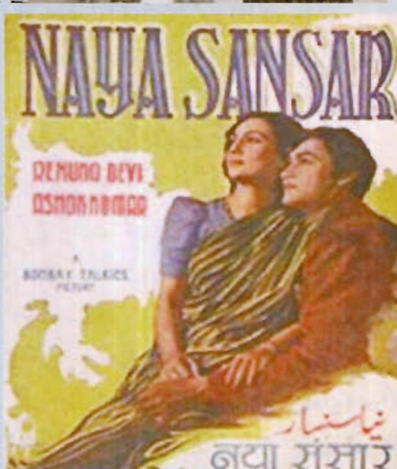

خواجہ احمد عباس کو ملنے والے فلمی، ادبی، قومی اور بین الاقوامی اعزازات ایک نظر میں:

1. 'نیا سنسار' پر بہترین منظرنگاری کے لیے Award 1942 Best Screenplay۔
2. 'نیچا نگر' کا منظرنامہ لکھنے کے لیے کینز فلم فیسٹیول کا Golden Palm اعزاز 1946۔
3. 'پردیسی' کے لیے کینز فلم فیسٹیول کا Golden Palm اعزاز 1957۔
4. 'عید مبارک' پر بچوں کے لیے بنی دوسری بہترین فلم کا کل ہند سرٹیفکٹ 1960۔
5. 'شہر اور سپنا' پر Best Feature Film کا قومی اعزاز 1964۔
6. 'فقیرا' پر مہاراشٹر اسٹیٹ ایوارڈ 1964۔
7. 'ہمارا گھر' پر بین الاقوامی فلم فیسٹیول (Santa Barbara, USA) ایوارڈ 1965۔
8. سولہویں برلن انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کے لیے جیوری ممبر نامزد 1966
9. حکومتِ ہند کی جانب سے مجموعی خدمات کے لیے

پدم شری 1969

10. ادبی خدمات کے لیے صوبۂ ہریانہ کا Robe of Honour 1969۔
11. 'سات ہندوستانی' کے لیے بہترین قومی یکجہتی فلم کا نرگس دت ایوارڈ 1970۔
12. 'دو بوند پانی' کے لیے بہترین قومی یکجہتی فلم کا نرگس دت ایوارڈ 1972۔
13. 'دی نیکسلائٹس' 'The Naxalites' کی ہدایت کاری کے لیے 1980 Gold Award۔
14. اردو ادب وفکشن میں حصہ داری کے لیے غالب ایوارڈ 1983۔
15. سوویت یونین کا Vorosky Literary Award 1984۔
16. دہلی اردو اکادمی کا اسپیشل ایوارڈ 1984۔
17. مہاراشٹر اردو اکادمی ایوارڈ 1985۔
18. ہند: سوویت دوستانہ تعلقات استوار کرنے کے لیے سوویت ایوارڈ 1985۔

مختصر یہ کہ خواجہ احمد عباس ہندوستانی فلم کی اس روایت کے امین ہیں جس میں سہراب مودی، محبوب خان، بمل رائے، چیتن آنند اور شیام بینگل وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے مگر یہاں بھی خواجہ احمد عباس کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ ادبی میدان میں اُن کا قد متذکرہ بالا تمام لوگوں سے بلند تر ہے اپنی پوری زندگی مصروفیتوں میں گزارنے والا یہ شخص بالآخر یکم جون 1987 کو بمبئی میں ابدی نیند سوگیا۔

(وکی پیڈیا سے ماخوذ)

■

Asrarullah Ansari, 294, Maulwi Faizullah Marg, Harirpura Burhanpur - 450331 (MP)

نصرت ظہیر

ساحر لدھیانوی، راج کپور اور امیتابھ بچن

خواجہ احمد عباس کے تین عظیم تحفے

خواجہ احمد عباس کے ہندوستانی فلمی صنعت پر تین بڑے احسان ہیں۔ایک کا نام ہے ساحر لدھیانوی۔ دوسرے کو دنیا راج کپور کے نام سے جانتی ہے۔اور تیسرا ہے دنیا بھر میں جانا پہچانا ہمارا آپ کا ملینیم اسٹار، امیتابھ بچن!

ہندوستانی سنیما کے سب سے مقبول شاعر ساحر لدھیانوی کا معاملہ یہ ہے کہ جب وہ بمبئی کی فلمی دنیا میں قسمت آزمانے آئے تھے تو ان کا پہلا شعری مجموعہ 'تلخیاں' پورے ہندوستان میں دھوم مچا چکا تھا مگر فلم والوں نے ان کی ٹھیک سے قدر نہیں کی۔اُن دنوں ساحر کی والدہ لاہور میں تھیں اور وہ خود بمبئی میں فلموں میں قسمت آزما رہے تھے۔تقسیم وطن کے وقت اطلاع ملی کہ ان کی والدہ لاپتہ ہیں تو ان سے رہا نہ گیا۔ماں سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ چنانچہ ساحر بمبئی اور ہندوستان دونوں کو چھوڑ کر والدہ کی تلاش میں پاکستان چل دیے۔وہاں پتہ چلا کہ والدہ ان کے دوست شورش کاشمیری کے یہاں محفوظ تھیں۔ساحر نے دوسرے کئی اردو ادیبوں کی طرح پاکستان میں ہی بس جانے کا فیصلہ کرلیا۔خواجہ احمد عباس نے جب یہ سنا تو انھیں بڑا افسوس ہوا۔انھوں نے ساحر کے نام ایک کھلا خط لکھا اور اسے اخبار میں اپنے مشہور کالم میں چھاپ دیا۔اس خط میں خواجہ نے سیکولرزم اور ترقی پسند نظریات کا واسطہ اور حوالے دے کر ان ادیبوں کو واپس آنے کے لیے للکارا تھا جو ہندوستان میں اردو ادب کا کوئی مستقبل نہ ہونے کے اندیشے سے پاکستان میں رہ گئے تھے یا ہندوستان سے وہاں جا بسے تھے۔اس خط کا اوروں پر تو نہیں مگر ساحر لدھیانوی پر بڑا گہرا اثر ہوا اور وہ والدہ کو ساتھ لے کر بمبئی واپس آ گئے۔اس واپسی کے بعد ساحر کو فلموں میں کام ملنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے لکھے ہوئے گیتوں نے فلمی نغموں کا مزاج بدل ڈالا۔حقیقت یہ ہے کہ خواجہ احمد عباس نے جو کہ ایک کمیٹڈ ترقی پسند تھے یہ خط نہ لکھا ہوتا تو ہندوستان ساحر سے محروم ہو جاتا، جس کا پاکستان کے کئی ادیب آج بھی ملال کرتے ہیں۔

راج کپور کے ساتھ یہ ہوا کہ فلم آگ اور فلم برسات بنا کر وہ ایک کامیاب فلم میکر تو ضرور بن گئے تھے لیکن نہ تو وہ خود بطور اداکار ایک بڑی شخصیت بن پائے تھے اور نہ ہی ان کی فلمی ہدایت کاری اپنی کوئی شناخت یا الگ مزاج بنا سکی تھی۔تبھی وہ خواجہ کی صحبت میں آئے۔ 1951 میں خواجہ نے راج کپور کی فلم 'آوارہ' کے لیے اسکرین پلے اور مکالمے تحریر کیے تو فلم نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا۔عہد ساز کامیڈین چارلی چپلن کے ہندوستانی روپ کو ہندوستانی فلم کے پردے پر دیکھ کر لوگ خوشی سے ناچ اٹھے۔آوارہ بلاک بسٹر فلم ثابت ہوئی۔خواجہ نے اس کے ہیرو کو ابھرتے ہوئے ہندوستان کے نوجوان کے جذبات سے ہم آہنگ کر دیا تھا اور اس کی محرومیوں کی بھرپور عکاسی کی تھی۔ 1955 میں 'شری چار سو بیس' کے لیے لکھی ہوئی کہانی، اسکرین پلے اور مکالموں نے ، راج کپور کی شبیہہ اور ان کی فلم سازی کے مزاج کو مزید نکھارا اور فلم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔خود راج کپور پر 'آوارہ' اور 'شری چار سو بیس' کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ زندگی بھر اداکاری کی اسی امیج کے ساتھ جیے جو ان فلموں نے تخلیق کردی تھی اور مختلف سماجی سروکار اُن کے کردار کے ساتھ اُن فلموں میں بھی جڑتے رہے جو دوسرے پروڈیوسروں اور ہدایت کاروں نے انھیں بطور ہیرو لے کر بنائی تھیں۔چھلیا، دولہا دلہن، دل ہی تو ہے ایسی ہی فلمیں تھیں۔خواجہ صاحب نے 1956 میں ہندوستان کی پہلی بھرپور طنزیہ مزاحیہ فلم 'جاگتے رہو' کے لیے بھی مکالمے لکھے، اور راج کپور کی اداکاری کا ایک نیا رخ فلم بینوں کے سامنے آیا۔اس کے بعد خواجہ خود اپنی فلموں میں زیادہ مصروف ہو گئے اور راج کپور کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکے لیکن 1970 میں جب راج کپور نے وہ فلم بنائی، جسے ان کا میگنم اوپس Magnum Opus کہا جا سکتا ہے، تو اس کی کہانی اور مکالمے خواجہ نے ہی لکھے۔یہ فلم تھی 'میرا نام جوکر' جو باکس آفس پر تو فلاپ رہی مگر اسے ہندوستانی فلموں میں کلاسک کا درجہ حاصل ہوا اور آج اسے راج کپور کی سب سے اچھی فلم مانا جاتا ہے۔اس فلم سے ہونے والا خسارہ خواجہ نے اگلی فلم 'بابی' لکھ کر پورا کرا دیا جو سپر ڈپر ہٹ فلم ثابت ہوئی۔خواجہ نے راج کپور لیے جو آخری فلم لکھی وہ تھی 'حنا' جسے راج کپور کے بیٹے نے پورا کیا اور 1991 میں جب وہ ریلیز ہوئی تو نہ راج کپور اس دنیا میں تھے نہ خواجہ احمد عباس۔

ہندی کے مشہور شاعر ہری ونش رائے کے فرزند امیتابھ بچن جب فلمی دنیا میں قدم جمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے تو خواجہ احمد عباس ان دنوں فلم 'سات ہندوستانی' بنانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ یہ فلم 'گووا' کو پرتگالی سامراج کی غلامی سے نجات دلانے کے مشن پر گوواجانے والے سات ہندوستانی نوجوانوں کی کہانی پر مبنی تھی جن میں کئی مذہبوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی شامل تھے۔ ایک اہم کردار انھوں نے امیتابھ بچن کو دیا۔ فلم باکس آفس پر تو ناکام رہی مگر سنجیدہ لوگوں نے اسے بہت سراہا اور فلم کو قومی ایوارڈ بھی ملے۔ امیتابھ کا کردار خاص طور پر پسند کیا گیا۔ بعد میں سنیل دت نے اپنی فلم ریشما اور شیرا میں امیتابھ کو اور گونگے کا مختصر سا رول دیا جس میں امیتابھ کی اداکاری نے لوگوں کے دلوں کو چھولیا۔ لیکن اصلی بریک انھیں رشی کیش مکرجی کی فلم آنند سے ملا جس میں مرکزی کردار آنند (راجیش کھنہ) کے بعد کسی کردار نے فلم بینوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا تو وہ ڈاکٹر بھاسکر کا کردار تھا جسے امیتابھ بچن نے بڑی محنت سے نبھایا۔ اس میں امیتابھ بچن کے اندر چھپے ہوئے 'غصیل نوجوان' (اینگری ینگ مین) کی ہلکی سی جھلک سامنے آئی جو رشی دا کی اگلی فلم نمک حرام میں کچھ اور نمایاں ہوئی۔ فلم ساز اوم پرکاش مہرہ نے اپنی فلم 'زنجیر' میں اسی 'اینگری ینگ مین' زیادہ بڑے اسکیل پر، نہایت چابک دستی کے ساتھ پیش کیا اور امیتابھ کو تیسرا بڑا بریک زنجیر سے ملا جس نے انھیں ہندوستانی فلم انڈسٹری میں ہمیشہ کے لیے اسٹیبلش کر دیا۔ لیکن ظاہر ہے خواجہ احمد عباس نے امیتابھ کی اداکارانہ صلاحیتوں کو شروع میں ہی پہچان کر انھیں پہلا بریک نہ دیا ہوتا تو امیتابھ کو ابھی نہ جانے اور کتنا سنگھرش کرنا پڑتا۔ خود امیتابھ بھی خواجہ صاحب کے اس احسان کو مانتے ہیں اور آج بھی انھیں بے حد احترام سے نہ صرف یاد کرتے ہیں بلکہ خواجہ احمد عباس صدی تقریبات سے بھی کسی نہ کسی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔

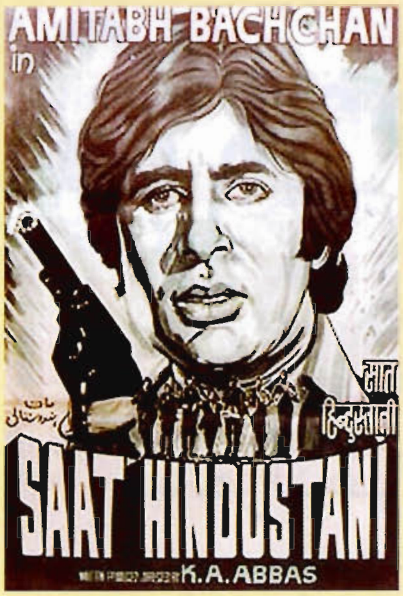

آخر میں خواجہ کے کردار کی اس عظمت کا ذکر بھی ضروری ہے کہ وہ کامیاب کمرشل فلمیں لکھنے پر پوری طرح قادر تھے مگر انھوں نے نہ اس مہارت کو اپنا پیشہ بنایا، نہ اپنی فلموں میں کمرشل شعبدے بازیاں کیں۔ ان کی فلمیں باکس آفس پر مسلسل ناکام ہوتی رہیں تب بھی نہیں! فلمی دنیا یا صحافت میں سرگرم رہ کر ان کا مقصد پیسہ کمانا ہرگز نہیں تھا۔ مارکسزم اور سوشلزم پر ان کا گہرا یقین تھا۔ دنیا کو ایک بہتر، خوش حال اور پر امن دنیا بنانے کا خواب نہ صرف وہ خود دیکھتے تھے بلکہ سبھی کی آنکھوں میں اس خواب کو بسا دینا چاہتے تھے۔ اور اسی خواہش کو عملی شکل دینے کے لیے وہ اپنی فلمی، ادبی اور صحافتی صلاحیتوں کا استعمال کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی اسمِ اعظم تھا۔ کام، کام اور صرف کام! یہی ان کا جنون تھا یہی پیشن Passion۔ زندگی کا ایک لمحہ بھی وہ بے مصرف نہیں جانے دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ٹرین میں سفر کرتے وقت بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ ساتھ بیٹھے مسافروں کا شور بھی انھیں ڈسٹرب نہیں کر پاتا تھا۔ لوگ باتیں کرتے رہتے تھے اور خواجہ اس دوران کوئی افسانہ یا فلم کا کوئی منظر لکھ ڈالتے تھے۔ دولت اور شہرت سے اس قدر بے پرواہ رہنے والے باعمل کردار اب اپنے آپ میں خود ایک افسانہ اور ایک خواب بن کر رہ گئے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ خواجہ احمد عباس نام کا ایک شخص کچھ عرصہ پہلے ہمارے بیچ موجود تھا!

■

Nusrat Zaheer, Farogh e Urdu Bhavan Jasola Institiuonal Area New Delhi - 110025

خواجہ احمد عباس
ایک باکردار صحافی

ارتضیٰ کریم

خواجہ احمد عباس جو ایک متوسط طبقے کے ہر نو جوان کی طرح پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے تھے اور خود ان کے والدین کی بھی یہی خواہش اور کوشش تھی — لیکن علی گڑھ میں ان کے چچازاد بھائی خواجہ غلام السیدین کی ایک تقریر نے ان کے نہ صرف زاویہ نظر کو بدل دیا بلکہ زندگی کا رخ بھی موڑ دیا۔ انھوں نے اسی پل یہ فیصلہ لے لیا کہ انھیں اپنے بھائی جان کی طرح صحافی ہی بننا ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ہی الفاظ ہیں:

''1925 کا ذکر ہے... کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خاں، سر محمد اقبال، سر علی امام، ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ ''ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے، اپنی سیاسی تنظیم علاحدہ نہیں کرنی چاہیے۔'' یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی... اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا.. اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا... اب صحافی اور مقرر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔''

(غبارِ کارواں، آجکل جولائی 1971)

یہ ایک طویل مضمون کا حصہ ہے جسے میں نے جابجا سے حذف کرکے آپ کے سامنے اس لیے رکھا ہے کہ میری بات کو تقویت ملے۔ کوئی چاہے تو تفصیل کے لیے ان کی انگریزی میں موجود سوانح "I am not an Island" سے بھی رجوع کرسکتا ہے—

یہی وجہ ہے کہ خواجہ احمد عباس نے زمانہ طالب علمی میں ہی علی گڑھ سے ہی ایک اخبار Aligarh Opinion کے نام سے جاری کیا، جسے آج بھی کسی یونی ورسٹی کے طالب علموں کا پہلا ہفتہ وار اخبار کہا جاسکتا ہے۔ Aligarh Opinion نکالنے کے پاداش میں اس زمانے کے نائب شیخ الجامعہ نے انھیں یونی ورسٹی سے اخراج کی دھمکی بھی دی تھی— مگر بقول اقبال:

میں کہاں رکتا ہوں عرش وفرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے، بہت اونچا، حد پرواز سے

کے مصداق دوران تعلیم ہی انھوں نے 'ہندوستان ٹائمز' اور 'بمبئی کرانیکل' کے لیے نامہ نگار کی خدمات انجام دیں۔ بی اے کے فوراً بعد دہلی کے ایک اخبار 'National Call' کے دفتر میں تین مہینے بحیثیت کارآموز (apprentice) کام کیا۔ خواجہ احمد عباس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

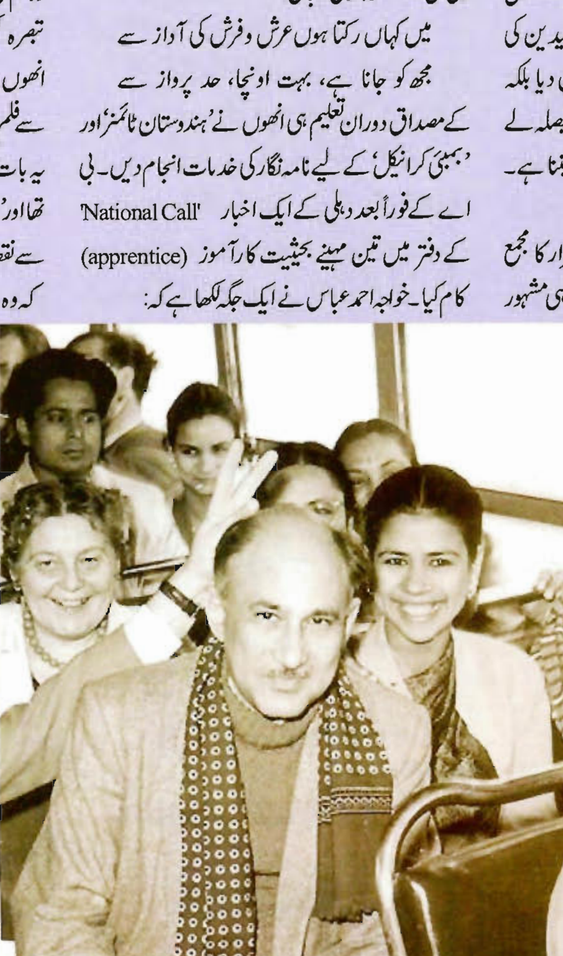

Let me record here that three months period in the 'National Call' really made me into a journalist

(I am not an Island: P 72)

خواجہ احمد عباس بنیادی طور پر ایک صحافی تھے مگر ایک ایسے صحافی جو باکردار تھے، جو کسی کے استحصال یا کسی کو استعمال کرنے کے پیش نظر قلم نہیں اٹھاتے تھے بلکہ حق اور سچائی کی آواز بلند کرنے کے لیے، نہایت بے باک انداز میں اپنی بات کہتے تھے۔ صحافت کے راستے سے ہی وہ فلم کی دنیا میں داخل ہوئے تھے، یعنی پہلے پہل وہ فلم پر تبصرہ لکھتے تھے اور اپنی بے باک رائے کی بنیاد پر ہی انھوں نے 'فلم مبصر' کا ایک معتبر مقام حاصل کرلیا تھا۔ قلم سے فلم— تک کا ان کا سفر نہایت دلچسپ رہا ہے۔ وہ خود یہ بات کہتے تھے کہ میں نے اپنا سفر دو نقطے سے شروع کیا تھا اور 'ایک نقطہ' پر مکمل کیا۔ اگرچہ اس میں ان کو مالی اعتبار سے نقصان ہی اٹھانا پڑا، لیکن ان کی تشفی اس امر میں تھی کہ وہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوسکے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ صحافت اور فلم میں کچھ وصف قدرے مشترک کی حیثیت رکھتا ہے یعنی دونوں کا سروکار ہمارا عصری سماج، ہمارا اپنا زمانہ ہوتا ہے، نیز دونوں کی رسائی عام انسان تک ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کی تحریروں کا تعلق اسی لیے عام سماج کے عام آدمی سے ہوتا ہے اور ان کا مقصد حیات بھی یہی تھا کہ ان کی بات ان کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے، اس حوالے سے ان کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی— بلٹز کا آزاد قلم/ رجحان ساز اور عہد ساز کالم کہا جاسکتا ہے— 'بلٹز' سے زیادہ قارئین کو 'آزاد قلم' کا انتظار رہتا تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ کہتی ہے کہ کالم نگاری کے حوالے سے یہ سب سے طویل عرصے تک لکھا جانے والا کالم تھا۔ 'بلٹز' میں انھوں نے کم وبیش 40 برسوں تک 'آزاد قلم' لکھا اور انھوں نے بہ وقت تقرری ہی یہ بات انتظامیہ کے پیش نظر رکھ دی تھی کہ وہ اپنے نظر اور نظریے کے اعتبار سے جو کچھ لکھیں گے، اسے بلٹز من وعن شائع کرے گا، کسی طرح کی کتر بیونت نہیں ہوگی، انھوں نے یہ بھی کہا کہ معاوضہ تو کم ہوسکتا ہے مگر میری یہ شرط باقی رہے گی۔ چنانچہ پوری زندگی وہ ملک میں رہے ہوں یا ملک سے باہر— بلٹز کے 'آزاد قلم' کا لکھنا، کبھی نہیں بھولے۔

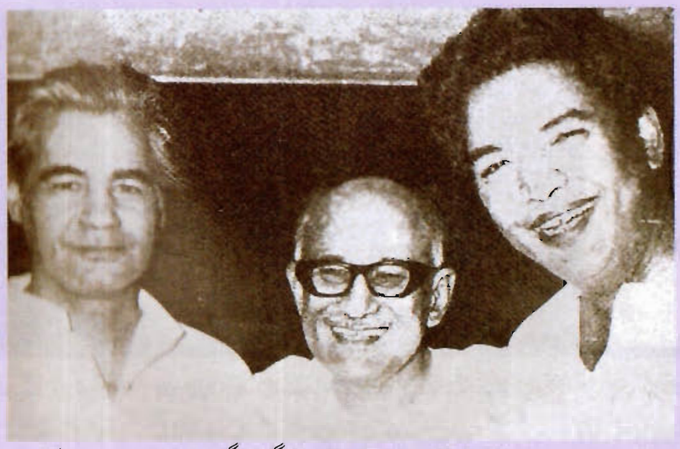

راج نرائن راز جو شاعر بھی تھے اور آجکل کے مدیر بھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''جب ہفتہ وار اردو بلٹز جاری ہوا، تو وہ ہندی اور اردو دونوں کے لیے لکھنے لگے۔ آزاد قلم کا آخری صفحہ بلٹز کے لاسٹ پیج کا ترجمہ نہیں بلکہ جداگانہ کالم ہوا کرتا تھا، ہندی اور اردو میں آزاد قلم کا کالم محض چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ زبان بیشتر سہل ہوا کرتی تھی۔ خواجہ صاحب کے اپنے الفاظ میں: ''گویا کہ یہ کالم ایک ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں جو اتر پردیش، مدھیہ پردیش، اور راجستھان میں پڑھے اور سمجھے جاتے تھے گویا یہ بھارت کی دھرتی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

لاسٹ پیج، صحافت کی تاریخ میں اس اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ 39 برس تک ایک تواتر سے شائع ہوتا رہا۔ یہ دنیائے صحافت کا سب سے زیادہ عرصے تک شائع ہونے والا کالم ہے اور شاید یہی بات آزاد قلم کے آخری صفحے کے بارے میں کہی جاسکتی ہے—'' (خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار، ص 230)

یہاں مجھے صرف ایک اضافہ کرنا ہے کہ شاید نہیں بلکہ یقیناً 'آزاد قلم' اردو صحافت کی تاریخ میں لکھا جانے والا 'طویل العمر' یا طویل مدتی کالم ہے۔

بلٹز کے 'آزاد قلم' کا آج آخر تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو کچھ دلچسپ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ 'آزاد قلم' کا موضوع بالکل آزاد ہوتا تھا— خواجہ احمد عباس نہایت آزادانہ طور پر قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور سماجی، تہذیبی اور ثقافتی ادبی اور لسانی، موضوعات پر بے باکانہ اسلوب میں اظہار خیال کرتے تھے۔ دوسرا اہم 'آزاد قلم' اور اس کے صفحے کا یہ بھی تھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کے کونے پر کبھی کسی فلمی ہیرو یا ہیروئن کی تصویر بھی ہوتی تھی۔ کسی نہ کسی ادیب کی تصویر ہوتی تھی، اور اس تصویر کے ساتھ کوئی شعر یا کوئی اطلاع ہوتی تھی مثال کے طور پر 'قاضی سلیم' کی تصویر کے ساتھ یہ شعر:

ہر قدم پر لٹا کر متاعِ نظر
میں نے گھر گھر سے آنسو اکٹھے کیے

منفرد شاعر قاضی سلیم جو اب ممبر پارلیامنٹ بھی بن گئے، درج ہے۔'' (بلٹز، 12 جنوری 1980)

پرویز شاہدی کی تصویر کے ذیل میں یہ عبارت درج ہے:
''رقص حیات اور تثلیث حیات کے خالق، جن کی شاعری میں مخدوم اور جاں نثار اختر کی طرح تخلیقی صلاحیتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔'' (بلٹز، 10 مئی 1980)

بلٹز کے آزاد قلم کا مطالعہ ہمارے سامنے ہندوستان کے عوامی اور عام مسائل کا پورا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے اس عہد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ملی اور ادبی صورت حال بھی سامنے آتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کے یہاں انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی نیز معلومات عامہ پر ان کی نظر کتنی گہری تھی یہاں بلٹز کے 'آزاد قلم' کے چند عناوین بطور مشتے نمونہ از خروارے درج کرتا ہوں کہ لفافے سے بھی مضمون تک پہنچا جاسکتا ہے:

''کیا کوئی کلچر اور زبان مرسکتی ہے؟''

(بلٹز 10 مئی 1980)

''یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ: گاندھی جی کے ساتھی مظہر الحق'' (بلٹز 24 مئی 1980)

''حیدر آباد کا 'شہر اور سپنا' کب بسایا جائے گا؟
کہاں بسایا جائے گا؟

''کیا اسمبلیوں کے چناؤ دوبارہ ہوں گے''

(بلٹز، 31 مئی 1980)

''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

(بلٹز، 27 مارچ 1965)

''روٹی نہیں ہے تو کیک کھاؤ!''

(بلٹز، 17 فروری 1965)

سامراج، سوراج، کامراج، رام راج؟ (بلٹز، 21 فروری 1963)

''رہتا ہے دل وطن میں!'' (بلٹز، 8 فروری 1964)

جھوٹا سچ یا سچا جھوٹ (بلٹز، 11 مارچ 1964)

''نئی سیتا، نئی زلیخا، نئی مریم'' (بلٹز، 14 مارچ 1964)

ایسے ہزاروں مضمون کے عنوان یہاں نقل کیے جاسکتے ہیں۔ مگر اس مضمون کے اختتام سے پہلے آخری عنوان سے لکھے جانے والے کالم کی چند سطریں، آپ ملاحظہ فرمائیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کیا 1964 کے ہندوستان اور 2014 کے ہندوستان کی تصویر بدلی ہے؟؟ خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

''آج وہ سب باہر نکل آئی تھیں اور بمبئی کی سڑکوں پر کندھے سے کندھا ملا کر مارچ کر رہی تھیں۔

سیتا، ساوتری، عائشہ، خدیجہ، مَیری
سلمہ، سوہنی، جولیٹ، پدمنی
لیلیٰ، لیلا، لِلّی
موہنی، محمودہ، مارگریٹ

مِلوں میں کام کرنے والی نوگز کی ساڑی پہننے والی مہاراشٹری عورتیں... دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں، اسٹینوگرافر، ٹائپسٹ گرلز، کلرک، پلاسٹک کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں۔

دواؤں کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں، بیٹری بنانے والیاں بسکٹ بنانے والیاں...

ساڑیاں، فراک، شلوار، لمبی چوٹیاں، کٹے ہوئے بال۔ کسی کے ماتھے پر بندی، کسی کے ہونٹوں پر لپ اسٹک، کسی کے ہاتھوں میں کھنکتی ہوئی چوڑیاں، کسی کی انگلی پر شادی یا منگنی کی انگوٹھی، کسی کی گود میں بچہ، مگر ہر ایک کے ہاتھ میں ایک انقلابی سرخ پھریرا— ہر ایک کے دل میں ایک نئی امنگ، ایک نیا جوش، ہر ایک کی زبان پر ہندوستان کی کام کرنے والی نئی عورتوں کے نعرے—

''مہنگائی کا خاتمہ کرو!

کام کرنے والی عورتوں کو برابر کے حقوق دو

چولہا جلانے والی گیس کی قیمت کم کرو، تیل کی کمپنیوں کو عوام کی ملکیت بناؤ، کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بال گھر Creche بناؤ— شادی شدہ کام کرنے والیوں پر سے پابندیاں ہٹاؤ۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کی فکر کیا تھی؟ ان کے تیور کیا تھے؟ ان کی نگاہ کتنی دوررس تھی؟ وہ ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظر نامے پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے؟ دراصل خواجہ احمد عباس اپنے انھیں موضوعات، اسلوب کے اسی بے باکانہ انداز کی بنیاد پر صحافت اور ادب کی تاریخ میں ایک الگ عنوان کے تحت یاد کیے جاتے رہیں گے۔

■

Prof. Irteza Karim
Delhi University, Delhi - 110007

اردو ادب و صحافت کے خواجہ

خورشید حیات

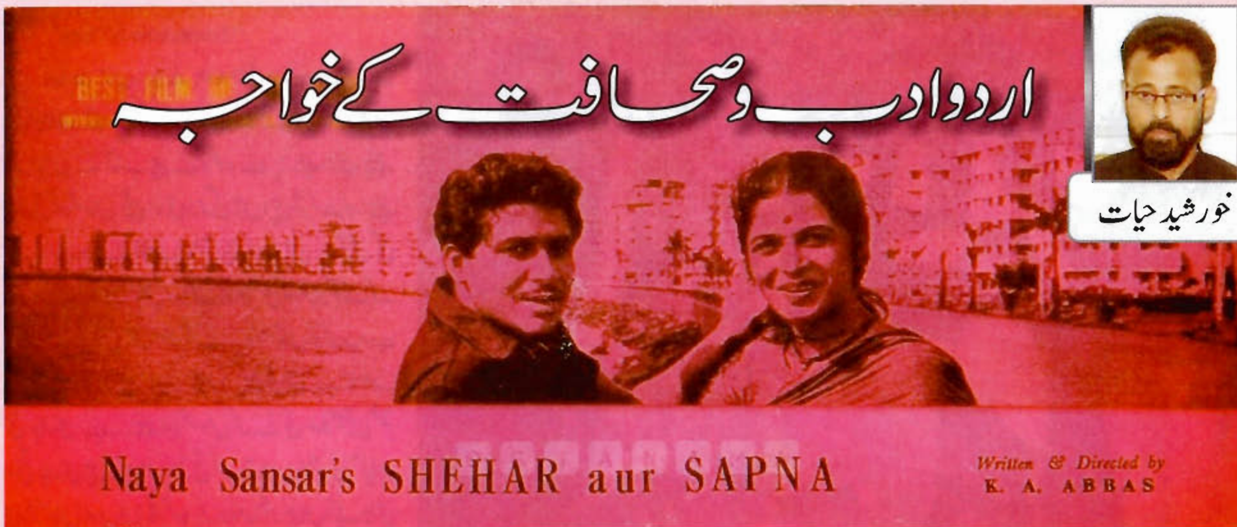

ایک زمانہ تھا جب داستان رنگ کہانی محل سلطانوں کا ہوا کرتا تھا اور اسفہان سے متاثر ہوکر زندگی رنگ شہرآباد کیے جاتے تھے۔ سنہری روایت بدن تہذیب حکومت کیا کرتی تھی اور سطحی تناؤ والے قطرے، فرزند در فرزند دریائے ادب وصحافت کی بالائی سطح پر پھیلتے چلے جاتے تھے۔ ایک زمانہ آج کا ہے سطح تو ہے مگر دھارا نہیں۔

جس شہر کی اپنی تاریخ نہیں ہوتی، اُس شہر کی اپنی کوئی تہذیب بھی نہیں ہوتی۔ پانی پت ایک ایسا شہر ہے، جس کی اپنی سنہری تاریخ بھی ہے اور تہذیب بھی۔ اس شہر کی پہچان حضرت شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر سے لے کر خواجہ الطاف حسین حالی، امداد حسین، میر مہدی مجروح اور غلام السطین کے خواجہ احمد عباس اور ڈھیر سارے کئی چہروں سے ہوتی ہے۔

ابھی میں اتنا ہی لکھ پایا تھا کہ یمنا کی سکڑتی ہوئی چھاتی کو چھوکر گزرتی ہواؤں نے کہا کیا تمھیں یاد ہے—

21 اپریل 1526

05 نومبر 1556

14 جنوری 1761

کیا تمھیں ایسا نہیں لگتا کہ لال مسجد کے گنبدوں سے آتی ہوئی صدائیں اور وہ 'کالا آم' یہ کہہ رہا ہو جیسے، جنگ ہی سے جنگ کا مداوا ہوتا ہے، جنگ ہی سے امن بھی قائم ہوتا ہے اور جنگ ہی سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔

ہاں، شاید کہ یہ سچ ہے۔

نہیں، نہیں، شاید کہ یہ غلط ہے۔

ہم حتمی فیصلہ کیسے سنا سکتے ہیں، فیصلہ تو کسی اور عدالت میں—!

'ابابیل' نے 'ایک لڑکی' کو 'زعفران کے پھول' دیتے ہوئے کچھ ایسا ہی کہا تھا، زمانہ تھا 1937 اور 1948 کا۔ چلیے شیشے کی دیوار سے بہت پیچھے کی طرف چھوٹتی ہوئی زندگی کو دیکھتے ہیں۔ ملتے ہیں پانچ حروف کے خواجہ سے اور مسرور ہوتے ہیں کہانی منظر دیکھ کر کہ کس طرح آٹھ حروف کے احمد عباس نے ابلاغ وصحافت اور ادب فلک کے آٹھویں در کو کھولا۔

ریاضی کا یہ حصہ۔

سات کا یہ کرشمہ۔

گواہ ہے یہ سات سمندر، سات آسمان، سات، زمین اور یہ سات جون 1914۔

خواجہ احمد عباس اردو۔ انگریزی صحافت کے کولمبس تھے۔ جس نے صحافت کی ایک نئی دنیا کو ڈسکور کیا تھا۔ ادب میں تخیل کا بڑا دخل ہوتا ہے جب کہ صحافت میں حاضر دماغی کے عناصر زیادہ فعال ہوتے ہیں۔

صحافت فکر و خیال کی نشر واشاعت، اس کی تشریح نیز گرد و پیش کے حالات سے واقفیت کی فطری خواہش کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ انسان کو ابتدائے آفرینش سے اپنے گرد و پیش کے مسائل سے دلچسپی رہی ہے۔ تلاش و تحقیق اور جستجو کا فطری جذبہ اسے زمانے کی تغیر و تبدل سے آگاہی کے لیے اُکساتا رہا ہے۔ وہ ہر لمحہ باخبر رہنا چاہتا ہے کہ اس کے معاشرہ، اس کے ملک اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر سات سمندر پار، حالات وحوادث کون سی نئی نئی کروٹیں بدل رہے ہیں۔ کون سے تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ انسان (؟) کوئی بھی ہو۔ خواجہ احمد عباس یا پھر کوئی اور نئی زمینوں اور نئے جہاں کی دریافت میں ہمیشہ بیقرار رہا ہے، اور یہ بیقراری کبھی اسے ادب کی طرف لے جاتی ہے، کبھی صحافت اور کبھی کہیں اور اُس چھور تک جو ہمارے ادراک سے پرے ہے۔ سنتے ہیں کسی صحافی کی تحریر کی عمر ایک خاص لمحے تک محدود ہوتی ہے۔ یہ بھی سنائی دیتا رہا ہے کہ صحافت لوگوں کے اذہان کو کبھی کبھی بہت زیادہ مفلوج کر دیتی ہے۔ صحافت کی تھالی میں جو کچھ بھی پروسا جائے وہ اگر سچ نہ ہو تو پھر صحافت اور صحافی کا یہ رویہ پوری نسل کو ایک گہری کھائی کی طرف لے جاتا ہے۔

کسی بھی صحافی کی نثر جب تخلیقی ہوتی ہے اور وہ ناعاقبت اندیشوں، الگ الگ مکھوٹے لگا کر گھومتے رہنماؤں، فٹ پاتھ پر ٹاٹ میں لپٹی زندہ لاشوں اور بھوکے ننگے قبیلوں کی داستان ایک نئی تخلیقی توانائی کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو وہ تتلی، چڑیاں، پریاں اور شہزادے کی طرح آج کی دنیا کی سیر اڑن کھٹولا پر کراتی ہیں۔ اور بیدار ذہن اپنے اندر ہونے والی نئی دستک کو محسوس کرتا ہے۔

اردو صحافت کے اُڑن کھٹولے پر بیٹھے خواجہ احمد عباس آج نئی صدی میں تم کہاں ہو؟

جی کرتا ہے تمھارے لاسٹ پیج اور آزاد کالم پر بکھرے ہوئے چاول کے دانوں جیسی تحریروں کو زمین پر بکھیر دوں تاکہ کالی مٹی پر پھر سے لفظوں کی فصل لہلہانے لگے، اور 'دھرتی کا لال' ہم سب کا 'منا' 'دو بوند پانی' کے لیے کبھی نہ ترسے۔ مجھے یاد آرہا ہے اور مورے خواجہ! تم بھی بہت ترسے ہو آخری لمحوں میں جب تمھیں دل کا دورہ پڑا تھا اور تم نے 'سات ہندوستانی' کی پرنٹ صرف اتنی قیمت میں بیچ دی تھی۔ جتنا تمھیں علاج میں خرچ آرہا تھا۔

لفظ جب بوندیاں بن کر برستے ہیں۔ زمین سے بھیگی ہوئی آوازیں کانوں میں ہولے سے کہتی ہیں:

"I am not Island"

"Tomorrow Is Ours"

سات جون، سات ہندوستانی اور سات حروف کے امیتابھ کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے ابن بطوطہ خواجہ احمد عباس کے کتاب چہرے کو غور سے پڑھیے، الٹیے پلٹیے ہر ورق کو، محسوس کیجیے سماجی زندگی میں اپنی شرکت کو، سنیے فرقہ واریت کے خلاف احتجاج کو، زمین پر کھینچی گئی لکیروں سے اُبھے اُبال کو، اک جوالامکھی کو، غبار گنجلک کو۔ اور حروف چہروں میں ابھر آئے سیاہ دھبّوں کو کہ یہ سب چیخ چیخ کر، کہہ رہے ہیں۔ بھیڑ دیکھنے کی تہذیب کا حصہ بنتی جارہی ہے۔ سننے اور محسوس کرنے کی صلاحیتیں ختم ہوتی جارہی ہیں۔ عباس! ترقی کرتے ہوئے شہر کی 'گیارہ ہزار لڑکیاں' ہوں لایا پھر تمھارا۔ وہ مہانگر جہاں ایک بڑی آبادی کی صبح پیزا اور بریڈ آملیٹ سے ہوتی ہے اور شام کسی بار میں کٹتی ہے۔ اُسی مہانگر میں بھوکی پیڑھی کا 'آشیانہ' کیسا ہوتا ہے، اور اُن کی رات؟ صبح تو اُن کی کالے رنگ کی بڑی بڑی چیونٹیوں سے بنی چٹنی اور سوکھی روٹیوں سے ہوتی ہے۔ جانتے ہو پردیسی! آج بھی تمھارا منگو صاحب کے قد کو ناپ کر سوچتا ہے صاحب کے کپڑے تو، اُس کے بدن پر فٹ آسکتے ہیں۔ 'فٹ' جیسے صاحب کی ٹانگوں سے چپکی پتلون۔

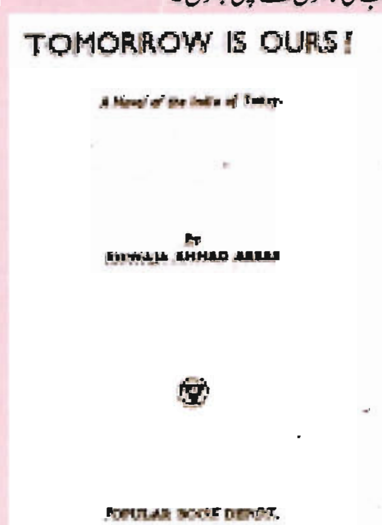

ناآسودگی کی آگ میں آج بھی، پہلے سے بہت زیادہ، ترقی کرتی ہوئی دنیا کا ہر آدمی جل رہا ہے۔ زندگی میں نہ اعتدال ہے اور نہ ہی توازن۔ ایک خوف ہر لمحہ ڈستا رہتا ہے، پیچھا کرتا ہے اور ہم ہیں کہ کسی نئے 'انقلاب' کے انتظار میں ہیں۔ دوسری طرف فکر مغرب انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لے آئی ہے۔ سیاسی الجھنیں ہوں یا پھر سماجی مسائل ترقی پسند تحریک سے جڑا

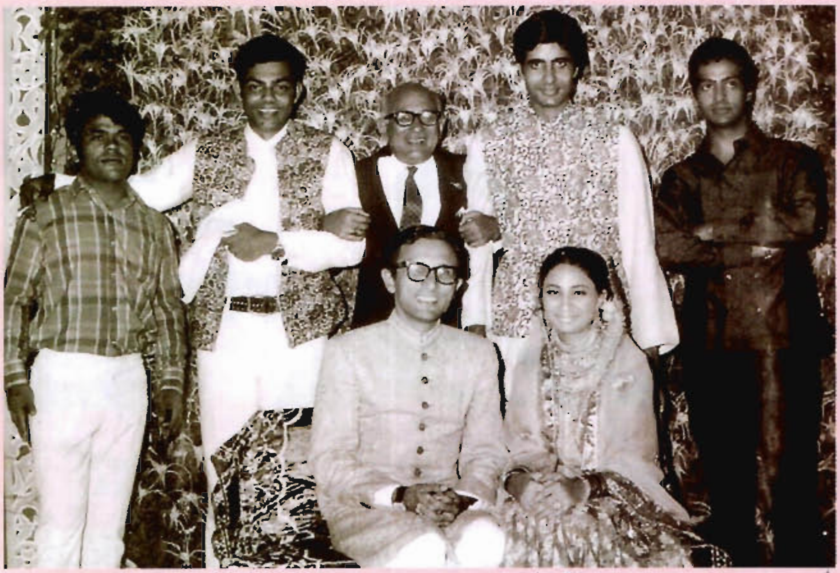

خواجہ احمد عباس اپنے بھتیجے انور کی دعوت ولیمہ میں امیتابھ بچن اور کامیڈین محمود کے بھائی انور علی کے ساتھ

تمھارا قلم کئی جگہ پھسل پھسل سا گیا ہے اور کہانی کا ہر چہرہ حقیقی ہونے کے باوجود غیر فطری نظر آتا ہے۔ صحافت، ادب اور فلم کے اس تریوینی پر جب صحافی حاوی ہوا ہے، قاری کے حرم خانے میں بیٹھے چہروں کے اندر یہ احساس جاگا ہے کہ جیسے کہانی کی تھال میں خواجہ احمد عباس رپورٹ پروس رہے ہیں۔

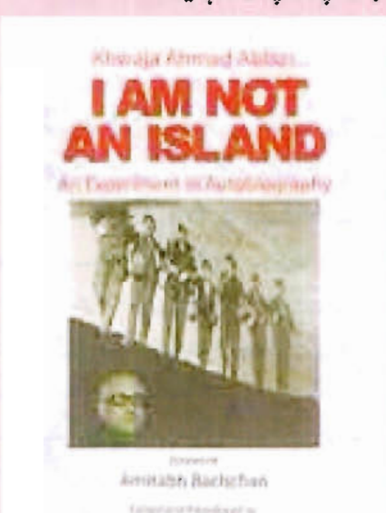

ضوابط حیات کو ترتیب دینے والا معاشرہ آج ہے کہاں؟

سنہری روایت سے ہمارا رشتہ ختم ہو رہا ہے۔ ماضی کی طرف پیٹھ کر کے ہم حال اور مستقبل میں اپنی نگاہوں میں اُگ آئے خوابوں کی نئی نئی تعبیریں تلاش کر رہے ہیں۔

حصار بے اماں۔

درندگی کے پیرہن میں آدمی کے چہرے کو دیکھ کر شیطان بھی دور بھاگنے لگا ہے۔ موسم کا مزاج بدل رہا ہے۔ جدت بڑھتی جارہی ہے۔ برف پوش پہاڑوں کی برف پگھل کر ندی میں سمائی جارہی ہے۔ بھائی، ناقد تو اس پہاڑ کی طرح ہوتا ہے، جس کی باہیں کہانی ندی کو اپنے حدود سے آزاد کرتی ہیں۔ حدود/ دائرے کہیں انجماد کی کیفیت تو نہیں، میرے خواجہ!؟

13 حروف کے خواجہ احمد عباس! تمھارے انسانی رویوں اور تخلیقی کائنات پر میرا ایمان ہے اور ایمان کسی گرامر کا محتاج نہیں ہوتا۔ پھر کون سی گرامر —؟

چلو ماضی کی طرف اور تلاش کرتے ہیں جمالیاتی تسکین فراہم کرنے والے چشمہ کو!

خواجہ احمد عباس، تمھارے زمانے میں اردو ناول نگاری کا مقدر کچھ ایسا تھا کہ چند انے گنے فنکار تاریخ کے صفحات میں گم ہو رہے تھے۔ مگر تمھارے جانے کے بعد، نئی صدی میں، ناول کی زمین پر ایک 'انقلاب' آیا ہے۔ جون میں بہنے والی گرم ہوائیں قاری بدن کو جھلسا رہی ہیں۔ 21 ویں صدی میں کئی اہم ناول سامنے آئے ہیں اور ان پر گفتگو کا سلسلہ جاری ہے اور تحریریں کائناتی سچائیوں کی امین بنتی جارہی ہیں۔

جب سے کھرے کھوٹے کی پہچان کرنے والے چلے گئے یہ کمبخت ادب بھی آج کے عشق کی طرح ایکسلیٹر پر کھڑا ہے اور ترقی پسند نظریہ بھی ترقی یافتہ ہوگیا ہے۔

■

Khursheed Hayat, Chief Controller (SEC Railway) Qtr. No 16/3, New .E. Colony, Bilaspur - 495004 (MP)

خواجہ احمد عباس

جہاں لنگڑے لولے مسکراتے رہتے ہیں

'آزاد قلم' خواجہ احمد عباس کا بے حد مشہور و مقبول کالم تھا جو ہفتہ وار 'بلٹز' کے آخری صفحے پر شائع ہوا کرتا تھا۔ اپنے وقت کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ہفت روزہ 'بلٹز' کا اکثر قارئین پورے ہفتے اسی کالم کو پڑھنے کے لیے انتظار کرتے تھے۔ (ادارہ)

لبنان کے شاعر خلیل جبران نے کہا تھا: ''میں مغموم تھا کہ میرے پاس جوتے نہیں تھے— جب تک کہ میں نے اس آدمی کو نہیں دیکھا تھا کہ جس کے پاس ٹانگیں بھی نہیں تھیں۔''

اپنی اضافی بدنصیبی اور خوش نصیبی کا اس ہسپتال میں آکر اچھا احساس ہوتا ہے جہاں کہ ہر قسم کے معذور لوگ آتے رہتے ہیں۔ آدھے گھنٹے میں میں نے یہاں ان کو آتے دیکھا جن کے —ہاتھ نہیں تھا یا نہیں تھے۔ کلائی اور بانہہ نہیں تھے یا ایک پیر نہیں تھا۔ یا دونوں پیر نہیں تھے جو بیساکھیوں کی مدد سے چلتے تھے۔ جو ہاتھوں کے بل پر رینگتے تھے جن کی ٹانگیں یا ہاتھ 'پولیو' کی وجہ سے مفلوج تھے۔

میری تو بائیں ٹانگ کے پیر میں ایک انگوٹھا ہی ایک سامان لے جانے والی ٹرالی سے کچلا گیا تھا جس کی وجہ سے میں لنگڑا کر چلتا تھا۔

باہر دنیا میں میں اپنے آپ کو بدقسمت سمجھتا تھا کہ سیدھا چل بھی نہیں سکتا تھا۔

مگر یہاں آکر مجھے اصلیت معلوم ہوئی کہ میں اس شفاخانے میں اضافی طور پر سب سے خوش قسمت 'بیمار' ہوں۔

ورنہ سب یہاں مجھ سے زیادہ 'بیمار' ہیں مگر پھر بھی کتنے بہادر ہیں۔ ہر حالت میں مسکراتے رہتے ہیں۔ میں ان کی مسکراہٹ پر سب سے زیادہ رشک کرتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ یہی اس ہسپتال کا کمال ہے کہ روگیوں کے چہرے پر مسکراہٹ کھلا دیتا ہے۔ نااُمیدی کی بجائے اُمید کا احساس جگاتا ہے۔ یہاں اس ہسپتال میں آنے والے اپنے آپ کو اپاہج نہیں سمجھتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر معذوری ہر بیماری کا کوئی نہ کوئی علاج ہے۔ 'پولیو' اگر ہے تو اس کا علاج ہو سکتا ہے خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگے۔ جب تک پورا علاج نہ ہو تو ان کو 'پولیو جوتے' پہننے کو مل جاتے ہیں جن کی وجہ سے اچھے خاصے چلنے لگتے ہیں۔ ایک بیساکھی یا دو بیساکھیاں مل جاتی ہیں جو چلنے میں مدد دیتی ہیں۔ بیساکھیاں نہیں تو ہاتھ میں لینے کی لکڑیاں مل جاتی ہیں۔ اس طرح نقلی ٹانگ بھی لگا دی جاتی ہے۔ بعض حالات میں دونوں ٹانگیں بھی لگائی جاسکتی ہیں۔ جو مریض اعصابی وجوہ سے معذور ہو گئے ہیں ان کا علاج بجلی سے ہوتا ہے۔ غرض ہر طرح سے علاج ہوتا ہے یا معذوری دور کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مدد دی جاتی ہے، کسی کو لاعلاج نہیں سمجھا جاتا۔ کسی کے دل میں امید کی روشن شمع بجھائی نہیں جاتی۔ اسی لیے یہاں آنے والے روگی مسکراتے ہیں۔ ان کے چہروں سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ روگی ہیں، بیمار ہیں یا معذور ہیں۔

میں پریشان تھا کہ ڈیڑھ برس سے میرے پیر کا انگوٹھا ٹھیک نہیں ہوا۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی دو یا تین سال بھی لگ سکتے ہیں علاج ہونے میں۔ لیکن ہفتے بھر ہی میں فرق ہونے لگتا ہے جیسا کہ آج مجھے ایک ہفتہ ہی ہوا ہے یہاں آئے ہوئے۔ میں اپنے انگوٹھے میں جان محسوس کرنے لگا ہوں۔

کسی آدمی کو معذور یا اپاہج نہ سمجھو۔ نہ سمجھنے دو۔ یہ اس ہسپتال کا اصول ہے، یہی یہاں کا نظریہ ہے۔ یہی اس ہسپتال کی دین ہے۔ یہاں ایسے مریضوں کو نہ صرف اچھا کیا جاتا بلکہ کبھی کبھی ان کو کام بھی دیا جاتا ہے۔

یہاں داخل ہوتے ہی آپ دیکھیں گے کہ سوئچ بورڈ پر ایک مسکراتی ہوئی سانولی لڑکی بیٹھی ہے۔ جو بیک وقت ٹیلیفون پر جواب بھی دیتی ہے اور اندر آنے والوں کے سوالات کا بھی جواب دیتی ہے۔ بڑی خوش خلقی سے پیش آتی ہے۔

مگر بیٹھے بیٹھے ہی سب کام کرتی ہے مگر جب اسے اٹھنا پڑتا ہے تو دو بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اس کی ٹانگیں اب تک معذور ہیں۔

مگر اس کی ٹانگوں کا بھی علاج ہو رہا ہے۔ کون جانتا ہے ایک دن وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اور وہ اپنی ٹانگوں پر چلتی ہوئی اس ہسپتال سے باہر نکلے گی۔ اس امید پر اس لڑکی کی دنیا قائم ہے۔

یہ ہسپتال کیسے بنا اس کی بھی ایک الگ تاریخ ہے۔ آج سے تقریباً بیس برس پہلے قومی تحریک میں ایک نوجوان خاتون مسز اسماعیل تھیں۔ (اب تک ہیں) ان کی ایک بچی تھی جو پیدائش سے 'پولیو' کی شکار تھی۔ چل نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے کی تھی اس لیے اس کی ماں اس کو ساتھ لے کر ساری دنیا میں پھریں۔ جہاں کسی نے بتایا کہ وہاں اس کا علاج شاید ہو سکے۔ وہاں وہ گئیں۔

اس طرح ان کو جانکاری ایسے ہسپتالوں کی مل گئی جہاں ایسی بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ ہندوستان میں بھی ایسا ہسپتال بنانا چاہیے۔

پندرہ بیس برس پہلے انھوں نے چھوٹے پیمانے پر ایک چھوٹا سا ہسپتال بنایا جو اب بڑا ہو کر گورنمنٹ نے اپنی نگرانی میں لے لیا ہے۔ معلوم نہیں کہ مسز اسماعیل کی لڑکی کی ٹانگیں ٹھیک ہوئیں یا نہیں۔ اب تو وہ بھی بڑی ہو گئی ہو گی— لیکن اس کی معذوری کی وجہ سے ہزاروں کے دل میں امید روشن ہو گئی۔ اب تو مسز اسماعیل بوڑھی ہو گئی ہیں مگر ان کو ہزاروں مریض دعائیں دیتے ہیں کہ ان کی وجہ سے یہ ہسپتال بنا اور آج اس مقام پر پہنچا کہ ہندوستان بھر میں نمبر اول مانا جاتا ہے۔

20 ہفتہ وار بلٹز

جہاں لنگڑے لُولے مسکراتے رہتے ہیں!

غلام عباس

غلام عباس

ایک شہر: آنندی!

سوپر میٹالک ایف ۳ ایچ

FERODO

بلٹز

آر۔کے۔کرنجیا

حسن کمال

11. DEC. 1982

غلام عباس

پچھلے ہفتے پاکستان سے خبر آئی ہے کہ مشہور ادیب جناب غلام عباس کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں غلام عباس صاحب سے ایک بار ہی ملا ہوں۔ جب میں نے اُن کی مشہور کہانی 'آنندی' کی تعریف کرتے ہوئے ان سے کہا تھا کہ ''مجھے اکثر لوگ اس کہانی کا مصنف مانتے ہیں اور میں ان کو جھٹلاتا نہیں۔ جو تعریف کرتے ہیں وہ سن کر دل ہی دل میں اسے آپ کے نام بھیج دیتا ہوں۔''

انھوں نے ہنس کر کہا کہ ''ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ آپ کی کئی کہانیوں کے لیے لوگ میری تعریف کرتے ہیں۔ اور میں کچھ نہیں کہتا کہ ان کا لکھنے والا تو ہندوستان میں ہے۔ چلیے ہم برابر ہوگئے۔'' یہ تو ان کی کسرنفسی اور مذاق کرنے کی عادت تھی کہ انھوں نے ایسا کہا۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کہانی 'آنندی' ہزاروں میں ایک ہے اور مصنفوں کے ناموں میں ایک قسم کی یکسانیت ہونے سے دھوکا ہوجاتا تھا۔ حالانکہ 'غلام عباس' اور 'خواجہ احمد عباس' میں ایک ہی نام 'عباس' ہی مشترک تھا! جو ان کے انتقال کے بعد اب مشترک نہیں رہا۔

ایک شہر: آنندی!

عباس صاحب ایک زندہ دل ادبی شخصیت تھے اور ان کی کہانی 'آنندی' زندگی کی ایک تلخ حقیقت کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کرتی ہے۔ (مصنف 'مرحوم' ہوجائے مگر اس کی تخلیق آج بھی زندہ ہے اور ساتھ ہی جس حقیقت پر وہ مبنی ہے وہ بھی آج زندہ ہے)۔ 'آنندی' کہانی ہے ان بدقسمت مگر مسکراتی ہوئی عورتوں کی جو جسم فروشی کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک شہر میں 'سدھارک' میونسپلٹی سے ایک قانون بنوادیتے ہیں کہ کوئی طوائف ان کی میونسپل حدود میں نہیں رہے گی۔ طوائفیں اور رنڈیاں بیچاری وہاں سے نکلنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ آخر میں ویرانے جنگل میں ایک غیرآباد جگہ ان کو مل جاتی ہے وہیں آباد ہوجاتی ہیں۔

یہ مقام 'آنندی' کہلاتا ہے۔ جب یہ عورتیں وہاں آباد ہوجاتی ہیں تو اُن کے سنگھار کے لیے پھول بیچنے والے وہاں آجاتے ہیں۔ پان بیچنے والے وہاں آجاتے ہیں۔

دلال تو ان عورتوں کے ساتھ سایہ کی طرح لگے ہوئے تھے۔ پھر ہوٹل کھل جاتے ہیں۔ چائے خانے اور ریستوران کھل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک اچھا خاصا شہر آباد ہوجاتا ہے۔ عورتوں کے گاہک بھی آنے لگتے ہیں۔ بعض وہیں رہ پڑتے ہیں۔ غرض جہاں ویرانہ تھا وہاں چہل پہل ہوجاتی ہے۔

اس مضمون کو لے کر یا اس کہانی سے ماخوذ ایک مشہور اور معروف فلم ڈائرکٹر فلم بنارہے ہیں۔ نام تو اس کا آنندی نہیں ہوگا نہ معلوم کیا ہوگا............ مگر اردو ادب کو جاننے والے 'آنندی' کے اثر کو پہچان لیں گے۔

'آنندی' کہانی کا مقصد یہ دکھانا نہیں ہے کہ رنڈیوں کا پیشہ امرہ اور ہمیشہ رہے گا۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ اقتصادی اور سوشل نظام میں یہ پیشہ بھی ضروری ہے۔ جہاں سیٹھ ساہوکار ہوں گے۔ وہاں کسبیاں بھی ہوں گی۔

جہاں مزدوروں کا استحصال ہوگا وہاں رنڈیاں بھی ہوں گی۔

جہاں لاکھوں مزدوروں کو بیوی، گھر یا گاؤں میں چھوڑ کر شہر آکر دہلی میں نوکری کرنی پڑتی ہے۔ وہاں جسم کی خرید وفروخت بھی ہوتی ہوگی۔

قصور ان بے چاری عورتوں کا نہیں ہے جو جسم بیچنے پر مجبور ہیں۔

قصور اس سوشل اور اقتصادی نظام کا ہے جو ہر قسم کا استحصال جاری رکھتا ہے اور اس استحصالی دائرے میں یہ استحصال بھی ہوتا رہتا ہے اور (جب تک یہ نظام جاری ہے) ہوتا رہے گا۔

■

ماخذ: ہفتہ وار بلٹز، دسمبر 1982

خواجہ احمد عباس

ابابیل

اُس کا نام تو رحیم خاں تھا مگر اُس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اُس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن رامو لُہار کے بچے نے اس کے بیل کی دُم میں کانٹے باندھ دیے تھے تو مارتے مارتے اس کو اَدھ مُوا کر دیا۔ اگلے دن ذیلدار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کم بخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے۔ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم میں جلے گا مگر یہ سب اس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ سامنے کسی کی ہمت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو اس نے کہہ دیا— ''ارے بھئی رحیم خاں تو کیوں بچوں کو مارتا ہے—'' بس اس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اس دن سے لوگوں نے بات بھی کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیے۔ کوئی کہتا تھا اب کے کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ لکھوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف گواہی دے کر اس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اُس سے بات کرنی چھوڑ دی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا نتھو، دوسرے کو چھدّو۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا— ''کیوں بے نتھو، تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورے کرے گا اور ابے چھدّو تیری بھی شامت آئی ہے کیا۔'' اور پھر ان غریبوں کی شامت آ ہی جاتی سوت کی رسی کی مار۔ دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو وہاں اپنے بیوی بچوں پر غصہ اُتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک ہے، بیوی کو ادھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کر رہا ہے، اس کو الٹا لٹکا کر بیلوں والی رسی سے مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی۔ آس پاس کے جھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اس کے بیوی اور بچوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے مگر بے چارے کیا کر سکتے تھے اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو اَدھ موئی ہو گئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ سال کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو پھر واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں ایک رشتہ کا چچا رہتا تھا اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا — ''بلاس پور کی طرف جاؤ ذرا نورو کو لیتے آنا—'' بس پھر کیا تھا آگ بگولہ ہو گیا— ''میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔''

بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال کے بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا اور بھائی کے پاس رہنے لگا۔ رحیم خاں کو غصہ اتارنے کے لیے فقط بیوی رہ گئی تھی سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چلی تھی۔ مگر ایک دن اس کو اتنا مارا کہ اس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پا کر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا وہ اپنے بھائی کو بلا کر اس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسایہ کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لیے اپنی ماں کے پاس رام نگر جا رہی ہوں۔

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لیے واپس آیا تو پڑوسن

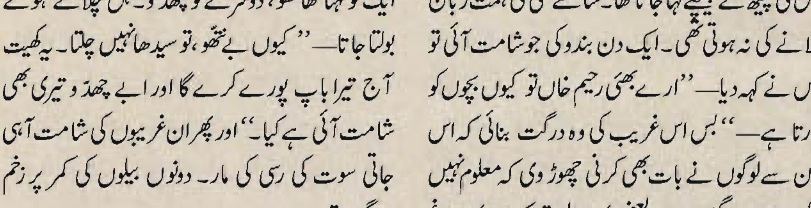

خواجہ احمد عباس امریکہ میں اندر راج آنند کے کنبے کے ساتھ

نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لیے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خلافِ معمول خاموشی سے بات سنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اب کبھی نہ آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلّی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اس کی ہی دم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا چولھے کو جا کر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا۔ بغیر کچھ کھائے پیے ہی پڑ کر سو رہا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ لیکن آج اسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ تھی۔ بکریوں کا دودھ دھو کر پیا اور حقہ بھر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اُتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلہ نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچا، ایک گھڑونچی لا کر اس پر چڑھا اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دیکھا دو لال بوٹی سے بچے پڑے چوں چوں کر رہے تھے اور ان کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لیے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل اپنی چونچ سے اس پر حملہ آور ہوئی۔

''اری آنکھ پھوڑے گی—'' اس نے اپنا خوفناک قہقہہ مار کر کہا۔ اور گھڑونچی پر سے اُتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔

اگلے دن سے اس نے پھر کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں سے اب بھی کوئی اس سے بات نہ کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا، لیکن شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی گھر آ جاتا۔ حقہ بھر کر پلنگ کے پاس لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی سیر دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچے بھی اُڑنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس نے ان دونوں کے نام اپنے بچوں کے نام پر نورو اور بندو رکھ دیے تھے۔ اب دنیا میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ لیکن ان کو یہ حیرت ضرور تھی کہ مدت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نتّھو اور چھدّو خوش تھے۔ ان کی کمروں پر سے زخموں کے نشان بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔

رحیم خاں ایک دن کھیت سے ذرا سویرے چلا آ رہا تھا کہ چند بچے سڑک پر کنڈی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھنا تھا کہ سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ کہتا ہی رہا— ''ارے میں کوئی مارتا تھوڑا ہی ہوں—'' آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی بیلوں کو ہنکاتا ہوا گھر لایا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہو گئی۔

اندر آ کر کواڑ بند کیے اور چراغ جلا کر اُجالا کیا۔ حسبِ معمول باسی روٹی کے ٹکڑے کر کے ابابیلوں کے گھونسلے کے قریب ایک طاق میں ڈال دیے— ''ارے او بندو۔ ارے او نورو'' پکارا مگر وہ نہ نکلے۔ گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دیے سہمے بیٹھے تھے۔ عین جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اس طرح ہی آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہو جائے گا اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ کو بند کر کے وہ اترا تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں مگر اس نے پروانہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح کو اٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اس کو کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو ذیلدار اور کئی کسان شام کو اس کے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا— ''ارے بندو۔ ارے نورو۔ کہاں مر گئے۔ آج تمھیں کون کھانا دے گا—'' چند ابابیلیں کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

''بے چارہ پاگل ہو گیا ہے۔'' کالو ذیلدار نے سر ہلا کر کہا ''صبح کو شفا خانہ والوں کو پتہ دے دیں گے کہ پاگل خانہ بھجوا دیں۔

اگلے دن صبح کو جب اس کے پڑوسی شفا خانہ والوں کو لے کر آئے اور اس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کی پائنتی پر چار ابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

■

ماخذ: خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے، مرتبہ: رام لعل، سنہ اشاعت: 1988، ناشر: سیمانت پرکاشن، نئی دہلی

محمد امتیاز احمد

لمحہ بھر وصل کا شاعر
مجید امجد

مجید امجد (1974-1914) جدید شعرا میں ایک اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ ان کا نام جدید شاعری کے بنیاد گزاروں میں بغیر کسی جھجک لے لیا جا سکتا ہے، مگر مرنے کے بعد بھی انھیں وہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ ویسے بھی مجید امجد کی زندگی بہاروں کے سوگ میں کٹی ہے اس کی شامیں ویراں ہیں جن کے ہونٹوں پے آہیں ہیں وہ دنیا کی اندھیری گھاٹیوں میں ٹھوکریں کھاتا آیا ہے اور اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ ان کے دکھ بھرے دل میں آگ سلگی ہوئی ہے۔ ان کی نظموں میں بھی حال کو بڑی اہمیت ہے البتہ وہ ماضی اور مستقبل سے اپنا رشتہ نہیں توڑتے بلکہ ماضی سے ان کا لگاؤ نمایاں ہے اور مستقبل سے امیدیں بھی وابستہ ہیں۔ یہ بھی کہ وہ گرد و پیش کے بدلتے ہوئے حالات سے آخر لمحہ تک آگاہ رہے اور ان کی شعری حسیت بیدار رہی۔ انور سدید نے صحیح کہا ہے:

''مجید امجد کے ہاں ایک کائناتی شعور Cosmic Consciousness بھی ہے جو بہت کم دوسرے شعرا کو حاصل ہے۔'' (انور سدید: اردو ادب کی تحریکیں: ابتدا تا 1975، ص 576)

ان کے کلام میں فنی روابط کی عمدہ مثالیں بھی ملتی ہیں:

سفر، ریل، مجسمے، شامیں، باغ، پھول، لوگ، درخت، جانور مجید امجد کی شاعری کا کینواس ہے۔ وہ ایک ہی طرح کے مظاہر کا بار بار ذکر کرتے ہیں گویا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کے انسلاکات کو گہرائی سے محسوس کیا ہے اور یہ اس کی نفسیات پر دیرپا اثر چھوڑ چکے ہیں جب کبھی انھیں ان کے متعلق خیال آتا ہے تو ان اشیا کے کچھ پہلو اس وقت اجاگر ہوتے ہیں اور ان کے نقوش کاغذ پر ڈھلتے ہیں اور کچھ ذہن سے محو ہوتے ہیں مگر وہ کسی دن پھر سے ذہن کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں اور یادوں کی چلمن سے اپنا سر نکالتے ہیں مگر پہلے کے بجائے دوسرے ہی تناظر میں ظاہر و نمودار ہوتے ہیں جو کہ کسی حد تک پہلے سے مختلف بھی ہوتا ہے اور اس کی دوسری یا نامکمل کڑی بھی مثلاً 'اقبال' پر پہلی نظم کے یہ اشعار:

مشرق تری نظر میں ہے امید کا افق
مغرب تری نگاہ میں ہے غرق سیآت
اسلام کے فلسفے میں دیکھتا ہے تو
مظلوم کائنات کی واحد رہِ نجات
تیرا کلام جس کو کہ بانگ درا کہیں
ہیں اس کے نقطے نقطے میں قرآں کے نکات
دنیا کا ایک شاعر اعظم کہیں تجھے
اسلام کی کچھار کا ضیغم کہیں تجھے

اقبال، ص 180

اور دوسری نظم میں یہی خیالات ذرا مختلف طریقے سے پیش ہوئے ہیں:

موج تہذیب نو ہے جس کے لیے
ورطہ بحر سیآت اقبال
جس کے شعروں کا نقطہ نقطہ ہے
لیے قرآں کے نکات اقبال
راہِ اسلام کو سمجھتا ہے
وہ جو واحد رہِ نجات اقبال

اقبال، ص 205

اسی طرح انھوں نے لاہور، ٹرین، جہاز، پیڑ، چڑیوں، پھولوں، درختوں، شام، وغیرہ کو اپنی کئی کئی نظموں کا موضوع بنایا ہے، گویا کہ یہ وہی نقوش بار بار ابھرتے ہیں جو ان کی یادوں کی تہوں میں بیٹھ چکے ہیں۔

'شب رفتہ' میں مجید امجد کو ابھی محبوب کا وصل حاصل نہیں ہوا وہ اس کے لمس کے لیے بیقرار ہے اور اس سے ملنے کی شدید آرزو رکھتا ہے کیونکہ ابھی یہ اس کی جوانی کا دور ہے۔ مگر وہ اس کے درمیان میں ایک فاصلہ ___ Gap بھی رکھنا چاہتے ہیں تا کہ قربت کی آنچ میں ساری محبت نہ پگھل جائے اس لیے وہ اس کو زندہ و تابندہ ہی رکھنا چاہتا تھا، اور اس کے لیے یہی سب سے کارگر حربہ تھا۔ یہ بات بھی کہ وہ محبوب سے شرماتا تو ہے مگر اس سے حد درجہ لگاؤ بھی اور نیک گماں رکھتا ہے۔ وہ اس سے ملنے کا شدت سے آرزومند ہے مگر اس کے لیے کوئی اقدام براہ راست نہیں کرتا بلکہ وہ اس سلسلے میں کبھی 'بُندا' بننا چاہتا ہے کبھی 'سوکھا تنہا پتا'، کبھی 'ایک پرنشاط جلوس کے ساتھ' جانا چاہتا ہے۔

کاش میں تیرے بن گوش میں بُندا ہوتا 'بندا'
کاش میری یہ قسمت ہوتی' کاش میں وہ اک پتا ہوتا۔

'سوکھا تنہا پتا'

شاید اب کے پھر بھی، شوق دید کے احساس سے
شاید اب کے پھر بھی، شوق دید کے احساس سے
تو بھی آ نکلے سربام — آہ یہ سودائے خام

پاؤں تو اٹھتے ہیں۔ لیکن آنکھ اٹھ سکتی نہیں
جا رہا ہوں میں نہ جانے کس سے شرماتا ہوا
میں لرز اٹھتا ہوں کس کی ٹکٹکی کے وہم سے ؟
میں جھجک جاتا ہوں کس کے سامنے آتا ہوا ؟

کس کا چہرہ ہے ان گھونگھٹوں کے درمیان —
چوڑیوں والی کلائی ؟ جھومروں والی جبین ؟

'ایک پرنشاط جلوس کے ساتھ'

'ساجن دیس کو جانا' میں طنبور بجاتے، گاتے راہی سے یہی گزارش کی جا رہی ہے۔ ''آٹوگراف'' میں بھی اسی لہر کی شدت ملتی ہے کہ کھلاڑیوں کو مہ وشوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے وہ ان کی نگاہ کرم کی منتظر ہیں مگر یہاں محسوس ہوتا ہے:

میں اجنبی، میں بے نشان
میں پابہ گِل
نہ رفعت مقام ہے نہ شہرت دوام ہے
یہ لوحِ دل — یہ لوحِ دل
نہ اس پے کوئی نقش ہے نہ اس پے کوئی نام ہے

'آٹوگراف'

عقیل احمد صدیقی کے مطابق:

''مجید امجد کی شاعری میں 'ذات' کا اظہار عموماً دو

طریقوں سے ہوا ہے' شب رفتہ' میں یہ اظہار اکثر براہ راست انداز سے ہوا ہے۔ایک طرف ان کی ذات ہوتی ہے جو محروم ہے اور دوسری طرف وسیع کائنات اور اس کے جا بجا بکھرے ہوئے مظاہرے ہوتے ہیں۔ ان مظاہرات میں مجید امجد اپنی ذات کی محرومیوں کا درد بھرا نغمہ سناتے ہیں ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے'شعری پرسونا' کو اپنی ذات میں مدغم کردیتے ہیں۔''

(عقیل احمد صدیقی، جدید اردو نظم: نظریہ و عمل، ص: 358)

'شب رفتہ' کے بجائے 'روز رفتہ' میں موضوعات کا رخ بدل جاتا ہے اس میں صرف عشق وحسن کی رنگینیاں ہی نہیں حسرت وصل ہی نہیں بلکہ کائنات کے دوسرے مظاہر پر بھی غور وفکر کا پہلو ملتا ہے۔راشد کے برعکس مجید امجد کے ہاں جنس کا ایک شفاف تصور ملتا ہے وہ 'برہنہ' میں بھی برہنگی اور سفلی جذبات کو نہیں ابھارتے وہ اس سلسلے میں حساس واقع ہوئے ہیں انھوں نے اپنے فن کو برہنگی سے غلیظ نہیں ہونے دیا۔ نہ ہی مذہب کا مذاق اڑایا ہے بلکہ اس کو بہ نظر استحسان دیکھا ہے اور اپنے اچھے اکابر جنھوں نے مذہب کی خدمات انجام دی ہیں ان کی مدح لکھی ہے جن میں حالی اور اقبال نے بطور خاص ان کو متاثر کیا ہے، کیوں کہ وہ مصلح بھی تھے، ادیب بھی تھے اور دیندار بھی۔ اور اس مدح میں یہ خوبی کہ اس کو قصیدہ گوئی کے عیوب سے گریز کر کے ان کو القاب کے ملبے کے نیچے نہیں دبایا اور بہتر طریقے سے ان کے کارناموں کا اعتراف کیا ہے:

تیرا کلام جس کو کہ بانگِ درا کہیں
ہیں اس کے نقطے نقطے میں قرآن کے نکات (اقبال)

حالی کو انھوں نے مسدس میں خراج تحسین پیش کیا ہے گویا اس طرف اشارہ ہے'مسدس' لکھ کر حالی نے ملت پر بڑا احسان کیا ہے:

وہی حالی جسے دانائے راز زندگی کہہ دیں
جسے سرمایہ سوز و گداز زندگی کہہ دیں (حالی)

مجید امجد نے خارج کی اشیا کو اپنی دلی کیفیات سے اجاگر کیا ہے وزیر آغا کو ان کی نظموں میں بلندی وعروج (Sublimity) کے عناصر نظر آتے ہیں جس کے تحت تاحد نظر پھیلا ہوا آسماں اونچے پہاڑ لاتعداد ستاروں کا پھیلاؤ بے کنار وسعتوں، لامحدود قوتوں اور غیر معمولی صلاحیتوں کی غمازی کرتے ہیں وہ زندگی کے تمام تر مظاہر کے زیرک ناظر ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع، نظریوں کی آمیزش اور ہم آہنگی ہے۔ وہ گردوپیش کے بدلتے ہوئے حالات سے آخر لمحہ تک آگاہ رہے اور ان کی شعری حسیت بیدار رہی۔ ان کے ہاں دردمندی سب سے فعال اور حسین جذبہ ہے اور یہ جذبہ لامحدود ہے جس میں جمادات، حیوانات، حشرات الارض، پھل پھول، درخت، پرند، چیونٹیاں، بچے سب آتے ہیں اور ان کے ساتھ ان کو بے حد لگاؤ ہے اسی لیے' توسیع شہر' میں وہ درختوں کی بیخ کنی پر ماتم کرتے ہیں جو بیس برس سے گاتی نہر کے دوار کھڑے تھے۔صرف بیس ہزار میں بک گئے:

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر' بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

درخت سے ان کو گہری وابستگی ہے وہ اس میں کئی روپ دیکھتے ہیں کہیں وہ ان کو اپنی ماں کے مثل قرار دیتے ہیں جس کی گھنی چھاؤں میں وہ چین کی سانسیں لیتا ہے اور کبھی وہ ان میں اپنی ذات کے مظاہر دیکھ لیتے ہیں۔ اس لیے درخت کو اس نے اپنی کئی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ویسے بھی نفسیات والوں نے درخت کو'ماں' کی علامت قرار دیا ہے۔ جب ماں سے انسان کا رشتہ کٹ جاتا ہے گویا وہ خود ہی جڑ سے اکھڑ جاتا ہے اسی لیے اس پر ماتم فطری سی بات ہے:

سہی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل

''.....یہی وجہ ہے کہ اس نے خود کو کائنات کے ہر انگ سے جڑے ہوئے پایا ہے۔ پھر جب کوئی درخت کٹتا ہے، کوئی چیونٹی پاؤں تلے آتی ہے، کوئی بچہ حادثے کا شکار ہوا ہے، کوئی پھول مسلا گیا یا کوئی پرندہ یا شخص یا طبقہ ظلم کا نشانہ بنا ہے، تو مجید امجد کو یوں لگا ہے جیسے اس کے بدن کا کوئی حصہ زخمی ہو گیا ہے۔''

(وزیر آغا: مجید امجد کی داستان محبت، ص 46)

جلسہ، شاخ چنار، سنگت، ماڈرن لڑکیاں، سرسبز پیڑوں کے سائے، فصل گل، دروازے کے پھول، گھورگھٹاؤں، میں بھی درخت اور پھولوں سے لگاؤ اور محبت کا پہلو ابھرا ہے۔ چیونٹیوں سے بھی انھیں لگاؤ ہے اور پرندوں سے بھی محبت اس وجہ سے کہ انھوں نے ہر حال میں ان کا ساتھ دیا ہے۔ پکار، موانست، افریشا، بہار کی چڑیا، اے ری چڑیا وغیرہ میں ان سے محبت کی واضح نشانیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے چڑیا کو آزادی کی علامت کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں:

''صوفی کائنات کو قطرے اور دجلے کی علامتوں میں سمجھتا ہے؛ مفکر وجود اور موجود کی زبان میں؛ اور سائنس دان پیٹرن Patern اور پراسس Process کے حوالے سے..... مگر مجید امجد نے اسے صرف درد کے حوالے سے جانا ہے اور یہ درد وہ دردزہ ہے جو تخلیق کائنات کے واقعے میں مضمر ہے۔''(وزیر آغا: مجید امجد کی داستان محبت، ص: 53-52)

ان کی نظموں کی ایک اہم خصوصیت ان کا اختصار ہے ان کی اکثر نظمیں اس صفت سے متصف ہیں چند ہی نظموں میں طوالت ہے۔ مجموعہ'امروز' کی بہت سی نظموں کے ترجمے کیے گئے جو مختصر ہی ہیں۔

اور'فردا' کی تقریباً سب نظمیں ایک ہی صفحے پر مکمل ہوتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ دو صفحات یہ چیز ایک اچھے فنکار کی فن کاری اور دسترس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مجید امجد کی ذاتی زندگی بوجھل اور الجھی ہوئی محسوس ہوتی ہے ویسے بھی ازدواجی طور پر وہ مطمئن نہ تھے اسی لیے یہ بوجھل پن، الجھن اور بے اطمینانی ان کے فن میں بھی در آئی اس وجہ سے ان کی شاعری ثقیل اور ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی ہے اس کو پڑھتے پڑھتے ایک گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔

نظم'بھکارن' کا آخری بند بڑا معنی خیز ہے:۔

''میں کہاں روز روز آتی ہوں
ہے مرے کوچ کی گھڑی نزدیک
جانے والو بس اک نگاہ کی بھیک''

(بھکارن)

مگر انھیں یہ'اک نگاہ کی بھیک' ملی نہیں آخری وقت بھی بھوکے اور پیاسے ہی دنیا سے چلے گئے:

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
میری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

مراجع

مجید امجد کے شعری احساس کی حسین وجمیل شورشیں ہی ان کے لیے عین حیات ہیں۔ روز بروز پیچیدہ ہونے والے حیاتیاتی مسائل سے بھری دنیا میں ادراک وآگاہی کی منزلیں بے حد کٹھن ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن تمام الجھنوں سے قطع نظر انھوں نے ان منزلوں کی طرف جانے والے راستوں پر ہمیشہ استجابی قدم اٹھایا ہے۔ ہر مرحلے پر اپنے تصورات سے کام لیتے ہوئے بڑے خلوص کے ساتھ الفاظ کو تخلیق کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

■

Mohd Imtiyaz Ahmad, Doctoral Scholar,
Dept of Urdu, JMI, New Delhi -110025

مولانا مطیع اللہ نازش

اڈیشا میں فارسی زبان کا ارتقا

فارسی ایک شیریں زبان ہے۔ بلاشبہ فارسی محبت اور اخوت کی زبان ہے۔ فارسی ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی، ثقافتی ارتقا کا باعث ہے۔ اس لیے بھی فارسی کو فروغ دینے کی ضرورت ہے کہ اس میں ایک بڑی اقلیت کے مذہبی علوم کا خزینہ ہے اور قدیم زمانے سے ان کی تہذیبی، ملی، دینی جانکاری کا واحد ذریعہ یہی فارسی زبان ہی رہی ہے۔ آج فارسی زبان سے بے التفاتی دیکھ کر بڑا ہی افسوس ہوتا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں طبقے میں فارسی زبان وادب کے لیے عدم دلچسپی ایک حیرت ناک، تشویش ناک مسئلہ ہے۔ شاید اس لیے کہ آج فارسی کا تعلق روزی روٹی سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے دور میں فارسی زبان ہی حصول معاش کا واحد ذریعہ تھی۔ اس دور میں مسلم اور غیر مسلم سبھی فارسی زبان وادب میں مہارت رکھتے تھے کیوں کہ مسلم حکمرانوں کے دربار میں رسائی اور حصول معاش کا واحد ذریعہ فارسی دانی پر محمول تھا۔

اس سلسلے میں اڈیشا سرکار کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اس نے حسب روایت سابقہ فارسی زبان کو چھٹی جماعت سے یعنی پرائمری درجات سے نصاب میں داخل کرکے اس زبان کی اہمیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ یوں تو NCF2005 اور SCF2007 کے تعلیمی نظریے کے مطابق کلاسیکل زبان مثلاً سنسکرت اور فارسی زبان کو نصاب میں چھٹی جماعت سے شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اب تک اڈیشا میں چھٹی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک اور ڈپلومہ ان ایلیمنٹری ایجوکیشن یعنی 'سی ٹی' کے نصابِ تعلیم میں فارسی کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے سی ٹی کے نصابِ تعلیم میں فارسی شامل تھی مگر درمیان میں اسے منسوخ کردیا گیا تھا۔

اڈیشا میں فارسی کا آغاز

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بنگال کے سلیمان کرہانی نے 1568 میں اڈیشا میں افغان حکومت کی بنیاد ڈالی۔ 1568 سے 1575 تک افغان مہاندی کے شمالی اضلاع پر قابض رہے

لیکن افغانوں کی حکومت ان دنوں اڈیشا پر زیادہ عرصے کے لیے قائم نہ رہ سکی۔ 1576 میں داؤد کرہانی کی شکست اور وفات کے بعد اڈیشا کا الحاق اکبر کی سلطنت میں ہوگیا۔ بنگال کی طرح یہ بھی ایک مغل ریاست کی طرح قائم رہا۔ 1576 سے 1605 تک تقریباً 30 سال تک مغل حکمراں اڈیشا اور بنگال سے افغانوں کی باغیانہ سرکشی کا خاتمہ کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ داؤد کرہانی کی شکست کے بعد سے اڈیشا برائے نام اکبر کی سلطنت میں ضم کرلیا گیا تھا۔ (اکبرنامہ: ابوالفضل، حصہ سوم، ص 878)، میری ان باتوں کی تحریر سے یہ ثابت کرنا ہے کہ اڈیشا میں فارسی زبان کا آغاز ہوا اور بول چال پر اثر انداز ہونے لگی۔ افغان اور مغل دونوں کی مادری زبان فارسی تھی۔ اسی لیے فارسی زبان ہندوستان میں رائج ہوئی اور اسے سرکاری زبان کا درجہ بھی ملا۔

1566 میں اکبر بادشاہ نے خزانچی، حسن اور بھٹ مہاپاترا کو اپنا ایلچی بنا کر اڈیشا بھیجا، بھٹ مہاپاترا مغل دربار کا ایک موسیقار اور فارسی داں بھی تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ شہنشاہ اکبر کا ہر دلعزیز موسیقار تھا۔ ان دونوں صاحبان نے راجہ مکند دیو کے دربار میں چار ماہ قیام کیا۔ دوران قیام ان لوگوں نے شہنشاہ اکبر اور راجہ مکند دیو کے درمیان دوستی اور مفاہمت کی فضا بنائی بالآخر راجہ مکند دیو نے چند ہاتھی اور دیگر قیمتی تحائف دے کر انھیں اپنے سفیر، پرمانند کے ساتھ اکبر کے دربار میں بھیج دیا۔ (اکبر نامہ: ابوالفضل، ص 382)۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اڈیشا پر مغلوں کے تسلط سے قبل ہی مغل دربار سے اڈیشا کے ثقافتی تعلقات قائم تھے۔ اس کے علاوہ اڈیشا کے ایک اور فارسی داں شاعر وشوناتھ سامنت رائے، نے اکبر کے دربار میں مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس کا تذکرہ اڈیشا میوزیم میں محفوظ ایک غیر مطبوعہ سنسکرت کے قلمی نسخہ 'سوری سروستم' میں بھی ملتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جب راجہ مان سنگھ 1593 میں اڈیشا آیا تو اڑیا شاعر وشوناتھ سامنت رائے نے اپنی بلند پایہ فارسی شاعری سے اسے متاثر کیا اور جب مان سنگھ اڈیشا سے جانے لگا تو وشوناتھ سامنت رائے کو اپنے ساتھ لے گیا اور شہنشاہ اکبر کی خدمت میں پیش کردیا۔ اکبر ہندو شعرا اور پنڈتوں کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ داد و دہش پیش کرتا تھا۔ اگرچہ وشوناتھ سامنت رائے اکبر کے دربار میں بہت ہی کم عرصے کے لیے رہا۔ اس نے اپنی بلند پایہ فارسی شاعری کے عوض بادشاہ سے قیمتی خلعت حاصل کیا۔ مغل دربار میں مقبولیت اور شہرت

حاصل کرنے کے بعد سامنت رائے، اڈیشا واپس آ گیا۔
(Odhisha History Research Journal, Vol, 1p.54)

آئین اکبری میں وشوناتھ اڑیا اور فارسی شاعر کا تذکرہ ایک عظیم المرتبت ہندو پنڈت کے طور پر آیا ہے۔
(آئین اکبری ابوالفضل جلد نمبر 1، ص 611)

اڈیشا میں مسلم حکومت کے قیام کے بعد سے فارسی اڈیشا کی کچہریوں کی زبان بنی حتی کہ مراٹھوں کے دور حکومت میں بھی یعنی 1751 سے 1803 تک فارسی زبان اڈیشا کی سرکاری، کاروباری زبان رہی۔

1803 میں انگریزوں نے اڈیشا پر قبضہ کر لیا لیکن 1823 تک فارسی اڈیشا کی سرکاری زبان رہی۔ ملک کے مسلم حکمرانوں نے جب فارسی کو سرکاری زبان کے طور پر جاری کیا تو مقامی لوگوں کو ملازمت، تجارت اور دوسری مراعات کے حصول کی غرض سے فارسی پڑھنا پڑی۔ آج انگریزی تعلیم جس طرح تہذیب کا جز بنی ہوئی ہے، اس دور میں فارسی کی بھی یہی حالت تھی۔ سکندر نامہ نظامی گنجوی کا ایک قلمی نسخہ جو اجودھیا رام کی رہائش گاہ پر رگھوناتھ پور میں موجود تھا 1129 عملی (مطابق 1712 میں لکھا گیا تھا) اس نسخے کا اختتام ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے:

''تمت تمام شد کار من نظام شد نسخۂ سکندر نامہ بحری من تصنیف حضرت مخدومی نظامی بوقت سہ پہر بروز سہ شنبہ بتاریخ بیست ونہم (29) شہر شوال در عمل نواب نام دار میر محمد افضل صوبہ دار اڈیشا سال 1120 عملی در مقام رگھوناتھ پور بدولت خانہ اجودھیا رام از خطِ خام ضیاء الدین نام تحریر یافت۔''

مذکورہ بالاشہادت سے اڈیشا کی کاروباری تہذیبی اور سرکاری زبان فارسی کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اڈیشا کے ہندوؤں میں بھی فارسی کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ مزید اس امر کی تقویت فارسی لغت کے ایک قلمی نسخے 'فرہنگ جانی' سے بھی ہوتی ہے۔ 1750 میں کٹک کے جان محمد نے یہ لغت مرتب کیا تھا۔ لغت کے آخری صفحے کی تحریر کے مطابق یہ نسخہ اڈیشا کے جگ موہن دیو کی ملکیت تھا۔

ڈاکٹر کنج بہاری ترپاٹھی نے اپنی کتاب (The Evalution of Oriya Language and Script) میں بہت سارے قدیم سنگی کتبوں کی اڑیا تحریروں میں عربی اور فارسی الفاظ کی نشان دہی کی ہے۔ ان کے مطابق ہندی یا ہندوستانی کے توسط سے سیمیٹک یا فارسی و عربی الاصل الفاظ چودھویں صدی عیسوی تک اڑیا زبان میں کثرت کے ساتھ داخل ہو چکے تھے۔ جب اڈیشا پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو عربی، فارسی کے بے شمار الفاظ تیزی کے ساتھ اڑیا میں مدغم ہونے لگے۔

(مذکورہ حوالہ ص 88)

برج ناتھ بڑجینا 1730 تا 1845، ابھی منیو سامنت سنگھار، 1757 تا 1806 اور بلدیو رتھ 1789 تا 1845 نے اپنی تخلیقات میں بے شمار فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اٹھارویں صدی کی تخلیق ستیہ نارائن پالا اور 'مغل تماشا' تو اس امر کا بین ثبوت اور دلیل ہیں جن میں اردو و فارسی زبان کے مکالمے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اڈیشا کے ہندوؤں میں بھی اردو فارسی مقبول رہی ہے۔ جیسا کہ کٹک کے ہردے رام جودت اڈیشا کا فارسی دان شاعر تھا جسے یہاں کے علمائے ادب اردو کا اولین شاعر شمار کرتے ہیں۔ دراصل یہ فارسی زبان کا ماہر شاعر تھا۔ وہ کٹک سے مرشدآباد جا کر وہاں نواب سرفراز خاں کے دربار سے منسلک ہو گیا تھا جس کا تذکرہ نساخ نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ عبدالرحیم احسن، ولد مولوی عبدالکریم 1854 متوفی 1936 جائے پیدائش اڈیشا کا مردم خیز علاقہ سونگڑہ ہے۔ آپ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ اردو کے ساتھ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ قطعات تاریخ کہنے میں احسن کو دست کمال حاصل تھا۔

ونود کانن گو نے اپنی تصنیف 'گیان منڈل' (اڑیا) میں تحریر فرمایا ہے کہ ''اڑیا زبان میں روزمرہ کی بول چال میں لگ بھگ پانچ ہزار اردو فارسی کے الفاظ شامل ہیں۔'' اسی طرح گوپال پر ہراج نے بھی اپنی کتاب 'آموگھر وروحال چال' اڑیا زبان میں لکھی ہے۔ اس کتاب میں بکثرت فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

مذکورہ بالا سطروں سے پتہ چلتا ہے کہ اڈیشا میں فارسی زبان و ادب کے پڑھنے لکھنے اور بولنے کا رواج قدیمی ہے۔ مگر آج اس سے بے اعتنائی کیوں برتی جا رہی ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ آج فارسی زبان کا تعلق روزی روٹی سے جڑا ہوا نہیں ہے، تو کیا ہوا اس کے کلاسیکی ادب کو ہم کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں؟ اور اس کے حصول سے بے رخی برت سکتے ہیں جس میں مذہبی علوم کا خزینہ موجود ہے اور جو ایک قدیم عالمی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ میں ہائی اسکول کے اردو مدرسین اور مدارس کے اساتذہ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ طلبہ میں فارسی تعلیم کے تئیں دلچسپی پیدا کریں، خود مطالعہ کریں اور بچوں کو پڑھائیں۔ سنسکرت ٹیچروں کی طرح فارسی کی وجہ سے ہم اردو فارسی کے اساتذہ کلاسیکل ٹیچر کہلاتے ہیں اور جن کے ساتھ ہائی اسکول میں مشاہرہ مساوی ہے۔ فارسی مشترکہ تہذیب بھی ہے اور مخصوص مذہبی ثقافت کی آئینہ دار بھی، اس کی بقا ہمارے تہذیبی ورثہ کی بقا ہے۔

■

Maulana Mutiullah Nazish
D/203, Sector-6, C.D.A
Cuttack- 700014 (Odisha)

ڈاکٹر یوسف صابر

ادب اور نفسیات

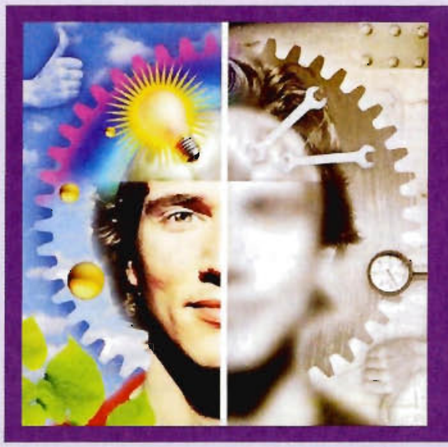

ادب، اپنی زبان کے سر کا تاج ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کو تشکیل پانے کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود ہر زبان کو ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ سنسکرت عربی اور فارسی کے صدیوں بعد اردو کی پیدائش ہوئی لیکن گیارہ بارہ سو سال میں اردو نے جس تیز رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کیں اس کی مثال کہیں اور بڑی مشکل سے ملے گی۔ آج اردو زبان کے پاس اپنے ادب کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے ادب کے مقابل اسے رکھا جاسکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر زبان کا ادب دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک حصہ نثر اور دوسرا حصہ نظم۔ اردو ادب بھی ان دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ اردو ادب کے ان دونوں حصوں سے تحقیق، تنقید اور لسانیات کی طرح نفسیات کا بھی اٹوٹ رشتہ ہے۔

علی گڑھ تحریک نے اُردو ادب کو قدیم اور جدید ادوار میں منقسم کردیا ہے۔ 1857 کے چند برسوں بعد جدید نظم اور جدید نثر کا جنم ہوا، ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، جدید ادب کے ہی چہرے ہیں۔ اردو ادب کے جدید دور میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث چھڑی جس کا خاتمہ ابھی بھی نہیں ہوا۔ ادب کو سماج کا آئینہ کہا جاتا رہا اور اب اسے سماج کا چہرہ کہا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ چہرہ سنوارا جاسکتا ہے۔ یہ کام آئینہ سے نہیں لیا جاسکتا کیوں کہ آئینے میں چہرے کے عیب و ہنر صاف نظر تو نہیں آتے ہیں لیکن وہ چہرے کو سنوار نہیں سکتا۔ ادب کو آئینے سے چہرہ بنانے میں بے شک نفسیات کا بڑا دخل ہے۔

نفسیات کا تعلق زندگی سے ہے۔ ادب میں اس کا داخلہ 'ادب برائے زندگی' کے راستے سے ہوا۔ زندگی جسم اور روح کا مرکب ہے۔ اس لیے نفسیات جسم کے ساتھ ساتھ روح کا بھی حصہ ہے۔ اردو ادب میں اسی بنیاد پر خارجیت اور داخلیت دونوں سے نفسیات کے گہرے تعلق کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

نفسیات کا مفہوم: نفسیات کیا ہے؟ نفسیات کی حقیقت کیا ہے؟ نفسیات کا انسانی زندگی اور علم و ادب پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ان سوالوں کے جوابات جاننے کے لیے آیئے ہم چند ماہر نفسیات کے اقوال سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''پہلے نفسیات کا مفہوم روح سے لگایا جاتا تھا لیکن تعریف غیر واضح تھی کیوں کہ ہمارے پاس اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں تھا کہ روح کیا ہے؟'' J.S. Ross

''نفسیات، انسانی برتاؤ اور انسانی رشتوں کا مطالعہ ہے۔'' Crow and Crow

''نفسیات کا تعلق طرزِ عمل کی سائنسی تفتیش سے ہے۔'' Mann

''نفسیات، طرزِ عمل اور تجربے کا علم ہے۔'' Skinner

''نفسیات کی سب سے اطمینان بخش تعریف انسانی برتاؤ کے علم کی شکل میں کی جاسکتی ہے۔'' Pillisbury

''نفسیات، اس انسانی فطرت سے متعلق ہے جس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔'' Garrison

''نفسیات، انسانی فطرت کا مطالعہ ہے۔'' Weld

''سب سے پہلے نفسیات نے اپنی روح کو چھوڑا پھر ذہن سے اجتناب کیا اور بعد میں شعور سے بھی پیچھا چھڑا لیا اور اب وہ برتاؤ کو قبول کرچکی ہے۔'' Wood Worth (درس و تدریس کی نفسیات، مصنف سید سردار احمد سجادی، صفحہ نمبر 8، 9، 10)

اوپر دیے گئے بیانات کا بغور مطالعہ کرنے پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نفسیات انسانی برتاؤ کے مشاہدے اور مطالعے کا نام ہے۔ ادب میں اس کا استعمال ناول نگار کے لیے بھی ہوتا ہے اور ناول کے لیے بھی۔ افسانہ نگار کے لیے بھی ہوتا ہے اور افسانے کے لیے بھی۔ اسی طرح شاعر کے ساتھ اس کی تخلیقات کے لیے بھی ہوتا ہے۔ غرض فکشن اور شاعری کی تہہ تک جانے کے لیے علمِ نفسیات انتہائی کارآمد ذریعہ ثابت ہوا ہے۔

ناول نگاری اور نفسیات: منشی پریم چند کے ناول 'بازارِ حسن' میں بھی طوائف کے کردار کو ناول کی ہیروئن 'سمن' کے ذریعے پیش کیا گیا، لیکن جو کامیابی مرزا رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' کو حاصل ہوئی وہ 'بازارِ حسن' کے حصے میں نہیں آئی۔ 'امراؤ جان ادا' طوائف کی زندگی پر لکھا گیا پہلا کامیاب نفسیاتی ناول اس لیے قرار پایا کہ اس میں مکالموں کے ذریعے انسان کے داخلی اور نفسیاتی کیفیت اور دلی جذبات کی بہترین عکاسی کرنے میں رسوا صد فی صد کامیاب ہے۔

عزیز احمد کے ناول 'ہوس'، 'مرمر اور خون' اور 'آگ' بھی نفسیاتی کیفیات کو کامیاب طریقے سے اجاگر کرتے ہیں مگر 'گریز' عزیز احمد کا زیادہ مقبول اور کامیاب نفسیاتی ناول ہے۔ گرچہ جنسیات کی بھرمار کی وجہ سے اُس پر اعتراضات بھی ہوتے رہے لیکن جس فنکارانہ بصیرت کا ثبوت عزیز احمد کی تحریر میں ملتا ہے، اس سے اعتراضات کا اثر کمزور پڑجاتا ہے۔ 1947 میں عصمت چغتائی کا شاہکار ناول 'ٹیڑھی لکیر' جسے سوانحی انداز میں پیش کیا گیا، نفسیاتی کشمکش کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر یوسف سرمست رقم طراز ہیں:

''اس میں ایک کردار کا مطالعہ بچپن سے جوانی تک اس تفصیل اور گہری نظر سے کیا گیا ہے کہ اردو ناول نگاری میں اس کا جواب نہیں ملتا۔ اس طرح بچپن سے جوانی تک اردو ناول میں کسی بھی کردار کا مطالعہ اتنی تفصیل سے اور اس قدر نفسیاتی ژرف نگاہی سے نہیں کیا گیا تھا۔''

(بیسویں صدی میں اردو ناول، 1995، صفحہ نمبر 401)

ناولٹ کی شکل میں 'بغیر عنوان کے' جسے اردو ادب کی تاریخ میں نظرانداز کردیا گیا۔ نفسیاتی ناولٹ کے لیے

بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ منٹو کے اس ناولٹ کے بارے میں ڈاکٹر یوسف سرمست کی رائے ہے:

''جہاں تک بعض نفسیاتی کیفیت کے اظہار کا تعلق ہے منٹو کا یہ ناول غیر معمولی اہمیت اور انفرادیت رکھتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے مرکزی کردار یا ہیرو کی جس طرح نفسیاتی تحلیل کی ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔''

(بیسویں صدی میں اردو ناول، 1995، ص 428)

افسانے اور نفسیات: اردو ادب کی تمام اصنافِ سخن میں نفسیات سے سب سے زیادہ قریب افسانہ ہے۔ افسانے کے فن میں انسانی زندگی کے اہم مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کو عمدگی سے سمویا جاسکتا ہے۔ جنسیات پر مشتمل اکثر افسانوں میں نفسیاتی کشمکش کا اظہار بھی ہوجاتا ہے۔ مفلسی، ظلم، بیروزگاری، فسادات، دیہاتوں کا معاشی بحران، کسانوں کے مسائل، شہری زندگی کے مسائل اور زنا بالجبر جیسے کئی موضوعات اکثر افسانوں میں نفسیات کے ترجمان بن جاتے ہیں۔

افسانوی مجموعہ 'انگارے' جنسی گھٹن اور نفسیاتی معنویت کے اظہار کا عمدہ نمونہ ہے۔ پریم چند نے اپنے کئی افسانوں میں نفسیاتی الجھنوں کو بغرض اصلاح نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے بعض افسانے جنسیات سے لبریز ہونے کے باوجود نفسیات کے اہم مسائل سماج کے روبرو رکھنے میں کامیاب رہے۔

افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے اپنے افسانوں میں نفسیاتی مسائل نہایت عمدگی سے پیش کیے ہیں، ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، سدرشن اور حیات اللہ انصاری کے علاوہ عصر حاضر کے عارف خورشید اور نور الحسنین بھی شامل ہیں۔

شاعری اور نفسیات: شاعری اور نفسیات کے رشتے کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید اختر رقم طراز ہیں:

''ناول اور افسانے سے قطع نظر تحلیل نفسی نے شاعری پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ میراجی اور ان کے اسکول کے دوسرے شعراء نے 'فرائڈ' کے اثرات کو براہِ راست قبول کر کے اپنی شاعری میں برتا۔''

ریاض احمد نے شاعری اور نفسیات کے رشتے کو اس طرح دکھلایا ہے، لکھتے ہیں:

''ماہرین نفسیات کی تحقیق کے مطابق شاعری کو انسانی شخصیت کا غیر متوازن اظہار قرار دیا جاسکتا ہے اور شعر کا مواد بھی خواب یا واہمہ کی طرح لاشعوری تحریکات کا نتیجہ سمجھا جائے گا۔''

شاعری کا تعلق خارجیت سے زیادہ داخلیت سے ہے اور جب داخلیت شدت اختیار کرلیتی ہے تو شاعر بھی نفسیاتی مرض کا شکار ہوسکتا ہے۔ میراجی اور ان کی طرح اشعار تخلیق کرنے والے کئی شعراء نفسیاتی الجھنیں سلجھاتے سلجھاتے خود ہی الجھ کر رہ گئے۔ اس کا ثبوت خود ان کی اپنی نظموں سے مل جاتا ہے۔

اردو ادب اور نفسیاتی تنقید: نفسیاتی تنقید کی ابتدا اور اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر وحید اختر کا مندرجہ ذیل بیان قابلِ مطالعہ ہے، کہتے ہیں:

''تحلیل نفسی کے اثر سے ادب کی نفسیاتی تنقید کا مکتبِ خیال بھی وجود میں آیا۔ نفسیاتی تنقید ادیب کی شخصیت کے لاشعوری اعمال اور ان کے اظہار پر زیادہ زور دیتی ہے اور کسی ادب پارے کے تحلیل و تجزیہ سے اپنے لاشعوری عوامل کا پتہ چلانے کی کوشش کرتی ہے، جو

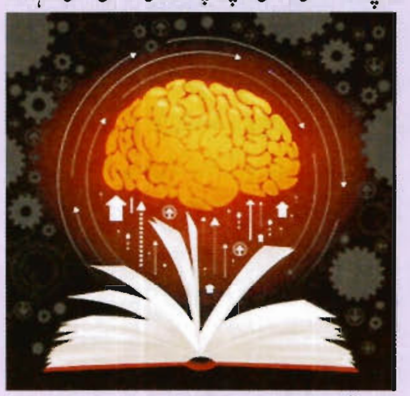

اس کی تخلیق کا محرک بنے اور اس کی تہہ میں کارفرما ہیں۔ تنقید کا یہ اسکول مروّجہ تنقیدی نظریات اور اصولوں کی بہت سی خامیوں کو دور کرتا ہے۔ یہ مکتب خیال ادب پارے کو زیادہ گہرائی میں جا کر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔''

(فلسفہ اور ادبی تنقید، 1972، ص 60)

نفسیاتی تنقید ادب کے لیے کارآمد ہے لیکن محنت طلب اور مشکل ہے۔ اس تنقید کو انجام تک پہنچانے کے بعد جو نتائج اخذ کیے جاتے ہیں وہ حیرت انگیز ہوتے ہیں جیسے ایک مستند ناقد نے فیض احمد فیض کی شاعری میں نرمی اور لوچ کے ہونے کے متعلق یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فیض احمد بچپن میں لڑکیوں کے ساتھ زیادہ رہے۔

عصمت چغتائی کے بارے میں ڈاکٹر یوسف سرمست تحریر کرتے ہیں کہ:

''ٹیڑھی لکیر، کو شاہکار بنانے میں بھی مصنف کی موضوع سے یہی مطابقت کام کر رہی ہے۔ عصمت نے خود اپنے 'ٹیڑھے میڑھے' کردار کو خارجی انداز سے 'ٹیڑھی لکیر' میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔''

(بیسویں صدی میں اردو ناول، 1995، ص 409)

ادب اور نفسیات کے دائرے میں ادبِ اطفال اور نفسیات اور ادبِ نسواں اور نفسیات کو بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ لیکن مقالے کی طوالت کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں صرف اس مقالے کے محاصل پر اپنے قلم کو روک دوں گا۔

ادب کے لیے شدت پسندی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ ادب میں نفسیات کا تعلق ادب کی مختلف اصناف سے بھی ہوتا ہے، ادیب سے بھی اور قاری سے بھی۔ ادیب نفسیات کے طبیب کے مانند ہوتا ہے لیکن مرض طبیب کو بھی ہوسکتا ہے، کیوں کہ وہ بھی انسان ہی ہوتا ہے۔

ادیب خود جب نفسیاتی مرض میں مبتلا ہوتا ہے تو ادب کے لیے نفع بخش تخلیق ہونے والے فن پارے نقصان دہ ثابت ہونے لگتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے پر ہمیں اس حقیقت کو ماننا پڑتا ہے۔ میراجی اور ان جیسے شعرا نے داخلیت کی شدت کے زیر اثر اپنی اکثر نظموں کو مہلک کردیا۔ سعادت حسن منٹو اور ان جیسے افسانہ نگاروں نے ایسے افسانے بھی تخلیق کیے جو سماج کے لیے مضر ثابت ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ سعادت حسن منٹو افسانے کے فن میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں مگر انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا غلط استعمال بھی کیا ہے۔ 'بو' اور 'ٹھنڈا گوشت' جیسے اور کئی افسانے خود منٹو نے بھی اور منٹو جیسے کئی افسانہ نگاروں نے بھی تخلیق کیے، جو خصوصاً نوجوانوں کے اخلاق کی گراوٹ کا سبب بن چکے ہیں۔ دورِ جدیدیت میں جب ادب پر داخلیت کا غلبہ طاری ہوا تو بے معنی علامتی اور تجریدی افسانوں اور بے تکی بے شمار نظموں سے ادب کے دامن کو بھرنے کی کوشش کی گئی، جو آخر کار ناکام ثابت ہوئی۔ چاہے داخلیت ہو یا خارجیت اعتدال پسندی ہی ادب کو صحت مند رکھ سکتی ہے۔ ادب کو نفسیات سے فائدہ پہنچانے کے لیے ادیبوں کو ماہرِ نفسیات کی طرح رہنا ہوگا، مریض بن کر نہیں۔ افسانہ نگار، ناول نگار اور شعرا عام لوگ نہیں ہوتے۔ ان کا لیول فلسفیوں کے برابر ہوتا ہے۔ ان کی باتوں پر زمانے عمل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی ذرا سی بھول لاتعداد انسانوں کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لیے نفسیات کو ادب پر حاوی کرنے کی بجائے ہمیں اسے ادب کے ماتحت رکھنا ہوگا۔ تبھی ہم ادب کو سماج کی اصلاح اور بھلائی کا ذریعہ بنا پائیں گے۔

■

Dr. Khan Yusuf Khan Jabbar, MSG. College Art, Science & Commerce Malegaon Camp, Distt. Nasik, Malegaon - 423203 (MS)

عبدالرشید خان

اردو ادب میں تذکرہ کشمیر

خدائے بزرگ و برتر نے وادی کشمیر کو کمال کے حسن و جمال سے اس قدر دلکش اور جاذب نظر بنایا ہے کہ دیکھنے والا متعجب ہونے کے ساتھ ساتھ سکون قلب اور اطمینان پاتا ہے۔ کشمیر کے خوبصورت پہاڑ، سرسبز گھنے جنگل، موسیقی پیدا کرنے والے آبشار، وسیع و عریض جھیل، رس دار میوے، پانی کے جھرنے، پھلواریاں، رنگ برنگے فلک بوس سفیدے اور سایہ دار چنار کے قدآور درخت اور برفیلی چادر سے ڈھکی چوٹیاں ہر دیکھنے والے کو مست و مدہوش کرتی ہیں۔

وادی کشمیر کے حسن و جمال اور تہذیب و تمدن کا تذکرہ سن کر دنیا بھر کے سیاح یہاں آتے رہے ہیں۔ سیاحوں نے یہاں کی خوبصورتی اور دلکشی پر سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں۔ بعض نے اپنے سفرناموں کو تذکرۂ کشمیر سے مزین کیا ہے، بعض افسانے اور ناول ضبط تحریر میں لائے اور کچھ ادبا نے نظمیں لکھ کر کشمیر جنتِ بے نظیر کے مناظر بیان کیے ہیں۔ مغل حکمراں جہانگیر یہاں کے مناظر قدرت سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اگر دنیا میں کوئی جگہ جنت کہلانے کی مستحق ہے تو وہ یہی وادی کشمیر ہے۔

ایران کے مشہور شاعر خواجہ حافظ شیرازیؒ نے اپنی شاعری کی اثر اندازی پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی شاعری لوگوں کو اس قدر متاثر کرتی ہے کہ سمرقند کے محبوب اور کشمیر کی حسینائیں کلام حافظ سن کر مصروف بہ رقص ہوتی ہیں:

به شعر حافظ و شیراز می گویند و می رقصند
سیاه چشمانِ کشمیری و ترکان سمرقندی

فارسی کے شہرت یافتہ شاعر عُرفی شیرازی نے کشمیر کی آب و ہوا کی تاثیر سے متعلق اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہاں کی آب ہوا اس قدر صحت افزا ہے کہ بھنا ہوا پرندہ بھی حیاتِ نو پا سکتا ہے:

ہر سوختہ جانی کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغِ کباب است با بال و پر آید

Sir Francis Young Husband نے کشمیر میں کچھ دیر قیام کرنے کے بعد یہاں کی خوبصورتی پر اظہار کرتے ہوئے وادی کشمیر کو یونان سے زیادہ خوبصورت گردانا ہے۔ البیرونی نے کشمیریوں کے نفسیاتی پیچ و خم کا جائزہ لے کر ان کی عادات، اطوار اور خصائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ Sir Walter Lawrence نے کشمیر کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ یہاں کی تاریخ و جغرافیہ سے متعلق اپنی رائے پیش کی ہے۔ Sir George Grierson نے کشمیری زبان کا رشتہ دارک گروہ کے ساتھ جوڑا ہے۔

دیگر قلمکاروں، دانشوروں اور مفکروں کی طرح اُردو ادیبوں نے بھی کشمیر کے حسن و جمال کا مختلف زاویوں سے ذکر کیا ہے۔ چوٹی کے شاعروں، ناول نگاروں، افسانہ نگاروں اور ڈراما نویسوں نے بے شمار ادب پاروں میں اس جنت بے نظیر کے ساتھ اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کو کشمیری نژاد ہونے کے ناطے اپنے مادر وطن کو جنت بے نظیر کہلانے پر انتہائی فخر تھا اور خود کو اس جانفزا باغ و جنت کا بلبل شمار کرنے پر مسرت کا اظہار کرتے تھے:

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اسی باغِ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

اقبال نے قومی یکجہتی کا پیغام عام کرتے وقت عالم انسانیت سے اپیل کی ہے کہ وہ لفظ کشمیر میں موجود حروف (ک ش م ی ر) کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر یکجہتی کا مظاہرہ کریں:

دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

علامہ اقبال کو وادی کشمیر کے ساتھ اس قدر گہری محبت اور لگاؤ تھا کہ انھوں نے پوری دنیا کو اس جنتِ بے نظیر کے

پہاڑوں، سبزہ زاروں اور لالہ ہائے چمن کا مشاہدہ کرنے کے لیے یہاں آنے کی دعوت کی ہے:

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بین لالہ چمن چمن نگر

چنانچہ کشمیر کے لوگ مہمان نوازی کے سلسلے میں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ یہ لوگ بلا امتیاز مذہب وملت، رنگ و نسل، فرقہ وعلاقہ اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے میں دل کی عمیق گہرائیوں سے دلچسپی لیتے ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف ملکی اور غیر ملکی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کیا ہے۔

کشمیری نژاد شاعر پنڈت برج نرائن چکبست نے اپنے ایک شعر میں کشمیریوں کی مہمان نوازی کی ستائش کرتے ہوئے یہاں کے ایک ایک ذرے کو مہمان نواز قرار دیا ہے۔ اُردو کی غزلیہ شاعری میں کشمیر کے موضوع پر غالباً اس سے بہتر شعر نہیں کہا گیا ہے:

ذرہ ذرہ ہے میرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

نازش پرتاب گڑھی نے اپنی نظم 'وادی کشمیر' میں اس خطہ ارض کو ہندوستان کا تاج اور راج قرار دیا ہے:

سلام وادی کشمیر رشکِ خطۂ نور
ترا جوار حسین ہے جواں ترے جمہور
تجھی سے خاک کی زینت تو ہی زمیں کا غرور
تجھی کو کہنے میں دھرتی کی مانگ کا سندور
سلام تجھ پہ کہ میرے وطن کا تاج ہے تُو
سلام تجھ پہ کہ ہندوستان کی راج ہے تو

یحییٰ اعظمی نے بھی اپنی نظم 'جنتِ رنگ و بو' میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

اے مری خلدِ رنگ و بو، اے مری جنت وطن
یہ ترا آب و رنگ ہے باعث زینت وطن
تجھ سے ہے عزت وطن، تجھ سے ہے عظمتِ وطن
ہے ترے دم سے گلشنِ دیر میں شہرت وطن
تیری رگوں میں ہے رواں کس کی بہار کا لہو
کس کے چمن کا فیض ہے یہ تیرا حسن رنگ و بو

اُردو کے جدید شعرا بھی اپنی تخلیقات میں کشمیر کے حسن و جمال اور یہاں کی تہذیب وتمدن کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ آج کل کشمیر سے متعلق تخلیقات میں شعرا اُن محرکات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جو یہاں کے امن وامان کو درہم برہم کرنے کے لیے ذمے دار ہیں۔ گزشتہ 25 سال کی سیاسی افراتفری کا آج کی شاعری پر گہرا اثر ہے جواں سال شاعر پروفیسر طارق تمکین کے درج ذیل شعر پر کشمیر کے سیاسی حالات کا اثر عیاں ہے:

تمھارا حسن گرچہ جلوۂ کشمیر جیسا ہے
ہمارا عشق بھی اب مسئلہ کشمیر جیسا ہے

اُردو اور ہندی کے شاعر آلوک شری واستو نے اپنی نظم 'کشمیر' میں کشمیر کی خوبصورتی اور یہاں کے دلفریب مناظر کو بیان کرنے کے بعد اُن حالات پر افسوس کا اظہار کیا ہے جو یہاں کے پرسکون ماحول کو اُداسی اور مایوسی میں بدلنے کے لیے ذمے دار ہیں۔ وہ اس بات کے معترف ہیں کہ گزشتہ بیس سال کی ابتر حالت کے باوجود وادیِ کشمیر دھرتی پر جنت کا منظر پیش کررہی ہے۔

کشمیر

پہاڑوں کے جسموں پہ برفوں کی چادر
چناروں کے پتوں پہ شبنم کے بستر
حسیں وادیوں میں مہکتی ہے کیسر
کہیں جھلملاتے ہیں جھیلوں کے زیور
ہے کشمیر دھرتی پہ جنت کا منظر

یہ جھیلوں کے سینے سے لپٹے شکارے
یہ وادی میں ہنستے ہوئے چاند تارے
یقینوں سے آگے حسیں یہ نظارے
فرشتے اُتر آئے جیسے زمین پر
ہے کشمیر دھرتی پہ جنت کا منظر

مگر کچھ دنوں سے پریشان ہے یہ
سیاسی نگاہوں سے حیران ہے یہ
پہاڑوں میں رہنے لگی ہے اُداسی
چناروں کے پیڑوں میں ہے بدحواسی
نہ کیسر میں کیسر کی خوشبو رہی ہے
نہ جھیلوں میں رونق بچی ہے ذرا سی
مگر دل ابھی بھی یہی کہہ رہا ہے
ہے کشمیر دھرتی پہ جنت کا منظر

اُردو افسانے کے بانی کار منشی پریم چند نے اپنے مختصر افسانے 'کشمیری سیب' میں سماج کے اندر پائی جانے والی بددیانتی اور بے ایمانی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ کہانی کار پریم چند خود پنجابی میوہ فروشوں کے بازار میں تمام میوؤں کے مقابلے میں گلابی رنگ کے کشمیری سیب محض اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ رس دار ہیں اور ان میں وٹامن اور پروٹین پائے جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ سیب کھانے والے کو ڈاکٹر کی بھی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

''سیب کے وِشے میں تو یہ کہا جانے لگا ہے کہ ایک سیب روز کھایئے تو آپ کو ڈاکٹروں کی ضرورت نہ رہے گی۔ ڈاکٹر سے بچنے کے لیے نمکوڑی تک کھانے کو تیار ہوسکتے ہیں۔ ہم نے دوکاندار سے مول بھاؤ کیا اور آدھ سیر سیب مانگے۔ دُکاندار نے کہا 'بابو جی بڑے مزے دار سیب آئے ہیں۔ خاص کشمیر کے۔ آپ لے جائیں، کھا کر طبیعت خوش ہوجائے گی۔''

(کلیاتِ پریم چند، حصہ 14، ص 564، مرتبہ مدن گوپال، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی)

سیب تو دنیا کے مختلف علاقوں میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن پریم چند سیب خریدنے کے لیے محض اس لیے تیار ہوتے ہیں کہ یہ خاص کشمیر کے ہیں۔ لیکن گھر پہنچ کر جب وہ سیب کھانے کو بیٹھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دُکاندار نے کشمیری سیب کے نام پر گلے سڑے سیب رکھ دیے ہیں جو بالکل کھانے کے لائق نہیں تھے۔

کرشن چندر نے کشمیر کی رومان پرور فضا کے پس منظر میں ہی افسانہ لکھنا شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں جھیلوں، گھنے جنگلوں، سرسراتی ہواؤں، مہکتے

پھولوں، لہلہاتے ہوئے مرغ زاروں، شمشاد و صنوبر، درختوں، چہکتے پرندوں، مہکتے باغوں، رقص کرتے ہوئے بادلوں، برف کی چادر اوڑھے پہاڑوں، زعفران زاروں، دھان کے کشادہ کھیتوں اور مختلف النوع میووں مثلاً اخروٹ، چری، ناشپاتی، سیب، بادام وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ کرشن چندر نے کشمیر سے متعلق کہانیوں میں ان عوامل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو جنتِ بے نظیر کو جہنم زار بنانے کے لیے ذمے دار ہیں۔ انھوں نے یہاں کی خوبصورتی کے پردے میں موجود غربت، حسرت و یاس، اقتصادی تباہ حالی، سیاسی افراتفری، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی من مانیاں، زمینداروں اور سود خوروں کی سنگدلی کو بھی محسوس کیا ہے۔ اس سلسلے میں 'جھیل سے پہلے اور جھیل کے بعد' کرشن چندر کی ایک مشہور کہانی ہے جس میں وہ لوگوں کے افلاس، غلامی اور کسمپرسی کے حالات پر دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔ کشمیر سے متعلق ایک اور کہانی 'بالکونی' میں کرشن چندر نے یکجہتی، پیار و محبت، ہمدردی اور دوستی کو موضوع بنایا ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہانی کے سارے واقعات، کشمیر کے ایک مشہور و معروف صحت افزا مقام گلمرگ میں واقع تین منزلہ ہوٹل فردوس کی بالکونی پر رونما ہوتے ہیں جہاں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ شفق کا منظر دیکھنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

''میں جس ہوٹل میں رہتا تھا اسے 'فردوس' کہتے تھے... میرا کمرہ درمیانی ہوٹل کے غربی کونے پر تھا اور اس کی بالکونی میں سے گلمرگ کا گالف کورس، نیڈوز ہوٹل اور دیودار کے گھرے ہوئے بنگلے اور اس کے پرے کھلن مرگ کا اونچا میدان اور اس سے بھی پرے الپتھر کی اونچی چوٹی نظر آتی تھی۔ گلمرگ کی شفق مجھے بہت پسند ہے اور یہاں سے تو شفق کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے بھی میں نے اس کمرے میں رہنا پسند کیا۔ بہت سے لوگ جو یوں ہی بے سوچے سمجھے کمرے کرائے پر لیتے تھے۔ بعد میں میری بالکونی کی طرف بہ اندازِ حسرت دیکھتے تھے اور اکثر مجھ سے اجازت طلب کر کے میری بالکونی میں غروبِ آفتاب کا نظارہ کرنے آیا کرتے۔''

(کرشن چندر اور ان کے افسانے، مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز، ص 216، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ)

افسانے کی دنیا میں تہلکہ مچانے والے کہانی کار سعادت حسن منٹو کشمیری نژاد ہونے پر فخر کرتے تھے۔ ان کو کشمیر اور کشمیریت کے ساتھ والہانہ محبت تھی۔ اگرچہ جوانمرگی نے منٹو کو کشمیر کو بچشم خود دیکھنے کا موقعہ فراہم نہ کیا لیکن ان کو یہاں کے حالات پر پوری نگاہ تھی۔ ان کی بیشتر تخلیقات میں کشمیر کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشی حالات کا ذکر ملتا ہے۔ کشمیر سے متعلق ان کی دو کہانیاں 'آخری سلوٹ' اور 'ٹیٹوال کا کتا' خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ منٹو نے اپنی کہانی 'بیگو' میں کشمیر کی خوشگوار آب و ہوا میں گرمیوں کے دن بسر کرنے کا اپنا ارادہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں لاہور سے گرمیاں گزارنے کے لیے کشمیر کی تیاری کر رہا ہوں۔ سوٹ سلوائے جارہے ہیں۔ بوٹ ڈبوں میں بند کیے جارہے ہیں۔ ہولڈال اور ٹرنک کپڑوں سے پُر کیے جارہے ہیں... کشمیر کی حسین وادی کی ہونے والی سیر کے خیالات میں مگن، لاری پر سوار ہوتا ہوں۔''

(کلیات سعادت حسن منٹو، پہلی جلد، ص 258، ترتیب پروفیسر شمس الحق عثمانی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی مارچ 2006)

پریم ناتھ پردیسی نے اپنی کہانیوں میں کشمیر کے ان حالات اور واقعات کا بخوبی ذکر کیا ہے جن کے وہ بذاتِ خود چشم دید گواہ تھے۔ ان کی کہانیوں میں کشمیریوں کے مسائل، ان کی خواہشات، دکھ درد اور کسمپرسی کی منظر کشی کی گئی ہے۔ 'جھنجھنا' میں پردیسی نے کشمیری پنڈتوں کے حالاتِ زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ 'بجھتے چراغ' میں ان حالات کی نشاندہی کی گئی ہے جنھوں نے جنت کشمیر کو دوزخ میں تبدیل کیا ہے:

''ہم مسکین ضرور ہیں مگر دولت کون پیدا کرتا ہے۔ اناج کون اُگاتا ہے۔ ریشم اور پشمینہ کون بنتا ہے۔ اس پر بھوکوں مریں، گالیاں کھائیں۔''

(پریم ناتھ پردیسی، عہد شخص اور فنکار، ڈاکٹر برج پریمی ایمہ ص 99)

حامدی کاشمیری کی کہانیوں میں کشمیر اور کشمیریت کے آثار جگہ جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہاں کے آبشار، فلک بوس پہاڑ، جھومتے ہوئے سفیدے، جنگل کے اونچے اونچے درخت وسیع و عریض جھیل، پُرکشش میوہ باغات، صبح صادق چہچہانے والے پرندے، پھولوں پر رقص کرنے والے بھنورے، بیرون ریاست اور خارجی ممالک سے آنے والے سیاحوں کی مستیاں اور شال بافی سے وابستہ بے شمار دلچسپ قصے کہانیاں ان افسانوں کی جان ہیں۔ ان کے افسانوں میں اگرچہ کرداروں کے نام فرضی ہیں لیکن جگہوں کے نام بالکل حقیقی ہیں مثلاً جھیل ڈل، نشاط، شالیمار، ڈلگیٹ، گلمرگ، پہلگام وغیرہ

''حامدی نے کشمیر کی کہانیاں لکھی ہیں۔ یہاں کا ماحول ان کے افسانوں میں ہر جگہ موجود ہے۔ مقامی رنگ نے ان کے افسانوں میں جان ڈال دی ہے۔ جنھوں نے کشمیر دیکھا ہے وہ حامدی کے افسانوں کے کرداروں کو یہاں کے ماحول میں ضرور پہچان لیں گے۔'' (دیباچہ 'وادی کے پھول' ص 4، پروفیسر شکیل الرحمٰن)

حامدی کاشمیری کے چار افسانوی مجموعے: وادی کے پھول، برف میں آگ، سراب اور شہرِ افسوس کشمیری تہذیب و کلچر اور ثقافت سے متعلق جانکاری دینے میں ممد و معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔

کرتار سنگھ دگل کا ڈراما 'دِیا بُجھ گیا' کشمیر کے سیاسی حالات سے متعلق ایک بہترین ادبی تخلیق ہے جس میں ایک کشمیری ماں اپنے اُس بیٹے کو قتل کروانے کا پروگرام ترتیب دیتی ہے جو دشمنوں کے ساتھ مل کر یہاں کے امن و سکون کے کھلیان میں آگ لگا کر ماحول کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔

■

Dr Abdul Rashid Khan, Head Department of Urdu, Government Degree College Beerwah Kashmir (J&K)

اشرف استھانوی

علامہ شبنم کمالی: حیات وخدمات

نئی صدی نے جن باکمال اصحاب علم وفن سے ہمیں محروم کر دیا اُن میں علامہ شبنم کمالی کا نام بہت نمایاں ہے۔ شبنم کمالی نہ صرف ایک قادرالکلام شاعر تھے بلکہ ایک ممتاز عالم دین، شیریں بیاں خطیب، انتہائی باصلاحیت اور شفیق مدرس کے علاوہ ایک بہترین منتظم بھی تھے۔

آپ کی پیدائش شمالی بہار کے ضلع مظفر پور (موجودہ ضلع سیتامڑھی) کے مردم خیز قصبہ پوکھریرا کے ایک علمی خانوادے میں 22 جولائی 1938 کو ہوئی۔ یہ سال ولادت تعلیمی اسناد کے مطابق ہے۔ حقیقی سال ولادت خودان کے بیان کے مطابق تقریباً پانچ سال قبل ہے۔ آپ کا اصلی نام مصطفیٰ رضا اور تخلص شبنم کمالی ہے۔ کمالی کی نسبت ولی کامل اور مرشد برحق حضرت مولانا ابو نصر احمد اللہ کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ہے، جن کا مزار مبارک پشاور پاکستان میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔ اپنی حیات میں وہ تقسیم ہند سے پہلے پوکھریرا تشریف لایا کرتے تھے کیوں کہ پوکھریرا اوراس کے قرب وجوار میں ان کے مریدین اور معتقدین کی اچھی خاصی تعداد بھی تھی۔ ایک بار حضرت جب پوکھریرا تشریف لائے تو مصطفیٰ رضا صاحب کے دادا منشی عبدالحق مرحوم انھیں دعائے برکت کے لیے حضرت کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت نے ان کے سر پر دست کرم رکھ کر بہت دیر تک دعائیں دیں اور اپنی بیعت سے بھی سرفراز فرمایا۔ اسی نسبت کے سبب آپ کے نام کے ساتھ لفظ کمالی کا اضافہ ہوگیا اور آپ کا پورا نام مصطفیٰ رضا کمال اور قلمی نام شبنم کمالی ہوگیا۔

شبنم کمالی نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کرنے کے بعد فارسی کی مکمل تعلیم اپنے والد بزرگوار مولانا حسن رضا کمالی سے حاصل کی۔ عربی کی ابتدائی تعلیم مولوی لطافت حسین سے حاصل کرنے کے بعد مدرسہ نور الہدیٰ پوکھریرا میں زیر تعلیم رہے۔ کچھ ہی دنوں بعد مدرسہ وارث العلوم چھپرہ بھیج دیے گئے۔ جہاں مدرسہ کے صدر مدرس حضرت مولانا شاہ حبیب اعظمی اور مولانا نعیم الدین کی سرپرستی اور خصوصی نگرانی میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ لیکن 1947 میں جب تقسیم ہند کے وقت فرقہ وارانہ فساد بھڑکا تو ان کے والد گھبرا کر چھپرہ پہنچ گئے اور انھیں واپس پوکھریرا لے آئے اور دوبارہ مدرسہ نور الہدیٰ میں داخلہ دلا دیا۔ جناب مولانا ولی الرحمٰن اور مولانا عظیم الدین سے عربی کا درس لیا۔ بعد میں آپ مدرسہ اسلامیہ عربیہ برہم پورہ میں داخل ہوئے جہاں آپ کو حضرت مولانا سید الزماں احمدی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ مولانا آپ کو بطور خاص درس دیا کرتے تھے۔ 1949 میں آپ نے فوقانیہ کا بورڈ امتحان پاس کیا۔ فوقانیہ پاس کرنے کے بعد مولوی درجہ کی تعلیم کے لیے آپ مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ دربھنگہ میں داخلہ لیا وہاں اس زمانے میں بڑے اچھے اساتذہ جمع تھے۔ صدرالمدرسین اور ناظم مولانا مقبول احمد خاں کے علاوہ مولانا مقبول احمد صدیقی، مولانا فیض الرحمٰن، مولانا عبد الجبار، مولانا عبدالحفیظ اپنے اپنے شعبے کے مسلم الثبوت اساتذہ تھے۔ یہاں سے آپ نے مولوی کا امتحان 1951 میں اول درجہ میں پاس کیا اور پورے بہار میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ 1953 میں اسی مدرسے سے عالم کا بورڈ امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد فاضل کی تعلیم کے لیے آپ نے بہار شریف کے مدرسہ عزیزیہ میں داخلہ لیا۔ مدرسہ عزیزیہ ان دنوں لائق و فائق اساتذہ کا مرکز تھا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا یوسف رمضان پوری، حضرت مولانا محمد حنیف، حضرت مولانا عبد اللہ ادیب بہاری، اور حضرت مولانا عبدالمتین سہروردی جیسے ممتاز علماء سے آپ نے کسب علم و فیض کیا۔ 1955 میں فاضل حدیث اور 1958 میں فاضل فارسی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

شبنم کمالی کی تدریسی زندگی کا آغاز 1954 میں مدرسہ اسلامیہ مظہر العلوم چھچھوا ضلع مدھوبنی سے ہوا۔ جہاں انھوں نے 1960 تک تدریسی فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد آپ نے تھوڑے دنوں کے لیے مدرسہ نعیمیہ چھپرہ میں بھی تدریسی فرائض انجام دیے۔ لیکن وہاں کی فضاراس نہیں آئی اس لیے مدرسے کے مہتمم حضرت مولانا نعیم الدین چھپروی علیہ الرحمہ سے اجازت لے کر مدرسہ وحیدیہ آرہ تشریف لے گئے جہاں انھوں نے تقریباً 4 برسوں تک صدر مدرس کے فرائض انجام دیے۔ 1963 میں مدرسہ اسلامیہ امانیہ لوام دربھنگہ آگئے اور نہ صرف اس ادارہ بلکہ پورے علاقے کی شناخت بن گئے۔ آپ نے بطور پرنسپل مدرسے کو ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے ترقی دی۔ 1963 میں جو مدرسہ صرف وسطانیہ معیار کا تھا وہ فاضل معیار کا ہوگیا اور عمارت بھی شاندار اور جاندار بن گئی جو آپ کی بے پناہ تعلیمی اور انتظامی صلاحیت کا مظہر ہے۔ شبنم کمالی اسی مدرسے سے سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے وقت پورا علاقہ سوگوار ہوگیا تھا جیسے کوئی بہت بڑی دولت ان سے چھن رہی ہو۔ بہرحال سبکدوشی کے بعد آپ دار العلوم فدائیہ خانقاہ سمرقندیہ دربھنگہ کے شیخ الحدیث بنائے گئے اور تاحیات اس عہدے پر فائز رہے۔

شعرگوئی کا سلسلہ 1957 میں شروع ہوا اس وقت شبنم کمالی مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ دربھنگہ میں زیر تعلیم تھے اس سلسلے میں شبنم کمالی خود لکھتے ہیں۔ جنوری 1951 کو میری شاعری کا نقطہ آغاز سمجھیے جب علقمہ شبلی اپنے والد گرامی مولانا عبد الجبار مدرس مدرسہ حمیدیہ کے ساتھ مدرسے میں قیام پذیر تھے۔ میں نے ایک دن چند اشعار کہہ کر علقمہ شبلی کو دوستانہ ماحول میں ہمت کرکے سنائے اور دکھائے۔ انھوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔

ان کے مطابق وہ اپنے بعض دیگر احباب کی نظموں اور غزلوں سے تحریک پاکر خود بھی اس نہج پر شعر کہنے اور سنانے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی شاعری کی خوشبو پھیلنے لگی۔ اور وہ شاعر کی حیثیت سے بھی حلقہ احباب میں مشہور ہونے لگے۔ ایک مرتبہ مدرسے میں اس وقت کے وزیر

تعمیرات حکومت بہار بیرسٹر شفیع صاحب تشریف لائے تو انھوں نے ایک استقبالیہ نظم کہی جس کے ایک شعر پر مدرسے کے ناظم اعلیٰ مولانا مقبول احمد خاں نے ایک اصلاح دی۔ شبنم کمالی کا شعر تھا:

کامرانی و خوشی نے چوم کر تیرا قدم
تیرے ہاتھوں میں دیا ہے اب وزارت کا علم

مولانا نے علم کی جگہ قلم لکھنے کا مشورہ دیا جس سے اس شعر کا درجہ خاصا بلند ہوگیا۔ شبنم کمالی نے باقاعدہ کسی استاد سے مشورہ سخن نہیں کیا اور نہ ہی اپنے کلام پر باقاعدہ اصلاح لی۔ بس اسی طرح کسی سخن فہم نے کوئی مناسب مشورہ دیا تو اسے فراخ دلی کے ساتھ قبول کرلیا۔

پہلا مشاعرہ 1952 میں سی ایم کالج دربھنگہ میں بزم ادب کے زیر اہتمام ایک طرحی مشاعرہ ہوا۔ یہ شبنم کمالی کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ انھیں مشاعرے کی اطلاع ملی تو خود کو روک نہیں سکے اور پہلی مرتبہ مائک پر آئے اور جب اپنی مترنم آواز میں غزل چھیڑی تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اسی بزم ادب کے زیر اہتمام سی ایم کالج میں ہی انعامی شعری مقابلے میں آپ نے ایک غزل پیش کرکے انعام حاصل کیا۔ غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

کانٹے ہیں کہیں راہ محبت میں کہیں گل
پھولوں کی جو خواہش ہے تو کانٹوں کی طرف دیکھ
طوفان حوادث میں نہ کر غرق سفینہ
اک گام پہ منزل ہے کناروں کی طرف دیکھ

بعد میں بہار شریف اور چھچھوا (مدھوبنی) میں قیام کے دوران شبنم کمالی کی شعری اور تخلیقی صلاحیتوں کو چمکانے میں زکی انور، محمود پرویز کاکوی، انجم جمالی، عصام الدین برق بہاری، رونق استھانوی، گرد بہاری اور طالب جلواروی کی صحبتوں نے اہم کردار ادا کیا۔ شبنم کمالی نے اپنی غیر مطبوعہ خود نوشت سوانح خوشبو لفظوں کی، میں اس بات کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

تلامذہ: علامہ شبنم کمالی کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ لیکن ویسے شاگردوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے بعد بھی فخر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ علامہ شبنم کمالی کے شاگرد ہیں۔ ایسے ممتاز شاگردوں میں ایک اہم نام پروفیسر خواجہ اکرام الدین ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا بھی ہے۔ وہ اپنے استاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خدا کا شکر ہے کہ ایسے عالم دین اور عاشقِ رسول کو نہ صرف میں نے دیکھا بلکہ ان کی شاگردی کا بھی مجھے اعزاز حاصل ہے۔ میں نے انھیں اپنے طالب علمی کے زمانے میں بار بار دیکھا۔''

علامہ شبنم کمالی کی تدریسی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ اکرام لکھتے ہیں:

''علامہ شبنم کمالی درس و تدریس کو پیشہ نہیں عبادت سمجھتے تھے اس لیے انتہائی پابندی کے ساتھ وقت مقررہ پر کلاس میں آجاتے۔ حالاں کہ اکثر و بیشتر جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کے لیے جاتے مگر ایسی ہی دعوتوں کو قبول کرتے کہ رات میں چل کر صبح سویرے مدرسہ پہنچ جائیں۔ انھوں نے کبھی ذاتی مصروفیات کے سبب کلاس نہیں چھوڑا۔ طالب علموں کا یہ حال تھا کہ ان کی کلاس کا انتظار کرتے تھے۔ مشکل سے مشکل مسائل تفسیر و فقہ کو اس طرح پڑھاتے کہ ذہن و دل میں نقش ہوجاتا۔''

(جام نور، نئی دہلی)

ایوارڈ و اعتراف: علامہ شبنم کمالی کو ان کی مثالی تدریسی خدمات کے لیے 1999 کے صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ صدر جمہوریہ کے آر نارائن کے ہاتھوں انھیں ملا تھا۔ مدرسہ منظر اسلام بریلی شریف نے بھی 2000 میں انھیں رئیس الاساتذہ کا ایوارڈ دیا۔ پٹنہ کی ایک علمی، ادبی اور ثقافتی تنظیم سلسلہ نے ان کی حیات میں ہی 30 اپریل 2000 کو شبنم کمالی کی شخصیت اور فن کے عنوان سے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا۔

تصانیف: شبنم کمالی کی مطبوعہ شعری اور نثری تصنیفات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ لیکن غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ اب تک ان کی جتنی کتابیں منظر عام پر آکر داد تحسین حاصل کرچکی ہیں ان میں انوار عقیدت، ریاض عقیدت، فردوس عقیدت، ضیائے عقیدت، نوائے دل، آؤ گیت گائیں، تنویر خیال، گیت گاتے رہو، گلہائے عقیدت، مینار عقیدت، صحرا بھی گلزار لگے، کمال النحو، کمال الصرف، قیام سلا دی شریعت اسلامیہ کی روشنی میں فقہ اور امام اعظم ابوحنیفہ، شمع ولایت (حضرت علاء الدین ماہر کی سوانح حیات) آئینہ جمال مصطفیٰ، شام وطن، علم کی دولت اور مقالات شبنم شامل ہیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں مذہبی، علمی و ادبی مضامین مختلف رسائل کی زینت بنے جنھیں ان کے لائق فرزند اور شبنم اکادمی کے صدر ڈاکٹر قمر ثاقب سمیٹنے کی کوشش کررہے ہیں اور جن کا اشاریہ ڈاکٹر محمد حبیب الرحمٰن علیگ نے تیار کیا ہے۔ غیر مطبوعہ تصنیف میں ان کی خود نوشت سوانح حیات کافی اہم ہے۔

سفر آخرت: علامہ شبنم کمالی کی پوری زندگی تعلیم و تعلم اور درس و تدریس سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی پڑھنے پڑھانے میں گزار دی اور کسی دوسری طرف پلٹ کر دیکھنا بھی پسند نہیں کیا اور ایک بامقصد اور کامیاب زندگی گزار کر مختصر علالت کے بعد 19 اگست 2004 کو 2 بجے شب میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی نماز جنازہ حضرت سید شاہ شمس اللہ جان مصباحی جانشیں خانقاہ سمرقندیہ نے پڑھائی اور انھیں اسی عید گاہ سے متصل جہاں انھوں نے 40 سال تک نماز عیدین کی امامت فرمائی، پوکھریرا قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔

شاعری: علامہ شبنم کمالی نے مختلف اصناف نظم و نثر میں طبع آزمائی کی۔ لیکن شعری اصناف میں حمد و نعت گوئی، غزل گوئی اور نظم گوئی پر اپنے فن کی بنیاد رکھی۔ آپ نے جب شاعری شروع کی تو وہ ترقی پسندی کا دور تھا۔ اس وقت شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے نظمیہ شاعری کو وسیلۃ المعیار نہ بنایا ہو۔ 1947 سے 1957 کا زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت جگر جیسے شاعر کو بھی اپنی غزلوں پر عنوان لگا کر رسائل میں شائع کرانے کی مجبوری پیش آئی تھی۔ اس وقت کسی بھی نئے شاعر کا نظمیہ شاعری کی طرف متوجہ ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ شبنم کمالی کی پہلی نظم جو مطبوعہ شکل میں ملتی ہے اس کا عنوان تازیانہ ہے۔ یہ نظم 54-1953 کے درمیان کلکتہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ معاون میں شامل ہوئی تھی۔ شبنم کمالی کے ابتدائی دور کی شاعری میں محبوبہ کے نام اور آرزوئے وصال کے عنوان سے دو رومانی نظمیں ملتی ہیں۔ فیض احمد فیض کی مشہور نظم ہے۔ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب

نہ مانگ۔ جس میں فیض اپنے محبوب سے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا کہہ کر انقلاب آفریں تبدیلیاں کر کے واپس آنے کی مہلت طلب کرتے ہیں۔ شبنم کمالی کی نظم محبوبہ کے نام کا بنیادی موضوع بھی یہی ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

میری محبوبہ میرے گلشن ہستی کی بہار
رونق بزم طرب روح وفا جان قرار
تیری آنکھوں سے جو پی لی تھی چرا کر میں نے
آج تک ہے مری رگ رگ میں اسی مے کا خمار

کیا کروں گردش ایام سے مجبور ہوں میں
اس لیے تجھ سے بہت دور بہت دور ہوں میں
چاہتا ہوں کہ تیرے پاس رہوں میں ہر دم
خواب تشنہ مرا اب تک ہے کہ مزدور ہوں میں

ابھی کچھ اور جلانا ہے امیدوں کا چراغ
پا ہی جاؤں گا کسی روز مسرت کا سراغ
صبر کر اے مری محبوبہ تو آنسو نہ بہا
جلد مل جائے گا رنج و غم دوراں سے فراغ

نغمۂ آزادی شبنم کمالی کی خاصی طویل نظم ہے۔ اس نظم میں جہاں وطن سے محبت اور وطن کے لیے جاں نثاری کے جذبے کا پتہ چلتا ہے وہیں مسلمانوں کے دلوں سے اس خیال کو دور کرنے کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ اپنے وطن کو ہرگز خیرباد نہ کہیں۔ یا خوف وفرار کی راہ اختیار نہ کریں۔ اس نظم کے مطالعے کے وقت مولانا آزاد کی 1947 والی جامع مسجد کی تقریر نظم کے پس منظر کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے:

سرزمین ہند کو ہم چھوڑ کر جائیں گے کیوں؟
خواب شیریں سے دل ناداں کو بہلائیں گے کیوں؟
روسیاہی مادر گیتی کو دکھلائیں گے کیوں؟
اس طرح ہم در بہ در کی ٹھوکریں کھائیں گے کیوں؟

شبنم کمالی کی ایک نظم ہے 'زخمی مسلمان نوجوانوں سے' یہ ایک یادگار نظم ہے جو 1985 میں مسلم پرسنل لا میں حکومت کی ممکنہ مداخلت کے خلاف پٹنہ میں ایک جلوس نکلا تھا جس میں بیشتر طلباء تھے اس جلوس پر پولیس نے فائرنگ کردی تھی جس میں بیشتر زخمی او رکچھ شہید بھی ہوئے تھے۔ اس حادثے پر شبنم کی یہ نظم ملاحظہ ہو:

تمھارے خون سے سرسبز ملت کا شجر ہوگا

ملا جو زخم تم کو رشک خورشید و قمر ہوگا
دعائیں ہر مسلمان کی تمھارے ہاتھ میں ہر دم
قدم آگے بڑھے گا جو تمھارا خواب تر ہوگا

غزلوں کے معاملے میں شبنم کمالی بنیادی طور پر روایت کے امین نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

مجھے بھول جانے والے تری بے رخی سلامت
غم عشق دینے والے تیری زندگی سلامت
تری یاد جب بھی آئی میرے دل نے یہ دعا دی
تو رہے جہاں میں شاداں تری ہر خوشی سلامت

یا یہ اشعار کہ:

چھوڑ دے تذکرۂ سود و زیاں آج کی رات
بے طلب سب کو ملا پیر مغاں آج کی رات
خوب جی بھر کے انھیں دیکھ تو لینے دو مجھے
جلد رخصت ہوئی جاتی ہے کہاں آج کی رات

لیکن غزلوں میں ان کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن سے ترقی پسندی اور جدت پسندی کے اشارے ملتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان اشعار میں بھی وہ شبنمی لطافت موجود ہے جو ان کا خاصہ ہے ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

جس کے ماتھے کے پسینہ سے تھا دھرتی کا سہاگ
مر کے بے گور و کفن آج وہ مزدور چلا
عروس بزم کے ہاتھوں کو بخشی ہے ضیاء ہم نے
ہمارے خون دل کا اور کیا پھر امتحاں ہوگا
موج بلا سے ڈرنے والے مقصد سے محروم رہے
عزم ویقیں کے متوالوں کی منزل ہے طوفانوں میں

شبنم کمالی کو نعت گوئی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ ان کے پانچ نعتیہ مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ انھوں نے نعت گوئی میں کسی احتیاط اور فنی چابکدستی کا مظاہرہ کیا:

کسی کا ناز تقویٰ پر کسی کا پارسائی پر
مجھے بس ناز ہے سرکار کی مدحت سرائی پر
مجھے امید ہے شبنم خدا سے اجر مانگوں گا
بہائے ہیں جو آنسو میں نے طیبہ کی جدائی پر

شبنم کمالی نے بچوں کے ادب کی تخلیق پر بھی پورا دھیان دیا۔ بچوں کے لیے مضامین اور سبق آموز کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ مگر ان کی نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بچوں کی نظموں پر مشتمل دو مجموعے گیت گاتے رہو اور آؤ گیت گائیں کے علاوہ ان کی نظموں کا ہندی ترجمہ گیت گاتا چل میں ان کا وہ سرمایہ محفوظ ہے۔

شبنم کمالی کی ان نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبنم بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں بچوں کی دلچسپی کا بھی بھرپور خیال رکھا ہے۔

حب الوطنی اور علم دوستی کی تعلیم دیتے ہوئے یہ اشعار بھی قابل توجہ ہیں:

ہر گھر میں محبت کی اک شمع جلائیں گے
نفرت کو عداوت کو دنیا سے مٹائیں گے
سوئے ہوئے انساں کو جو ہوش میں لے آئے
ہم ساز محبت پر وہ گیت سنائیں گے
ماں، باپ کو دیکھیں گے، عزت کی نگاہوں سے
ہم ان کے اشاروں پر سر اپنا جھکائیں گے

اتنے با کمال شاعر، ادیب اور شفیق استاد ہونے کے باوجود شبنم کمالی کو ان کی زندگی میں وہ حق نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ جس کا احساس انھیں تا عمر رہا اور اظہار نوائے دل میں اظہار حقیقت کے عنوان سے ہوا۔ لیکن اس کے باوجود انھیں اس بات کا یقین نہ تھا کہ:

یاد میں تیری لہو روئے گی دنیا شبنم
جب خبر ہوگی کہ وہ شاعر مشہور چلا

■

Ashraf Asthanvi
Faqeer Bara, Bankipur, Patna - 4 (Bihar)

رہنما شیخ

ایک نغمہ گر شاعر ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی کی فلمی نغمہ نگاری سے متعلق رہنما شیخ کا جو مضمون گزشتہ شمارے میں 'ایک نغمہ گر شاعر: ساحر لدھیانوی' (صفحہ 36 تا 38) کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس کا دوسرا صفحہ تکنیکی غلطی سے دوبار چھپ گیا اور آخری صفحہ نہ چھپنے کی وجہ سے مضمون ادھورا رہ گیا جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ مضمون میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے آخری صفحہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ اس سہو کے سلسلے میں ہمیں قارئین کے خطوط بھی مل رہے ہیں جس کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہیں۔ (ادارہ)

پچھلے صفحات میں میں نے فلمی گیتوں کا ذکر کیا ہے۔ آج کے دور میں فلم اور گیت ہماری زندگی، سماج اور تہذیب کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئے ہیں۔ کوئی بھی محفل تقریب اور تہوار فلمی گیتوں کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ہر بزم میں ان کا گایا جانا ناگزیر ہے۔ آج ہمارے بچے، طالب علم اور عام لوگ اپنی مذہبی شخصیات، فنکار اور مقامات سے اتنے واقف نہیں جتنے کہ وہ فلم، گیت، اداکار اور شاعروں سے واقف ہیں اور اس واقفیت پر فخر بھی کرتے ہیں۔

ساحر لدھیانوی ایک ایسے خوش قسمت شاعر ہیں کہ لوگ ان کے گیتوں کو بڑے شوق اور لگن سے سنتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی شاعری میں بے حد تلخی ہے اور یہ تلخی ان کے گیتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ فلمی گیت نگار کی حیثیت سے وہ اپنے گیتوں میں اپنے محسوسات، خیالات، جذبات اور تجربات پیش کرتے رہے ہیں۔

ہر چند کہ فلمی دنیا میں ان کی کامیابی کا راز ان کا مجموعہ کلام 'تلخیاں' ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنا سارا کا سارا مجموعہ فلموں کی نذر کردیا۔ اس مجموعے کی ہر نظم گیت کی صورت میں پیش کردی گئی۔ لیکن اس مجموعے کی نظموں کے علاوہ انھوں نے الگ سے جتنے بھی گیت لکھے وہ سب کے سب مقبول ہوئے۔ میں تو یہاں تک سمجھتی ہوں کہ تلخیاں کی نظموں کے مقابلے میں لکھے گئے یہ علیحدہ گیت بے حد کامیاب رہے ہیں اور ان گیتوں نے ساحر لدھیانوی کو ایک فلمی گیت نگار کی حیثیت سے شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔

ساحر لدھیانوی پر یہ الزام ہے کہ وہ صرف نظموں اور گیتوں کے شاعر ہیں۔ لیکن یہ الزام درست نہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ ہر چند کہ غزلوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی غزلوں کے وہ ایک اچھے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں گیتوں اور نظموں کی سی مٹھاس ہے، ترنم ہے۔ ان کی غزلوں میں درد اور سوز و گداز کی دھیمی دھیمی آنچ ہے۔ ان کی غزلیں جمالیاتی تجربہ ہیں۔ وہ الفاظ کی ہم آہنگی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں عصری حسیت، اجتماعی احساس اور انفرادی تاثرات کا فنی اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے جذباتی رشتوں اور زندگی کے حادثوں کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ وہ مسائل کو تہذیبی اور معاشرتی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ رمزیت و ایمائیت کے پیرائے میں عصری حقائق کو پیش کرنا انھیں پسند ہے۔ کھردرے حقائق کو نرم و نازک الفاظ دینا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ نازک خیالی، معنی آفرینی اور فضا آفرینی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

دکھ، درد، غم، اداسی اور تنہائی یہ جذبے ہر شاعر کے یہاں موجود ہیں۔ ان جذبوں سے گریز ناممکن ہے۔ ہر فرد یا شاعر کی زندگی میں کوئی نہ کوئی لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان جذبوں کا اسیر ہوجاتا ہے۔ ہر شخص دنیا میں تنہا آتا ہے اور تنہا ہی جاتا ہے۔ لیکن وہ درمیانی حصہ جسے ہم زیست کہتے ہیں تنہا نہیں گزارا جاسکتا۔ بے شمار لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی تنہائی کا دکھ جھیلنا آسان نہیں ہے۔

تنہائی ایک شدید احساس ہے۔ ساحر لدھیانوی کے یہاں زندگی کے جن جذبوں کی افراط ہے ان میں دکھ، درد، اداسی، تنہائی، کسک، چبھن اور دردمندی کی کیفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا احساسِ تنہائی زندگی کے کسی بھی موڑ پر ان سے علیحدہ نہیں ہے۔ ساحر لدھیانوی کے لہو کی اک اک بوند میں رچی ہوئی تلخی اور تنہائی نے اک ایسا شاعر دیا جس کی مثال اردو شاعری میں نہیں ہے۔ ان کی غزلیں پڑھ کر یہ اشعار بار بار گنگنانے کو جی چاہتا ہے:

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کردیا ترے دو دن کے پیار نے
میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کردیا ہے غمِ روزگار نے
ہوکر خرابِ مے ترے غم تو بھلا دیے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کرسکے
میں زندہ ہوں یہ مشتہر کیجیے
مرے قاتلوں کو خبر کیجیے
اے روحِ عصر، جاگ کہاں سو رہی ہے تو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے
تیرے لہو کی آنچ سے گرمی ہے جسم کی
مے کے ہزار وصف سہی، مے میں کچھ نہیں
پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو
اس طرف سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے
آج تک سلگتے ہیں زخم رہگزاروں کے
تم نے صرف چاہا ہے، ہم نے چھو کے دیکھے ہیں
پیرہن گھٹاؤں کے، جسم برق پاروں کے
بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم
کچھ اور بڑھ گئے ہیں اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم
لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم
تنگ آچکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم
لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم
ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں
ہمیں سے رنگِ گلستاں، ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں
عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی
وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن میں عکسِ شام ہے ساقی
مجھے معلوم ہے انجام رودادِ محبت کا
مگر کچھ اور تھوڑی دیر سعیِ رائیگاں کرلوں
وفا شعار کئی ہیں کوئی حسیں بھی تو ہو
چلو پھر آج اسی بے وفا کی بات کریں
تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

جہاں تک میں سمجھتی ہوں ساحر لدھیانوی کو اپنے ہم عصروں سے الگ اور بلند مقام حاصل ہے۔ ان کی شاعری زندگی کے ہر موڑ اور ہر رنگ سے گزری ہے۔ وہ ایک نغمہ گر اور ڈرامائی لمحوں کے شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

Rahnuma Shaikh, (Research Scholar), Dept of Urdu, UCSSH Mohan Lal Sukhadia University, Udaipur -313001 (Rajasthan)

مرزا جعفر حسین

پرانے لکھنؤ کی یادیں

اودھ پنچ اور بعض دیگر جرائد

زبان و بیان کی خوبیوں میں نکھار پیدا کرنے، عوام کے فطری جذبات کو صحیح اور کارآمد عملی شاہراہوں پر آمادہ کرنے، رجحانات و احساسات کی راست راہ نمائی کرنے، عوام میں قوتِ ارادی اور قوتِ عمل کو تقویت فراہم کرنے اور مظلوموں کے شکستہ دل کو سہارا دینے کے لیے صحافت ایک زبردست، موثر اور سودمند وسیلہ ہے۔ سیاسیات کے میدان میں صحافت کی بہت زیادہ کارفرمائی ہوتی ہے لیکن اخلاقیات و معاشیات کے مبادیات میں بھی اس فن کو کم اہمیت نہیں ہے۔ لکھنؤ کے قدیم معاشرے میں گو کہ سیاسیات کو خواص و عوام کی زندگی میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا لیکن صحافت کی افادیت اُس وقت بھی مسلم الثبوت تھی۔ تعیش اور فارغ البالی کے دور میں جب زندگی بسر کرنے کے انداز سہل انکاری پر قائم تھے سماج کو نئے رخ کی طرف اودھ اخبار ہی نے موڑ دیا تھا اور اس نئی ذہنیت کی تربیت میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد اور اودھ اخبار کی حالات زمانہ سے باخبر کرنے کی کوششوں کو دخل تھا۔ اِن دونوں کے صحت مند اثرات نے اُردو زبان کو نکھار دیا اور عوام کو متاثر کر کے اخلاق و کردار کو بلند کرنے میں سہارا دیا تھا۔

فسانۂ آزاد نے نہ صرف قدامت پرستوں کے لیے آسودگی و دلچسپی کا سامان فراہم کیا تھا بلکہ نوجوانوں میں بھی ناول بینی کا نیا مذاق پیدا کر دیا تھا۔ اسی مذاق کی بدولت ادیبوں اور نثر نگاروں نے بڑے بڑے شاہ کار پیش کیے جو مقبولِ خاص و عام ہوئے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے تاریخی ناول لکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمتِ پارینہ کی یاد تازہ کی اور ان میں نئے حوصلے پیدا کیے۔ بعض دوسرے فن کاروں نے بھی ناول لکھے جن کے صحت مند اثرات سماج کے اخلاقیات پر پڑے تھے۔ اُس زمانے کی معاشرت کی صحیح عکاسی مرزا محمد ہادی رسوا نے اپنے ناول 'امراؤ جان ادا' میں کی جو آج تک ناول نویسی کی دنیا میں ایک بلند پایہ شاہ کار ہے۔ اسی تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ یہی ناول پڑھنے کا شوق عوام میں پھیلا تو بازاری مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے سطحی اور پست تصنیفات بھی کثرت سے معرضِ وجود میں آئیں۔ رومان پرستی کی آسودگی کے لیے ویسا ہی ادب درکار تھا۔ یہ شوق شہر کے ایک ممتاز پبلشر مہادیو پرشاد ٹنڈن کے تجارتی کاروبار سے پورا ہوتا تھا۔ ان کے مطبوعہ ناولوں میں فکر و فن کی خوبیاں بہت کم تھیں لیکن سستی رومانیت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ ان ناولوں کی بدولت عوام میں بہت چہل پہل رہتی تھی اور ایک گونہ ادبی گرم بازاری بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ مثال کے طور پر ایک ناول کا یہ پلاٹ تھا کہ ایک نوجوان قیصر باغ کے چوراہے پر ایک پھول دار ریشمی رومال پڑا ہوا پاتا ہے جو اُس کے قیاس میں کسی حسینہ کا تھا، پھر وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ جس کا رومال اتنا خوب صورت تھا وہ خود کتنی حسین و جمیل اور نازک اندام ہوگی۔ اُس کے دماغ میں ایک حسن و جمال کا مجسمہ تیار ہوتا ہے اور اُس کی نظریں اس پری پیکر کے نظارے کے لیے بے تاب ہو جاتی ہیں معاً وہ نادیدہ معشوق پر عاشق ہو جاتا اور اس کی تلاش میں آوارہ گرد ہو کر جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتا ہے۔ یہ ناول اس زمانہ میں بہت پسند کیا جاتا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ زبان و بیان کے اسلوب اور منظر نگاری میں اُس کا پایہ بلند تھا لیکن پھر بھی اس کا شمار کسی بلند پایہ ادب میں نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ذوق باقی نہیں رہا اور ایسے کم تر درجہ کی تخلیقات نے اپنی جگہ بلند پایہ ادب کے لیے خالی کر دی۔ ایسے پست لٹریچر کا پھر بھی ایک مقام تھا کیوں کہ فکر و نظر نے اُسی زینہ کو طے کر کے رفعت حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ اردو زبان کو سنوارنے میں ایسے بے فیض ادب کا بھی گراں قدر حصہ تھا۔ ایسے ہی افسانے اُس زمانے کے اخباروں اور رسائل میں بھی شائع ہوتے رہتے تھے جن کی افادیت صرف اسلوب زبان تک محدود تھی۔

اودھ اخبار میں ابتداً زیادہ تر غزلیں اور افسانے جن کو رومانی کہانیاں کہنا زیادہ صحیح ہوگا، شائع ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ خبروں کی تعداد میں اضافہ ہوا مگر یہ خبریں بھی عموماً سرکاری یا سرکار سے متعلق ہوتی تھیں۔ سیاسیات کا ایسا کوئی شائبہ جو قومیت یا وطن پرورانہ رجحانات سے متعلق ہو، اس میں نہیں ہوتا تھا۔ البتہ شستگی زبان اور سلاست بیان اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نقشِ اول کے بعد پھر اور دوسرے نقوش بھی ابھرے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اخبارات و رسائل نے مذہبیات کو بھی اپنے موضوعات میں شامل کر لیا تھا۔ پھر بھی اخبار بینی کا کوئی قابلِ ذکر شوق شہر کی پرانی آبادی کو پیدا نہیں ہوسکا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران خواص و عوام اخبار پڑھنے کے شائق ہو گئے تھے۔ شبیر حسن قتیل مرحوم نے ستارہ جاری کیا تھا جو بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا تھا۔ اُس زمانے کے حالات کا دقیق نظر سے جائزہ لیا جائے تو کچھ ایسا محسوس ہوگا کہ غلام ہندوستانیوں کی رگِ حمیت پہلی بار پھڑکی تھی اور اُن میں غیر متعین اور غیر شعوری طور پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرا تھا۔ امرا و رؤسا کے درباروں میں جنگ کے اذکار سن کے کانوں پر ہاتھ دھر لیے جاتے تھے لیکن عوام کی زبان پر یہ شعر ورد رہتا تھا:

ہر طرح ہے شکست جرمن کی
بجز اس کے کہ بڑھے آتے ہیں

پھر بھی اُس زمانہ کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ باوجود فارغ البالی وارزانی اور امن و امان کے عوام کے لیے حکومتِ برطانیہ کا اقتدار ناخوش گوار تھا

اور اسی جذبہ کو سیارہ نیز بعض شعرا کی نظموں نے وقتی طور پر گرما دیا تھا۔ اس سلسلے میں ظریف کی ایک نظم جس کا مطلع یہ تھا، بہت زیادہ مرغوب خاطر تھی:

ہم لوگ ہیں افیونی جب رنگ جما دیں گے
جرمن تری توپوں میں ہم بانس چلا دیں گے

اِن جذبات کو پھر بھی کوئی دیرپا حیثیت حاصل نہیں تھی اور نہ عوام کے پیش نظر کوئی معینہ مقصد تھا جس پر ان کی تنظیم ہوسکتی۔ ان کے دلوں میں اُس وقت تک انتزاعِ سلطنت کا داغ تازہ تھا اور وہ انگریزوں کو ظالم و غاصب سمجھ کر اُن کے خائف تھے اور نفرت بھی کرتے تھے۔ تحریکِ خلافت نے پہلی بار انھیں جذبات کو ایک عملی دھارے میں موڑ دیا تھا۔

اس تجزیے کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے پرانے اخبار و جرائد نے اُردو کو فروغ دینے کے علاوہ اصلاحی اور تعمیری مبادیات میں کوئی گہرا نقش نہیں ابھارا تھا۔ البتہ ایک رسالہ اودھ پنچ ایسا تھا جس نے ادبی، معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور آگے چل کر سیاسی معاملات میں بھی راہ نمائی کی تھی اور اپنے دیرپا اثرات بھی قائم کیے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ طنز و مزاح کے سنجیدہ اسلوب کا اردو ادب میں اضافہ کردیا تھا۔ اس جریدے کو ابتدا ہی میں باصلاحیت مقالہ نگار مل گئے تھے اور یہی سلسلہ آخر وقت تک برقرار رہا تھا منشی سجاد حسین بانی اور ایڈیٹر تھے جن کے کلام اور بیان میں بلا کی شوخی بھری ہوئی تھی اور وہ خود بھی بہت خوش اخلاق اور ملنسار آدمی تھے۔ دوسرے مقالہ نگاروں میں مرزا مچھو، منشی احمد علی کسمنڈوی اور پنڈت تربھون ناتھ ہجر شامل تھے۔ ان میں کا ہر فرد عالم، فاضل اور بلند پایہ صلاحیت کا مالک تھا۔

مرزا مچھو بیگ طنز و مزاح کے ساتھ شیرینی زبان میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ منشی احمد علی فارسی ادب کے ماہر اور بذلہ سنج تھے۔ ہجر کو ہندی شاعری پر عبور حاصل تھا اور وہ ہندی اور اردو میں حسین امتزاج پیدا کرنے کے قائل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان جدا جدا خصوصیات کے ادیبوں کا یک جا ہوکر اپنے اپنے کمالات کے نمونے پیش کرنا اودھ پنچ کی ہردلعزیزی اور افادیت کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ یہ جریدہ بہت جلد بلند پایہ ادیبوں میں مقبول ہوگیا تھا، ادبیت کے ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی نے اُس کی دل کشی کو دوبالا کردیا تھا۔ علمی اور ادبی مباحثوں کے لیے اُس کے کالم مخصوص تھے، اس طرح باوجود ظرافت کے سنجیدگی کا جوہر بھی اُس میں شامل ہوگیا تھا۔

اودھ پنچ کا پہلا دور منشی سجاد حسین کے انتقال کے بعد ختم ہوگیا تھا۔ اُن کے ساتھی بھی ایک ایک کرکے راہیِ ملکِ بقا ہوگئے تھے۔ اس جریدے کی بقا کا مرحلہ بہت سخت تھا۔ اس مصیبت میں شیخ ممتاز حسین عثمانی مرحوم نے جو پہلے سے شریک کار تھے اس خدمت کو انجام دینے کا فریضہ قبول کیا۔ وہ منشی سجاد حسین کے دوست اور ہم مذاق بھی تھے۔ انھوں نے اپنی ادارت میں اس موقر اخبار کا وجود اپنی سابقہ افادیت سمیت برقرار رکھا۔ اسی زمانے میں راقم کو بھی ان کی ظریفانہ صحافت سے دل چسپی ہوگئی تھی۔ اخبار کا دفتر وکٹوریہ اسٹریٹ سے متصل دلالی محلّہ

میں تھا اور اُسی مکان میں شیخ ممتاز حسین عثمانی بھی رہتے تھے۔ شیخ صاحب مرحوم عقیدتاً شیعہ تھے لیکن اخباری مسلک تھا۔ شیعوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہوگیا تھا جو اپنے علم و عقل کے سرمایے کو تقلید کے آستانے پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، لہٰذا علمائے کرام سے اُن کا تصادم ناگزیر ہوگیا تھا۔ راقم کا تعلق بھی اسی جتھے سے تھا اور ہم سب کے سپہ سالار شیخ ممتاز حسین مرحوم تھے۔ اس طرح مذہبی رسم و رواج میں بھی اصلاح کے پہلو نکالنے اور اُن کی ترویج کرنے کے لیے اودھ پنچ ایک بڑا سہارا بن گیا تھا۔ شیخ صاحب کے قلم میں بانکپن تھا اور سپہ گری کی شان بھی تھی۔ بڑے بڑے فقہی مجادلے ہوتے تھے اور شیخ صاحب فاتحانہ انداز میں معرکہ آرائی فرماتے تھے۔

شیخ ممتاز حسین عثمانی تحریکِ خلافت کے زمانے سے گاندھی جی کے موید ہوگئے تھے۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جنھوں نے سب سے پہلے بدیشی اشیا کا استعمال اپنے اوپر ناجائز قرار دیا تھا اور لباس میں کھادی پہننا اختیار کرلیا تھا۔ اس سیاسی مسلک پر عامل ہونے کے باوصف اُن کی صحافتی دیانت داری نے اُن کو کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ اودھ پنچ کی معینہ پالیسی کو ترمیم کرکے سیاسیات بھی اُس میں شامل کردیں لیکن انھوں نے اس موضوع کو سماجی اور معاشرتی ڈھانچے میں پیش کرنے کا طرز نکال لیا تھا اور اخبار میں عالمِ ارواح سے جانِ عالم واجد علی شاہ کے خطوط بنام حکومت برطانیہ کا ایک سلسلہ مدت تک شائع کیا تھا۔ یہ خطوط نہ صرف دلچسپ بلکہ پرمغز اور دل گداز ہوتے تھے اور خواص و عوام سب ہی میں مقبول ہوتے تھے۔ اُن کا یہ اثر فی الفور ظاہر ہوگیا تھا کہ عمائدین کے یہاں نوجوانوں میں انگریزوں کے خلاف بے زاری کا جذبہ شدت کے ساتھ ابھر آیا تھا۔ اُس زمانے کے حالات کے تحت یہ بھی ایک گراں قدر کارنامہ تھا جس کو ہم وطن پرور تحریکات کا پیش خیمہ قرار دے سکتے ہیں۔ شیخ ممتاز حسین کا یہ کمال تھا کہ وہ اپنے قلم سے مفاد ملک میں زندگی بھر قومی تحریکات کی حمایت کرتے رہے لیکن پھر بھی سیاسیات سے علیحدگی کے مسلک پر آنچ نہیں آنے دی۔

شیخ صاحب ہفت خواں تھے۔ اُن کو اردو، فارسی، عربی، لاطینی، سریانی، انگریزی اور عبرانی زبانوں پر مہارت حاصل تھی۔ اوّل الذکر تین زبانوں میں کمال حاصل تھا۔ اسی ادبی مذاق و شغف کی بدولت ان کے دوستانہ تعلقات تمام عصر علما شعرا اور ادیبوں سے تھے جن میں ہر ایک ان کا احترام کرتا تھا۔ دبستانِ لکھنؤ میں شعر و شاعری کا وہ بہترین دور تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے درمیان بڑے بڑے مجادلے اور مباحثے بھی ہوتے تھے جن میں یاس عظیم آبادی کا تمام اساتذہ لکھنؤ کے خلاف مجادلہ اور چکبست و شرر کا گلزارِ نسیم سے متعلق مباحثہ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شیخ صاحب اور اودھ پنچ ان سرگرمیوں سے کنارہ کش نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانے سے متعلق اس جریدے کی فائلیں دلچسپ ادبی مطالعہ فراہم کرتی ہیں۔ شیخ صاحب کے دورِ کارکردگی میں منشی سجاد حسین کی ظرافت

یقیناً کارفرما نہیں تھی لیکن انھوں نے ایک مجدد کی حیثیت سے علمی مباحث کو ظرافت کے کوزہ میں پیش کیا تھا۔ یہ کارنامہ یقیناً بہت گراں قدر تھا اور اُس ادبی و معاشرتی خدمت کو وہ اپنی زندگی بھر جب تک کہ زبان میں گویائی اور قلم میں یارائی رہی انجام دیتے رہے تھے۔ تپِ دق کی بیماری لاحق تھی، منھ سے برابر خون آیا کرتا تھا، بخار کی شدت سے بے بس ہوجاتے تھے لیکن جب بھی افاقہ ہوجاتا جہادِ نفس میں کوتاہی نہیں کرتے تھے، اُن کی یہ خدمات یقیناً جہاد کی حیثیت رکھتی تھیں کیوں کہ ان کی بدولت ان کو ہر طرح کی صعوبتیں اٹھانا پڑی تھیں۔

اودھ پنچ کا ہم عصر اور مدمقابل ایک دوسرا جریدہ پیامِ یار، تھا جو بہت مقبول تھا۔ اودھ پنچ کا طرز طنزیہ و مزاحیہ تھا لیکن پیامِ یار سنجیدہ ادبی میگزین تھا۔ ایک زمانہ میں ان دونوں گراں قدر رسالوں میں زبردست تصادم ہوا تھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے یہ بحث چھیڑ دی تھی کہ مثنوی گلزارِ نسیم حقیقتاً خواجہ حیدرعلی آتش کی لکھی ہوئی تھی جس کو انھوں نے اپنے عزیز شاگرد پنڈت دیاشنکر نسیم کا مرتبہ بڑھانے کے لیے انھیں کے نام سے منسوب کردیا تھا۔ پنڈت برج نرائن چکبست فی الفور مقابلہ پر آمادہ ہوئے۔ دونوں جانب ہم نوا شاعروں اور ادیبوں کی ٹولیاں جمع ہوگئی تھیں۔ ایک مدت تک یہ ادبی معرکہ گرم رہا تھا۔ شرر کے دعوے کی دلیلیں پیامِ یار میں چھپتی تھیں جن کے جوابات مزاحیہ انداز میں اودھ پنچ میں شائع ہوتے تھے۔ وہ زمانہ لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں کے لیے بڑے لطف سے گزرا تھا۔ یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ طرفین میں کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوئی اور نہ کبھی کسی مضمون میں ذاتیات پر حملہ ہوا۔ فرقہ واریت کا شائبہ بھی نہیں آنے پایا۔ اُن مباحثوں میں اتنی افادیت تھی کہ جب مولانا مرحوم کی دیانت دارانہ طبیعت اور منصفانہ تحقیقی نظر نے چکبست کے دلائل تسلیم کرلیے تو ان تمام موافق و مخالف مقالوں کا مجموعہ کتابی شکل میں معرکۂ شرر و چکبست کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ختمِ بحث کے بعد یہ نظم یا غزل غالباً پیامِ یار ہی میں شائع ہوئی تھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا:

پیامِ یار نے دونوں کو رسوا کردیا

اسی دور کا ایک اور موقر بہت مقبول ماہنامہ 'دل گداز' تھا جو مولانا شرر نکالتے تھے۔ انھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی ادبی تخلیقات پیش کرنے کے لیے بیک وقت دو رسالے شائع کیے تھے۔ دوسرے کا نام 'مہذب' تھا لیکن یہ جریدہ بہت دنوں تک نہیں چل سکا۔ البتہ دل گداز سے مولانائے محترم کو قلبی لگاؤ تھا۔ وہ جب حیدرآباد تشریف لے گئے تھے تو وہاں سے بھی دل گداز جاری کردیا تھا پھر اُن کا اپنی ملازمت کے تحت لندن جانا ہوا تو یہ ماہنامہ بند ہوگیا مگر واپسی پر پھر تجدید کی۔ بالآخر جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو دل گداز اور لکھنؤ توام ہوگئے۔ مولانا شرر کو دل گداز سے اتنا والہگی اور اُس کی اشاعت کو بار بار جاری کرنے میں والہگی غالباً اس وجہ سے تھی کہ اُن کے تصنیف کردہ ناول بالاقساط اسی ماہنامہ میں ابتداً شائع ہوئے تھے۔ 'مہذب' میں تہذیب و اخلاق سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے اور علمائے اسلام کی سوانح عمریاں بھی پیش ہوتی تھیں جن کا واحد مقصد دین کے پردہ میں تعلیم اخلاق تھا۔ اس کے برعکس دل گداز میں پہلے ہی اُن کی معرکہ آرا تصنیف 'ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ' شائع ہوئی تھی جس نے نہ صرف مولانا کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا بلکہ اس ماہنامہ کو بھی بڑی شہرت اور ہردلعزیزی حاصل کرادی تھی۔ یہی شرف قبولِ اس صورتِ حال کا ضامن ہوا تھا کہ دل گداز متعدد بار بند ہوا اور پھر جاری ہوکر خواص وعوام میں مرجعیت باقی رکھ سکا۔ شاعر اور ادیب، علما اور فضلا اُس کی اشاعتوں کے منتظر رہتے تھے اور بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔

جس دور کا ہم تذکرہ پیش کررہے ہیں اُس زمانے میں بہت سے ہفتہ وار اور ماہنامے نکلے اور بند ہوگئے تھے۔ علم وادب کا اتنا ذوق تھا کہ جو جریدہ یا رسالہ شائع ہوتا، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتا۔ لیکن اُن سب کی بہار وقتی تھی اور اُن کی افادیت بھی دیرپا نہیں تھی۔ اُن کی اشاعتیں اردو ادب کی کچھ نہ کچھ خدمت ضرور کردیتی تھیں لیکن زمانہ تغیر پزیر تھا اس لیے تخلیقات بھی زوال پزیری پر آمادہ تھے، پھر بھی ماہنامہ 'الناظر' اور ہفتہ وار 'سچ' کا کچھ نہ کچھ ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اُن کی افادیت دیرپا تھی۔

'الناظر' کے بانی، مالک اور ایڈیٹر مولانا ظفرالملک تھے۔ اُن کا تعلق کاکوری کے ایک مقتدر مخدوم زادہ گھرانے سے تھا، ان کا اصل نام اسحاق علی تھا لیکن وہ اپنے تاریخی نام ظفرالملک ہی سے مشہور ہوئے۔ کاکوری اُس زمانہ میں علم وفضل کا مرکز تھا۔ مولانا کو مبدا فیاض نے علم وفضل کا ذوق دے کر پیدا کیا تھا اور وہ بچپن ہی سے درس وتدریس کے پرستار تھے۔ علوم مشرقیہ میں کمال حاصل کیا اور اپنے شوقِ سیر وسیاحت میں ہانگ کانگ گئے تو وہاں سے بی اے پاس کرکے لوٹے۔ اُس زمانہ میں بی اے پاس کے لیے بڑی ملازمت کا مل جانا سہل تھا لیکن اُن کی غیور طبیعت اور آزادانہ روش ملازمت کی لعنت قبول نہیں کرسکتی تھی۔ سفر سے واپسی پر انھوں نے اپنے کسبِ معاش کے لیے کتب فروشی کا پیشہ اختیار کیا اور ماہنامہ الناظر کا اجرا کردیا۔ ابتداءً اُن کا کاروبار وکٹوریہ اسٹریٹ پر قائم ہوا تھا لیکن آخر میں محلّہ جھوائی ٹولہ اپنے عزیز اور بے تکلف دوست خاں بہادر سید احمد حسین رضوی کی قربت میں منتقل ہوگئے تھے۔ فرض شناسی اُن کی طینت میں اور دیانت داری اُن کے خمیر میں شامل تھی۔ اس لیے وہ کتب فروشی کا کاروبار بہت خوش اسلوبی اور کامیابی سے چلاتے رہے لیکن الناظر سے بھی کچھ کم شغف نہیں تھا۔ مضامین کی فراہمی ان کی ترتیب و تدوین، کتابت و طباعت کے انتظامات، یہ جملہ امور پھر بھی اُن کے شایانِ شان تھے لیکن اشاعتوں کی کاپیوں پر نام اور پتے لکھوانا، ٹکٹ چسپاں کرنا اور اُن کو باحتیاط ڈاک خانہ بھجوانا یہ کام بھی انھیں کی نگرانی اور موجودگی میں انجام پاتے تھے۔

الناظر کا ثقافتی معیار بہت بلند تھا۔ کج بحثی یا ذاتیات تو درکنار، سطحی اور پست درجہ کے مضامین کو بھی اُس کے صحافت میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ مولانا ظفرالملک مناقشات سے خواہ وہ ادبی ہی کیوں نہ ہوں خود بھی دور رہنے کے قائل تھے۔ لیکن ایک وقت ایسا آگیا تھا جب وہ اس احتیاط کو برقرار نہیں رکھ سکے تھے اور اُن کا ماہنامہ انھیں کے دو دوستوں کے درمیان ایک ادبی معرکہ کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ ایک طرف اُن کے مخلص دوست اور مایہ ناز ادیب مرزا محمد عسکری مرحوم تھے اور مدمقابل اُن کے دوسرے دوست اور ہمسایہ اور بلند پایہ شاعر حکیم سید علی آشفتہ تھے۔ حکیم آشفتہ کی غزل کے ایک یا دو اشعار پر مرزا محمد عسکری ادیب نے عروضی اور ادبی اعتراضات وارد کیے اور اُن کے جوابات آشفتہ نے تحریر فرمائے۔ یہ دونوں مضامین الناظر میں شائع ہوئے تھے۔ لیکن بحث نے طول پکڑا اور دونوں جانب حمایتی ٹولیاں صف آرا ہوگئیں۔ مرزا محمد عسکری ادیب کی تائید میں اثر مرحوم، صفی مرحوم، شیخ ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ وغیرہم نے بہت اچھے اور فاضلانہ مقالے لکھے۔ اُن کے جواب میں اُس زمانے کے نوجوان شاعروں میں قریب قریب سب ہی نے بلند پایہ اور مہذب خامہ فرسائی کی تھی۔ یہ بحث تقریباً دو برس تک 25-1924 میں چلی تھی۔ ہر اعتراض بلند پایہ اور ہر جواب شستہ اور شائستہ ہوتا تھا۔ یہ معرکہ ادبی مذاکروں پر مشتمل تھا اور اس سلسلے میں ہر مضمون جو الناظر میں شائع ہوا تھا کارآمد اور گراں قدر تھا۔

آخرالذکر ہفتہ وار 'سچ' اُس زمانے میں جاری ہوا تھا جب لکھنؤ کا قدیم معاشرہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔

انگریزوں کا تسلط پوری طرح ہو چکا تھا اور ہندوستانیوں میں آزادی کا رجحان جنم لے رہا تھا، پہلی جنگ عظیم نے خفتہ قوم کو بیدار کر دیا تھا اور وطن پرستی کی امنگ کروٹیں بدل رہی تھی۔ انحطاط و زوال کے دور میں اخلاق کا پست ہو جانا فطری بات تھی اور لکھنؤ والے درسِ اخلاقیات کے محتاج ہو رہے تھے۔ ان حالات میں مولانا عبدالماجد دریابادی آگے بڑھے اور 1925 میں ہفتہ وار 'سچ' کا اجرا ہو گیا۔ لیکن ابتدا میں اس کے ایڈیٹر مولانا ظفر الملک تھے اور شریکِ ادارت مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالرحمن ندوی رہا کرتے تھے۔ پھر بھی یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ پہلے صفحہ پر 'سچی باتیں' کے عنوان سے مولانا عبدالماجد ایسے نوٹ لکھ دیا کرتے تھے جو بہت قبول تھے۔ اردو کے متعدد اخبار و جرائد انھیں اسی عنوان کے تحت نقل کیا کرتے تھے اور چوں کہ ہر نوٹ کے نیچے 'م' درج ہوتا تھا اس لیے ہر پڑھنے والا سمجھ لیتا تھا کہ قلم کاری مولانا عبدالماجد کی تھی۔ کچھ ہی مدت کے بعد 'سچ' کی تمام و کمال ادارت مولانا عبدالماجد کے حوالے ہو گئی تھی اور مولانا ظفر الملک محض ناشر اور مہتمم رہ گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انھیں تحریروں میں جو صفحہ اوّل پر شائع ہوتی تھیں سیاسی رنگ بھی چھانے لگا تھا۔ بعض صفحات میں اسلام کے خلاف حملوں کا جواب ہوتا اور مغربی تہذیب کے مضرتناک اثرات سے بچنے کی مسلمانوں کو تلقین بھی دی جاتی تھی۔ 'سچی باتیں' کچھ اس انداز سے لکھی جاتی تھیں کہ پڑھنے والوں پر گہرا اثر پڑتا تھا اور سیاسی تبصروں میں اتنی چستی اور صفائی ہوتی تھی کہ حکومتِ وقت کے لیے یہ ہفتہ وار ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ چنانچہ ضمانت طلب ہوئی جو داخل نہ ہو سکی اور اخبار بند ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد پھر جاری ہوا لیکن 1933 میں بالکل بند کر دیا گیا۔

1916 میں مہاراجہ سر محمد علی خاں والی محمود آباد نے روزنامہ 'ہمدم' جاری کرایا جس کی ادارت کے لیے سید جالب دہلوی کو منتخب کیا گیا۔ مہاراجہ مرحوم کی ذاتِ گرامی سے ملک و قوم کو بڑے بڑے فیض پہنچے تھے۔ وہ پکے نیشنلسٹ مسلمان تھے لیکن مسلمانوں کے ملّی مفادات کا تحفظ بھی ان کے نزدیک ضروری تھا۔ اُس وقت 'ہمدم' اخبار کو جاری کر کے انھوں نے ایک اہم سیاسی خدمت انجام دی تھی اور اُس کو اپنی ہی ملکیت قرار دے کر بڑی ہوشمندی کا ثبوت دیا تھا۔ اسی طرح اس اخبار کی ادارت کے لیے سید جالب مرحوم سے بہتر اور کوئی دوسرا صحافی نہ منتخب کیا جا سکتا تھا اور نہ کسی دوسرے کو منتخب کرنا دانش مندی کا تقاضا تھا۔

سید جالب دہلوی بے حد مہذب اور شائستہ بزرگ تھے، بلند پایہ ادیب اور گراں قدر صحافی تھے۔ بات کرنے کا خصوصیت کے ساتھ بہت اچھا سلیقہ تھا۔ شیخ ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ سے اُن کے مذاکرے بہت دلچسپ ہوتے تھے۔ دونوں طرف سے طنز و مزاح کا سلسلہ شروع ہوتا تو ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ یوں تو اعلیٰ درجہ کا صحافی ہوتے ہوئے اُن کا حافظہ بہت قوی تھا لیکن مرزا محمد ہادی رسوا کی طرح کبھی کبھی اُن کی یادداشت اتنا شدید دھوکا دیتی تھی کہ

حاضرین دنگ رہ جاتے تھے۔ مرزا رسوا کا یہ واقعہ میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ وہ ایک مرتبہ خود فراموشی میں یہ بھی بھول گئے تھے کہ امراؤ جان ادا خود انھیں کا لکھا ہوا ناول تھا۔ اسی طرح سید جالب کے بھول جانے کا یہ واقعہ اُس سے زیادہ حیرت خیز ہے، مرزا محمد عسکری ادیب کے یہاں ایک بار ماہ رمضان میں افطار صوم کی ضیافت تھی جس میں مولانا ظفر الملک، مولانا عبدالحلیم شرر، خان بہادر سید احمد حسین رضوی اور بعض دوسرے جلیل القدر حضرات مدعو تھے۔ میں بھی عزیز دارانہ تعلقات کی بنا پر مرزا صاحب کے یہاں ہر موقعے پر شریک رہا کرتا تھا۔ افطار صوم کا وقت آیا تو نماز باجماعت ہونا بھی ضروری تھا۔ سن و سال کی بزرگی کی بنا پر قرار پایا کہ سید جالب صاحب نماز پڑھائیں اور وہ راضی بھی ہو گئے۔ پہلی رکعت میں سورہ الحمد کے بعد جب دوسری سورت شروع کی تو چند آیتوں کے بعد آگے نہ بڑھ سکے۔ تکبیر کہہ کر رکوع اور سجود بجا لائے یہاں تک تو غنیمت تھا نماز باطل نہیں ہوئی تھی لیکن دوسری رکعت میں سورہ الحمد کی تیسری یا چوتھی آیت پر اٹک گئے اور ایسا اٹکے کہ کسی طرح آگے کی آیت یاد نہ آئی۔ لاحول کہہ کر اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور کسی دوسرے نے فوراً اقتدا کر دی۔ یہ واقعہ میرا چشم دید ہی نہیں بلکہ نمازیوں میں ایک صف میں خود میں بھی شریک تھا۔ اس مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ اس زمانے میں تہذیب و شائستگی کا یہ عالم تھا کہ جالب مرحوم کی اس غلطی پر کسی صف میں کوئی کھلبلی نہیں نمایاں ہوئی اور نہ کسی نے اُن کی بزرگی و عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی نکتہ چینی کی بلکہ اس ناسزاوار حرکت کو اُن کی ضعیفی اور کبر سنی پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ خود معصومانہ انداز میں خاموش ہو گئے تھے۔

منشی نول کشور

تصانیف و تالیفات کی اشاعت علوم کی ترویج کا ذریعہ ہوتی ہے اور اشاعت کا بہترین وسیلہ طباعت ہے۔ یہ سچ ہے کہ طباعت کو فروغ ہونے کے بعد خطاطی کا فن ختم ہو گیا جو یقیناً ایک حسین اور گراں قدر فن تھا لیکن دنیا کی تیز رفتار ترقی کے دور میں علم و ادب کی افادیت کو وسیع سے وسیع تر بنانے میں خطاطی زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ ایک اوسط درجے کے حجم والی کتاب کو خطِ نسخ یا خطِ نستعلیق میں لکھنے کے لیے کثیر وقت درکار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مخطوطے حاصل کرنا ہر شخص کی مقدرت میں نہیں ہو سکتا تھا۔ مالی اعتبار سے خوش حال لوگ ہی اس شوق کو پورا کر سکتے تھے۔ مخطوطے اگر مطلا اور مذہب نہ ہوں تب بھی بہ اعتبار اپنی ریاضت و مشقت کے اُن کی اجرت گراں ہی ہوتی تھی۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ کتابوں کی اشاعت کے لیے کوئی ایسا بندوبست ہو کہ علم کا یہ خزینہ ہر خاص و عام کے دسترس میں آ جائے۔

عہد قدیم میں ہر نئی ایجاد کو بادشاہ کی سرپرستی کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ غازی الدین حیدر کے عہد اور انھیں کی سرپرستی میں سب سے پہلا مطبع قائم ہوا تھا۔ اس مطبع کی ٹائپ کے حروف میں چھپی ہوئی کتاب موسومہ 'ہفت قلزم' ہندوستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ یورپ میں مقبول ہوئی تھی۔ اُس کے بعد دوسرا مطبع ان کے فرزند

اور جانشین نصیرالدین حیدر نے قائم کیا تھا۔ یہ ایک لیتھو پریس تھا جو ابتداً کانپور میں ایک انگریز مسٹر آرچر نے چلایا تھا۔ نصیرالدین حیدر نے پریس خرید کر لکھنؤ منتقل کرالیا اور اُس کے مالک کو ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ لیتھو پریس کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے خطِ معکوس کی ایجاد ہوئی اور اس ایجاد کا شرف بھی لکھنؤ ہی کو حاصل ہے۔ متذکرہ بالا دونوں چھاپے خانے قائم ہوجانے کے بعد پھر اس کاروبار کو تجارتی شکل میں دوسرے لوگوں نے بھی اختیار کرلیا تھا جو وقت کے ساتھ پھولتا پھلتا رہا۔ ان مطابع میں بہتر سے بہتر فن کار اور خوش نویس کام کرتے تھے، طباعت بہت دیدہ زیب ہوتی تھی، صنعت کاروں اور گل کاروں کے خوش نما نمونے پیش ہوتے تھے اور اس فن میں اتنی ترقی ہوگئی تھی کہ بعض چھپی ہوئی کتابیں بادی النظر میں مخطوطے معلوم ہوتی تھیں۔

شاہی دور کے آخر میں مطبع سلطانی بادشاہ کی ملکیت تھا۔ واجد علی شاہ بکثرت کتابوں اور مرثیو ں کے مصنف تھے۔ اُن کی تصانیف اسی مطبع میں طبع ہوتی تھی۔ فطری طور سے ان کتابوں کی طباعت پر خاص توجہ ہوتی تھی جس کے نتیجے میں یہ فن کاریاں دوسروں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ تھیں۔ اسی دور میں شہر لکھنؤ نے طباعت کے بہتر سے بہتر شاہ کار پیش کیے تھے۔ دست بردِ زمانہ سے جب زوال آنا شروع ہوا تو انیسویں صدی کے آخر تک طباعت کی بہت سی خوبیاں رفتہ رفتہ ختم ہوگئیں۔ خوش نویسی کا ذوق بھی گھٹتا گیا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے اوائل میں ایسے فن کاروں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی اور اب اردو طباعت کے سلسلہ میں کاتبوں کا مسئلہ مصنّفین اور ناشرین کے لیے شدید ترین دردِ سر بن گیا ہے۔ دورِ آخر کی یادگار مطبع نول کشور کے یہاں بھی طباعت میں کتابت کی پہلی سی خوبی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ مطبع اس لیے گراں قدر ہے کہ عہد قدیم میں اس ادارے نے علوم وفنون کی جلیل القدر خدمات انجام دی تھیں۔ اردو ادب خصوصیت کے ساتھ مطبع نول کشور کا اپنی اشاعت کے لیے مرہونِ منت ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ مطبع نول کشور کی سابقہ خدمات زریں حروف میں لکھے جانے کی مستحق ہیں۔ قریب قریب تمام مستند فارسی اساتذہ کے دیوان وکلیات اسی پریس نے شائع کیے تھے۔ اردو کے ہر شاعر کا کلام اسی مطبع میں چھپتا تھا۔ نثر ونظم کے فارسی اور اردو شاہ کاروں کی اسی مرکز سے اشاعت ہوئی تھی۔ قرآن پاک کے بے حد خوب صورت اور دیدہ زیب نسخے نول کشور پریس نے فراہم کیے تھے۔ دینیات کی کتابیں اور اورادو وظائف کی بیاضیں بھی اسی پریس سے مہیا ہوتی تھیں۔ میرانیس کے مراثی کی پہلی چار جلدیں سب سے پہلے نول کشور پریس ہی میں چھپی تھیں۔ اس مطبع کے مالکان نے طباعت کی صحت اور خوش نویسی پر پوری توجہ رکھی تھی اور اسی مقصد کے حصول میں قابل ترین افراد کو طباعت کی نگرانی پر مامور رکھا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں نوبت رائے نظر اور یاس عظیم آبادی ایسا جلیل القدر شاعر یہ خدمات انجام دیتے تھے اور آخری دور میں مرزا محمد عسکری ادیب کا ایسا بلند پایہ ادیب نگرانی کے فرائض پر مامور تھا۔ اتنے گراں قدر نگراں مقرر کرنے کی وجہ سے بلند پایہ کتابوں کی اشاعت بھی ہوا کرتی تھی اور اُردو میں تراجم بھی ہوجاتے تھے۔

مطبع نول کشور کے مالک بڑا اچھا ادبی مذاق رکھتے تھے اور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور انشاپردازوں کے بڑے قدردان تھے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ یاد آتا ہے کہ 1915 کی قیامت خیز بارش میں جب ہر شہری مصیبت میں مبتلا تھا اور اسی زمانے میں نواب نوبت رائے نظر نے یہ شعر کہا تھا:

لکھنؤ ہم پر فدا اور ہم فدائے لکھنؤ
کیا ہے طاقت آسماں کی جو چھڑائے لکھنؤ

تو مالک مطبع نے جو اودھ اخبار کے مالک بھی تھے اُن کو پچاس روپے اور ایک طلائی انگشتری ہدیتاً بھیجی تھی اور اودھ اخبار سے وابستہ کرلیا تھا۔

دور حاضر میں اس مطبع کو بھی مخالف طوفانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ فارسی زبان قریب قریب بالکل فراموش ہوچکی ہے۔ اردو اپنی بقا کے لیے کش مکش میں مبتلا ہے۔ دینیات کی کتابوں اور عربی کی کتب درسیہ کا بازار بھی سرد ہے۔ تجارتی اعتبار سے یہ تمام حالات مطبع نول کشور کے حق میں مخالف ہی ہیں جن کا مقابلہ ہندی کتابوں کی اشاعت سے کیا جارہا ہے۔ ممکن ہے کہ مالی خسارہ نہ ہو لیکن ہمہ گیر خصوصیت جو اس پریس کو پہلے حاصل تھی اب یقیناً باقی نہیں رہی۔ ان نقصانات کے علاوہ پہلے کے مقابلے میں ایک اور نمایاں فرق پیدا ہوگیا ہے۔ ایک مطبع دو حصوں میں تقسیم ہے اور تقسیم ہمیشہ مجموعی خوبی کو مجروح کردیتی ہے۔ بہرحال پرانے قدردانوں کو مطبع نول کشور کے نام ہی سے قلبی تعلق ہے اور ان کی یہ تمنا ہے کہ یہ مطبع اپنی سابقہ روایات وافادیت پر بحال ہوجائے۔ ایسا ہونا ممکن بھی ہے کیوں کہ اس مطبع کی ایک تاریخ ہے اور اس کے سابقہ مہتمم بالشان کارنامے دماغوں میں اب تک محفوظ ہیں۔ البتہ اس تمنا کا پورا ہونا صرف اسی حالت میں ممکن ہوسکے گا کہ اردو کو اس کا جائز حق پھر حاصل ہوجائے گا۔

گنگا پرشاد ورما

منشی نول کشور کے بعد بابو گنگا پرشاد ورما کی ذاتِ گرامی کی بدولت لکھنؤ کی ثقافتی زندگی کو بڑی بڑی سہولتیں ملی تھیں۔ موصوف ایک ممتاز شہری اور بڑے کامیاب وکیلوں میں تھے۔ نظیر آباد کی اُس سڑک پر جو خیالی گنج کی طرف جاتی ہے اُن کی محل سرا تھی اور کثیر جائداد از قسم نقد و جنس کے مالک تھے لیکن دولتِ اولاد سے محروم تھے۔ انھوں نے ایک ٹرسٹ قائم کیا اور اُسی کے تحت رفاہِ عامہ کے لیے ایک ہال تعمیر کرایا تھا۔ ایک اردو اخبار موسومہ 'ہندستانی اخبار' بھی نکالتے تھے اور ایک لائبریری بھی قائم کردی تھی۔ حسن اتفاق سے اُن کو پنڈت کشن پرشاد کول کا ایسا رفیق بھی مل گیا تھا۔ کول صاحب کی رہنمائی میں ٹرسٹ کے امور بہتر سے بہتر طریقے پر انجام پاتے تھے۔ لائبریری میں تمام جرائد اور اخبار آتے تھے اور ایک عظیم الشان ریڈنگ روم قائم تھا، ہر اچھی نئی کتاب خرید لی جاتی تھی۔ کول صاحب اسی عمارت میں زندگی بھر مقیم رہے اور گنگا پرشاد ورما کے انتقال کے بعد بھی سارا کاروبار انھیں کے منشا کے مطابق چلاتے رہے تھے۔ گنگا پرشاد ورما کے تعمیر کردہ ہال میں بڑے بڑے سیاسی اور غیر سیاسی اجتماعات ہوتے رہتے تھے اور اب بھی ہوتے رہتے ہیں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی میں یہ عمل ایک بڑی نعمت ہے اور وسط شہر میں واقع ہونے کے سبب سے ہر اجتماع بہت کامیاب ہوتا ہے۔

گنگا پرشاد لائبریری کا اب بھی شہر کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہے لیکن پرانے صحائف وجرائد کی فائلیں وغیرہ اب موجود نہیں ہیں۔ سنا گیا تھا کہ کول صاحب نے اپنے دور کارکردگی میں اس سرمائے کو لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں منتقل کردیا تا کہ طالبانِ علم اپنی تحقیق وتدقیق کے لیے حصول وسائل میں پریشان نہ ہوں اور دقت محسوس نہ کریں۔ مختصر یہ کہ اردو زبان اور اردو ادب کو ترقی دینے میں گنگا پرشاد ورما کا بھی ایک حصہ بلکہ بڑا حصہ تھا۔ آج بھی ان کی میموریل لائبریری میں اردو کتابوں کی معقول تعداد موجود ہے جن میں اکثریت بلند پایہ اور کارآمد تصانیف کی ہے اور یہ امتیاز کول صاحب مرحوم کی گراں قدر صلاحیتوں کی بدولت حاصل ہے۔

■

ماخذ: قدیم لکھنؤ کی آخری بہار: مرزا جعفر حسین، سنہ اشاعت تیسری طباعت: 2011، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ، اردو زبان، نئی دہلی

عابد علی خاں

پریم واربرٹنی

اپنے شعری مجموعوں کے آئینے میں

بیسویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب کے جن اُردو شعرا نے اپنی الگ پہچان بنائی ہے اُن میں ایک اہم نام پریم وار برٹنی کا بھی ہے۔ ممتاز محقق منیر نیازی کے بقول:

''پریم وار برٹنی کی شاعری ایک نامتّفق اور غیر گُسار عہدِ حیات کے سامنے ایک ہرے پتوں، ہم دردلوگوں اور حُسنِ دائم کے جہان کا خواب ہے، جب بستیوں میں انسانی رشتے بگڑ جاتے ہیں اور زمین آدمیوں کے لیے عذاب بن جاتی ہے تو اُن بُرے موسموں کی ضِد میں پریم جیسے شاعر پیدا ہوتے ہیں، بے معنی حیات کو معنی دینے کے لیے۔''

(میرے اندر ایک سمندر، ٹائٹل بیک)

پریم وار برٹنی کی پیدائش 9 نومبر 1930 کو سوہنی مہیوال کی بستی ڈنگا، ضلع گجرات (پاکستان) میں ہوئی۔ پریم زیادہ تعلیم تو نہ حاصل کر سکے لیکن ادب وسخن کا مذاق بچپن ہی سے تھا۔ تقسیم وطن کے بعد جب اُنھوں نے اپنے والدین کے ساتھ مالیر کوٹلہ کو اپنا وطنِ ثانی بنایا تو یہاں کے ادبی ماحول نے ان کے ادبی ذوق پر سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ مالیر کوٹلہ کی ادبی فضاؤں نے پریم کے حساس دِل کو شعر و ادب کی جانب متوجہ کیا۔ جہاں کی شعری محفلوں میں سیّد بشیر حسن بشیر، عبدالحمید خاں فرحت، بھگوان داس شعلہ، منظور حسن نامی، شہاب مالیر کوٹلوی اور کمال الدین کمال جیسے معتبر شاعروں کے دم سے کافی رونق تھی۔ اِسی ادبی ماحول میں پریم کا شعری ذوق بیدار ہوا اور وہ کمال الدین کمال کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

1950 میں اُن کی پہلی نظم 'آئینۂ جذبات' روزنامہ 'پرتاپ' میں شائع ہوئی جس نے ادبی حلقوں کو پریم کی جانب متوجہ کر دیا۔ 1955 میں اُنھوں نے ریڈیو کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اسی دوران وہ مغربی پنجاب کے دو ادبی جرائد 'خورشید' اور 'مستقبل' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ریڈیائی نشریات اور ادبی رسائل سے اُنھیں بہت شہرت ملی۔ کچھ عرصہ بعد وہ بمبئی تشریف لے گئے۔ جہاں رہتے ہوئے انھوں نے کئی فلموں کے لیے گیت لکھے، مگر فلمی دُنیا میں اُنھیں کوئی خاص مقبولیت حاصل نہ ہو سکی اور وہ جلد ہی بمبئی کو خیر آباد کہہ کر مالیر کوٹلہ چلے آئے۔ اپنی ادبی زندگی کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے پریم خود لکھتے ہیں:

''تقسیم وطن کے بعد میں سات برس تک مالیر کوٹلہ میں رہا اور یہیں کے ادبی ماحول میں میرے تخلیقی جذبے پروان چڑھے......شروع میں روزانہ اخبارات میں لکھا پھر 'بیسویں صدی' اور 'شمع' جیسے مقبول ماہناموں میں میری نظمیں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد خالص ادبی اور معیاری

رسالوں کی طرف رجوع کیا۔ دھیرے دھیرے 'شاعر'، 'افکار'، 'ادبِ لطیف'، 'سویرا'، 'نقوش' میں میرا کلام چھپنے لگا۔''

(آپ بیتی، میرے اندر ایک سمندر، صفحہ نمبر ح۔خ)

1976 میں پریم کا پہلا شعری مجموعہ 'خوشبو کا خواب' شائع ہوا جس کے ذریعے اُن کی شہرت کی خوشبو ہندوستان کے ساتھ ساتھ غیر ممالک میں بھی پھیل گئی۔ اِس مجموعے پر اُنھیں انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ اس کتاب کو اُنھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں 1955 سے 1970 تک کا کلام شامل ہے۔ اس حصے کا نام 'اُداس چناروں کی آگ' رکھا گیا ہے۔ جس میں 35 نظمیں اور 14 غزلیں شامل ہیں۔ اسی طرح کتاب کے دوسرے حصے میں 1970 سے 1975 تک کی شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔ جس کا عنوان 'نئے لہو کے گلاب' ہے۔ اس باب میں 27 نظمیں اور 15 غزلیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کا مطالعہ کرنے سے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ پریم نے اپنی زندگی کے دُکھ درد اور تمام تر پیچیدگیوں کو بڑے فنکارانہ انداز سے اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اُنھیں الفاظ کو خوبصورت انداز میں نکھارنے اور سنوارنے کا تخلیقی شعور تھا جو اس مجموعے میں بخوبی نظر آتا ہے۔ 'خوشبو کا خواب' کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ممتاز شاعر و محقق فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

''پریم وار برٹنی کے کلام میں حیات و کائنات کی دھڑکنیں سُنائی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں جلترنگ اور لہو ترنگ کا حسین امتزاج ہے۔ طرزِ بیان میں جاذبیت اور آواز میں خلوص کی خوشبو ہے۔ 'خوشبو کا خواب' پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم شاعر کو چھو رہے ہیں اور شاعر سے زیادہ ایک جیتے جاگتے حساس آدمی کو چھو رہے ہیں۔ ہم ایک ایسے کرب ناک دور سے گزر رہے ہیں جس میں اس رنگ کی شاعری سے ہماری داخلی زندگی کو بڑا سہارا ملے گا۔ میں وثوق سے کہنا چاہتا ہوں کہ 'خوشبو کا خواب' کی اشاعت ہمارے تخلیقی ادب کے لیے ایک نیا شگون ہے۔'' (میرا فن میرا لہو، ٹائٹل بیک)

1979 میں کئی اُردو اور ہندی ادبی رسالوں نے پریم وار برٹنی پر خصوصی نمبر اور گوشے شائع کیے۔ اسی سال اُن کی پنجابی شاعری پر مشتمل مجموعہ 'لال کھمباں دا گھر' شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل اُن کا پنجابی کلام پنجاب کے متمول تمدّن و ثقافت کا آئینہ دار ہے۔

ان دو مجموعوں کے علاوہ پریم کی زندگی میں اُن کا کوئی اور شعری مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔ کیونکہ شدید بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اُن کی طبیعت دِن بہ دِن بگڑتی

ہی گئی۔ بالآخر 11 اکتوبر 1979 کو وہ جہانِ فانی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ انتقال کے بعد اُن کی خواہش کے مطابق اُن کی آنکھیں دان کر دی گئیں۔ اِس طرح اُن کی یہ شعری پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوگئی:

دیتا رہوں گا روشنی بجھنے کے بعد بھی
میں بزمِ فکر و فن کا وہ تنہا چراغ ہوں

انتقال سے پہلے پریم جب تک بسترِ مرگ پر بیمار پڑے رہے اُنھوں نے کبھی بھی لکھنا پڑھنا نہیں چھوڑا۔ اُن کی اہلیہ پرجیت کور لکھتیں ہیں:

''شدید بیماری کے باوجود بھی وہ ہر وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ بستر مرگ پر پڑے پڑے بھی انھوں نے چند خوبصورت تخلیقات کو جنم دیا۔ جن میں سے ایک غزل 'ہم اگر جی نہ سکے' (جو کہ اُن کی آخری غزل ہے) اس بات کا ثبوت ہے کہ اُن کو اپنی زندگی سے زیادہ ادب سے پیار تھا۔''

(آپ بیتی، میرے اندر ایک سمندر، صفحہ نمبر ذ)

پریم وار برٹنی کے انتقال کے بعد 1981 میں اُن کا دوسرا شعری مجموعہ 'میرے اندر ایک سمندر' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔ اِس مجموعے کو اُن کی اہلیہ پرجیت کور اور ان کے داماد شِو کمار نے شائع کروایا۔ جسے بعد میں محکمہ السنہ کی طرف سے بہترین اُردو شاعری کے انعام سے بھی نوازہ گیا۔

''میرے اندر ایک سمندر' میں 63 نظمیں اور کچھ گیت بھی شامل ہیں۔ ان نظموں اور گیتوں میں اُنھوں نے رومانیت کے ساتھ ساتھ زندگی کی تلخ سچائیوں کو بڑے خوبصورت اشعار میں پرو دیا ہے۔ روانیِ زبان اور اندازِ بیان اِس قدر برگزیدہ اور سادہ ہے کہ ہر شعر دِل پر نقش کر جاتا ہے:

سجا کے اپنے خیالوں کی دُلہنیں جب بھی
میں اندھے وقت کے نیلام گھر میں آیا ہوں
کھُلا ہے راز کہ گیتوں کا کوئی مول نہیں
شعور بیچ کے فاقے خرید لایا ہوں

نظموں کے علاوہ 'میرے اندر ایک سمندر' میں 31 غزلیں بھی شامل ہیں۔ نظموں اور گیتوں کی طرح ان کی غزلیں بھی ان کے شعری شعور کی اہم پہچان ہیں۔ جن میں رومانیت کے ساتھ شعری حُسن، بچے تلے الفاظ، خیال کی تازگی اور زبان کی سادگی پائی جاتی ہے۔ اندازِ بیان دلکش اور اِس قدر والہانہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں ہر شعر کسی نگینے کی طرح جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے:

کاغذی ہاتھ ہمیں راس نہ آئیں شاید
اب کے مٹّی سے غزل کوئی اُگائیں شاید
پریم کیا دور ہے دِل سے بھی گراں ہیں پتھر
حسرتیں شیشے کے گھر اور بنائیں شاید

غزل کے حُسن کو شعلہ نفس ادائیں دو
خوشی سے بجھتی ہوئی آگ کو ہوائیں دو
مجھے عزیز ہے اُردو بھی اور ہندی بھی
مِرے دیار میں رہتی ہیں اپسرائیں دو

اِس طرح کے بے شمار اشعار پریم وار برٹنی کے مجموعۂ کلام میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اُن کے اکثر اشعار میں جمالیاتی کشش کا احساس ہوتا ہے اور اُن کے کلام میں دورِ حاضر کے متعدد سماجی مسائل کی بازگشت سُنائی پڑتی ہے۔ بقول ڈاکٹر بشیر بدر:

''پریم وار برٹنی سچّے اور خوبصورت احساسات کے شاعر ہیں۔ اُردو کے وہ ہزاروں شعر فہم کو براہِ راست محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں.....آپ کی شاعری

کو کسی نام نہاد تنقید کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے عہد کے دُکھ سُکھ کتنے خوبصورت زاویوں سے کتنے سجیلے اور البیلے انداز میں آپ کے یہاں شعری صورت میں نظر آتے ہیں۔ آپ کے بے شمار اشعار دِلوں کی دھڑکن ہیں اور روح کا نغمہ بھی۔''

(خوشبو کا خواب، ٹائٹل بیک)

پریم کو اپنے وطن اور تہذیب سے بے حد محبت تھی۔ بحیثیت پنجابی اُنھوں نے بہت سے ایسے اشعار کہے ہیں جن سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُنھیں پنجاب کی ثقافت اور تہذیب سے کس قدر لگاؤ تھا:

ایک مٹیلے پھول کی خاطر کچھ شمشیریں جمع کرو
دِل رانجھا ہے اس کے لیے پنجاب کی ہیریں جمع کرو

ایک نظم 'مٹیار' میں لکھتے ہیں:

تُو نہ دوشیزہ ہے کوئی نہ کوئی شہزادی
دُھول میں لپٹی ہوئی گاؤں کی مُٹیار ہے تُو
تیرے اَنفاس سے آتی ہے زمیں کی خوشبو
تیری رنگت ہے کہ گیہوں کی سنہری بالی
ماند ہے حسنِ سمرقند و بخارا تجھ سے
تیری رگ رگ میں رواں ہے تری دھرتی کا لہو
کہنے والے نہ کہیں کیوں تجھے الہڑ مٹیار
تو ہے پنجاب کے مستی بھرے کھیتوں کی بہار

1947 میں پنجاب دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ پنجاب کے شاعر جو نشاط آمیز شاعری کو سننے اور سنانے کے عادی تھے اچانک تقسیم وطن کے بعد ان کی شاعری اس دور کا مرثیہ بن گئی۔ بقول ڈاکٹر ناشر نقوی:

''راوی، جہلم، چناب، ستلج اور بیاس کی لہریں اب پانی کی نہیں آنسوؤں کے دریا لگنے لگے۔ تقسیم کی گرفت میں نہ ان دریاؤں کا پانی آسکا اور نہ پنجاب کی تہذیبی فضا، جس میں ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال کی آفاقی داستانیں مچل رہی ہیں وارث شاہ کی ہیریں اور بلھے شاہ کی وہ کافیاں بھی تقسیم نہیں ہوسکیں جو روحوں کو تازہ کرنے کا فریضہ پنجاب میں آج بھی نبھا رہی ہیں۔''

(تقسیم وطن کے بعد پنجاب میں اُردو شاعری، اُردو پنجاب اور سکھ شعراء، صفحہ 77)

تقسیم وطن کے سانحہ نے پنجاب کے شاعروں پر جو اثر مرتب کیا، وہ شاعری بن کر اُبھرا۔ پریم وار برٹنی کے حساس دل نے بھی اس کرب کو محسوس کیا۔ اُن کی ایک نظم 'خاک کی خوشبو شعر کی شبنم' اسی درد کا حصہ ہے۔ اِس نظم کو پڑھنے سے اندازا لگایا جاسکتا ہے کہ اُنھیں ہندوستان کے اور خاص طور پر پنجاب کے بٹوارے کا کس قدر غم تھا۔ اس نظم کے کچھ اشعار جو اُنھوں نے ہندو پاک کے سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ شاعروں و ادیبوں کو مخاطب کر کے لکھے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

بانٹ لے بے شک سیاست ہر گل و گلزار کو
شاعری کی خوشبوؤں کے خواب بٹ سکتے نہیں
مُلک بٹ سکتے ہیں، بٹ سکتی ہے تاریخ زمیں
آدمی کی عظمتوں کے باب بٹ سکتے ہیں
کون بانٹے گا ہمارے لوک گیتوں کی زباں
کون بانٹے گا ہماری دھڑکنوں کی داستاں
کون بانٹے گا بھلا اقرار حسن و عشق کے
کس طرح تقسیم ہوگی ہیر وارث شاہ کی
کس طرح بانٹیں گے ہم فیض و فراق و جوش کو

اے ادیبو، شاعرو، دانشورو، کچھ تو کہو
سوچ کر دو میرے اِن تیکھے سوالوں کا جواب
کون بانٹے گا بھلا شعر و اَدب کا انتخاب؟

1994 میں پریم وار برٹنی کا آخری شعری مجموعہ 'میرا فن میرا لہو' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا جسے اُن کی اہلیہ پرجیت پریم وار برٹنی اور ڈاکٹر سلطان انجم نے مرتب کیا۔ اِس مجموعے میں 45 نظمیں 10 گیت اور 18 غزلیں شامل ہیں۔ اُن کے پہلے مجموعوں کی طرح اِس مجموعے میں بھی غزلوں کے مقابلے نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ پریم کی نظموں میں انفرادیت بھی ہے اور رومان بھی۔ خواب زار، تلاش، تاج محل میں آ جانا، جگنو اور جوگی، ایک آواز، تم نے لکھا ہے، گہرے گھاؤ، ٹیلی فون گرل، مقدس راکھ اور میرے قلم کا لہو وغیرہ نظمیں رومانیت اور خوبصورت احساسات کی خوشبو سے معطّر نظر آتی ہیں۔ پریم وار برٹنی کی نظمیہ شاعری کے بارے میں ڈاکٹر روبینہ شبنم لکھتی ہیں:

''پریم کے مطبوعہ تینوں مجموعہ ہائے کلام 'خوشبو کا خواب'، 'میرے اندر ایک سمندر' اور 'میرا فن میرا لہو' میں غزلوں کی نسبت نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ جن کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ طویل نظم نگاری کو زیادہ پسند کرتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی جاندار نظمیں وہی ہیں جو مختصر یا آزاد ہیں۔ ان کی رومانوی نظموں میں حُسن و عِشق کے معاملات اور حقیقی جذبات کا خوبصورت انداز میں اظہار ہوا ہے۔ جن میں زندگی کے تجربات، سُکھ دُکھ اور دھوپ چھاؤں کے درد ناک پہلو بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔''
(پریم وار برٹنی: رومان وحقیقت کا سنگم، تنقیدی مطالعے، صفحہ 52)

یوں تو پریم وار برٹنی نے مختلف موضوعات اور خیالات کو اپنی نظموں میں سمویا ہے۔ لیکن ان کی نظموں میں رومان ہی کو اوّلیت حاصل ہے۔ 'تنہا تنہا' ایک رومانی نظم ہے جو شدتِ جذبات سے معمور ہے اور اُن کے رومان اور جذبات کی عکاس اور ترجمان ہے۔ نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

میرے گلدان کے سُوکھے ہوئے پھولوں سے تو پوچھ
تیرے ہاتھوں کی لطافت کو ترستے کیوں ہیں
کل تروتازہ و شاداب تھے تیری ہی طرح
آج مرجھا کے مرے ذہن کو ڈستے کیوں ہیں

پریم نے بہت سی آزاد نظمیں بھی لکھیں جیسے سفیر، دف بجاتی لڑکیاں، نئی مونالیزا، دبے پاؤں، مندر، اداکار، اور رات کی کائنات وغیرہ۔ انہی نظموں میں سے ایک نظم 'تعاقب' بھی ہے جس کے ذریعے وہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم آج جس دور سے گزر رہے ہیں وہاں انسان کو دوسرے انسان سے ہی خطرہ نہیں بلکہ اُس کا اپنا وجود بھی اُس کے لیے خطرہ بن چکا ہے:

زمیں خاموش تھی
چُپ تھے نظارے
ہوا نے سانس اپنی روک لی تھی
فضا میں چاندنی سی بہہ رہی تھی
سڑک سُنسان تھی
سوچوں کی لیکن
تھکے قدموں کی آہٹ کہہ رہی تھی
کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے
مگر مَیں گھوم کر پلٹا
تو دیکھا
کہ مَیں خود اپنے پیچھے آ رہا تھا

نظم ہو یا غزل یا پھر گیت پریم وار برٹنی نے ہر صنف میں زندگی کی تلخ سچائیوں کو شاعرانہ اور فنکارانہ انداز میں اس خوبی سے سمونے کی کوشش کی ہے جو انھیں کا حِصّہ ہے۔ اُن کی شاعری کے بارے میں جاں نثار اختر کے یہ جملے بہت معتبر ہیں:

''پریم وار برٹنی اُردو ادب کے معیاری شعرا میں سے ہیں۔ ان کی شاعری گنے چُنے موضوعات تک محدود نہیں بلکہ ایک ایسے دریا کی مانند ہے جس کی وسعت اور پھیلاؤ لامحدود ہے۔ غزل ہو، نظم ہو، چاہے گیت ان کی اپنی ایک آواز اور اپنا ایک لہجہ ہے جو الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ شاعری اتنے تنوع کے ساتھ اور اِتنے فنی رچاؤ کے ساتھ بہت کم شعرا کے حصّے میں آتی ہے۔ کلاسیکیت کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرنے میں پریم وار برٹنی نے جو رول ادا کیا ہے اس کی توفیق ہمارے بڑے بڑے شاعروں کو بھی نہیں ہوئی۔''
(میرا فن میرا لہو، ٹائٹل بیک)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پریم ایک نظم نگار شاعر تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے حسین خوابوں، محرومیوں اور ناکامیوں کو پُرکیف و پُرسوز سانچوں میں ڈھال کر اشعار کی شکل میں اِس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ اُن کا ہر شعر زندگی کا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی یہی خصوصیت انھیں اُردو شعر و ادب میں نمایاں بناتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے بارے میں کیا خوب کہا تھا:

کبھی تو کھل کے برس ابرِ مہرباں کی طرح
مِرا وجود ہے جلتے ہوئے مکاں کی طرح
میں ایک خواب سہی، آپ کی امانت ہوں
مجھے سنبھال کے رکھیے گا جسم و جاں کی طرح

پریم وار برٹنی بہت کم عمر میں ہی اس دُنیا سے ضرور رُخصت ہو گئے لیکن ان کا کلام اور نام ہمیشہ اُردو ادب میں زندہ رہے گا۔

حواشی، کتابیات و رسائل

1. خوشبو کا خواب: پریم وار برٹنی، پریم کتاب گھر، 1129، سیکٹر 9 سی، چنڈی گڑھ 1976
2. میرے اندر ایک سمندر، پریم وار برٹنی، پریم کتاب گھر، 1129، سیکٹر 9 سی، چنڈی گڑھ 1981
3. میرا فن میرا لہو۔ مرتبین: پرجیت پریم وار برٹنی، سلطان انجم، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1994
4. تنقیدی مطالعے، ڈاکٹر روبینہ شبنم، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2006
5. اُردو پنجاب اور سکھ شعراء، ڈاکٹر ناشر نقوی، پبلی کیشن بیورو، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ 1999
6. لاہور کا جو ذکر کیا، گوپال متل، یونین پرنٹنگ پریس، دہلی 1971
7. مالیر کوٹلے دی اُردو ساہت نوں دین (پنجابی رسم الخط) ڈاکٹر طارق کفایت اللہ۔ پبلی کیشن بیورو، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ 2003
8. پنجاب میں اُردو ادب (مجلّہ)، مرتب: پروفیسر زینت اللہ جاوید، نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ (پنجابی یونیورسٹی)، مالیرکوٹلہ 2002-03
9. ماہنامہ 'پروازِ ادب' (خصوصی شمارہ) 2003

■

Abid Ali Khan
Pandian, Maler, Malerkotla- 148023 (Punjab)

تسنیم فاطمہ

اردو ادب اور تیسری دنیا
سماجی سیاسی و تہذیبی محرکات

سائنسی ترقیات اور صنعتی انقلاب نے گزشتہ دو تین سو برسوں میں جس نئی دنیا کا خاکہ تیار کیا اس میں عمومی ترقیات، مالی وسائل اور سطح زندگی کے اعتبار سے اور بھی کئی آبادیاں سامنے آگئیں۔ ایک زمانے تک امریکہ اور سوویت یونین ایسے دو ترقیاتی اور فلسفیانہ اجارے تھے، جن کی وجہ سے دنیا کا ایک خطہ سیاسی اعتبار سے اشتراکی خیالات کا تابع مانا جاتا تھا اور دوسرا خطہ جاگیردارانہ تصورات کا حمایتی تھا۔ ان دونوں آبادیوں کے ساتھ دنیا کے چھوٹے بڑے ایسے سیکڑوں ممالک تھے، جنھیں بھوک اور افلاس سے مقابلہ کرنے کے لیے سڑک پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ سماجی علوم کی اصطلاح میں ایسی پسماندہ اور اپنے تحفظ کے لیے جدوجہد کررہی آبادیوں کو 'تیسری دنیا' کا نام دیا گیا۔

اس کے باوجود ایک اہم سوال جو بار بار سر اٹھاتا ہے وہ یہ ہے کہ اصل میں 'تیسری دنیا' ہے کیا؟ اس کا وجود کس طرح سامنے آیا؟ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ تیسری دنیا کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی وثقافتی شناخت کے لیے جدید نوآبادیاتی نظام پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انگلستان اور فرانس کے انقلاب نے جہاں جاگیردارانہ نظام کو پسپا کیا وہیں سرمایہ دارانہ نظام کو استحکام بھی بخشا اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے ایشیا، افریقہ اور امریکہ پر اپنا اقتدار جمالیا لیکن شمالی امریکہ کا جنوبی امریکہ پر تسلط قائم ہونے کے باعث جب مغربی سامراج وجود میں آتا ہے تو مغربی سامراج کے استحصال کا شکار تیسری دنیا کے ممالک ہونے لگتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری جنگِ عظیم ہوتی ہے اور مغربی سامراج اپنی طاقت کھو دیتا ہے دوسری طرف تیسری دنیا کے مفلوک الحال عوام اپنے حقوق کے حصول کے لیے صدائے احتجاج بلند کرنے لگتے ہیں لیکن یہ سامراجی طاقت بظاہر تو تیسری دنیا کے ممالک ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ کو آزادی دے دیتی ہے اور اپنی فوجیں ہٹالیتی ہے لیکن سامراجی طاقت کا تسلط تیسری دنیا کی معیشت پر قائم رہتا ہے۔ اسی سامراجی طاقت کو جدید نوآبادیاتی نظام کہا جاتا ہے۔ غرض کہ مغربی سامراج اور اس مغربی سامراج کا جدید نوآبادیاتی نظام کی شکل میں تیسری دنیا کے ممالک کا جو استحصال ہوتا ہے اس کا منظر نامہ بہت ہی دردانگیز ہے کیوں کہ اس استحصال کے سبب تیسری دنیا کے لوگ قیدوبند کی زندگی جینے پر مجبور ہوئے۔ ان کے پاس وہ وسائل میسر نہیں جو زندگی کو خوشنمائی بخشتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ زندگی کی ضروریات سے بھی یہ محروم ہیں۔ جس کے باعث سیاسی سماجی تہذیبی وثقافتی ہر اعتبار سے یہ پسماندگی کے شکار ہیں۔ مناسب لگتا ہے کہ تیسری دنیا کے متعلق چند اہم اہل قلم کے خیالات بھی نقل کیے جائیں تاکہ صورت حال زیادہ واضح ہوسکے۔ مرزا حامد بیگ کا خیال ہے:

''ایک عافیت کا گوشہ، کچاپکا مکان، اس کے سامنے چھتنار درخت اور اس کی طرف نکل جانے والی بل کھاتی پگڈنڈی۔ بذات خود ایک دلچسپ تجربہ۔ لیکن اسی راستے پر آجانے کا روز کا تجربہ رفتہ رفتہ ہمیں ہر چیز کا عادی بنادیتا ہے... زندگی کی امنگ رفتہ رفتہ مفقود ہوتی چلی جاتی ہے۔

تیسری دنیا کی بہت بڑی آبادی اسی خود کار عمل کا شکار ہوئی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں کبھی دائیں، اور کبھی بائیں کے نام پر یکجا کرتے ہوئے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ٹکڑا ٹکڑا کر Exhaust کردیا گیا ہے۔

انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ حکمران ٹولے ایک دوسرے کو تحفظات دیتے چلے آتے ہیں۔ تقریر کچھ ہے اور عمل کچھ۔ وہی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی۔ انقلاب۔ انقلاب۔ چیخ کر گلے بیٹھ گئے۔ کچھ نہ بدلا۔ وہی کلہاڑی اور وہی کلہاڑی کا دستہ۔ اور سامنے نئی ضروریات کا جمِ غفیر۔''

('تیسری دنیا کا افسانہ': مرزا حامد بیگ ص 32-31)

اس سلسلے میں عتیق احمد مزید لکھتے ہیں:

''اس نادار اور نااہل دنیا اور 'عالم الفقیر' کے سنہرے چوکھٹے میں جڑی اس تصویر کی لکیروں دائروں زاویوں اور پیچ وخم کے اندر اس کا سوچنے والا ذہن، دیکھنے والی آنکھیں اور اپنی عالمی ناداری نااہلی اور فقیری پر دھڑکنے والا دل بھی ہے۔ اس ذہن، ان آنکھوں اور اس دل کا ایک جسمانی ہیولا بھی ہے جس میں یہ ذہن یہ آنکھیں اور یہ دل قدرت نے جڑ رکھے ہیں۔ اس ہیولے کے پاؤں بھی ہیں اور ہاتھ بھی اور ان کے ہاتھوں میں قلم ہے جو اس کی آنکھوں کی دید، ذہن کی سوچ اور دل کے دکھوں کو صفحۂ قرطاس پر انمٹ روشنائی سے رقم کرتا رہتا ہے، جو 'تیسری دنیا' نامی بلڈنگ کے نئے مالک کے پسندیدہ کرایہ داروں کے شب خون کے عواقب اور نتائج کو نیز خود نئے مالک کے اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور علمی شب خون کی ڈھکی چھپی نیتوں کو طشت ازبام بھی کرتا رہتا ہے۔''

(رودادِ ستم (تیسری دنیا کا منظوم فسانۂ درد) ثاقب رزمی، پیش لفظ، عتیق احمد ص16)

مندرجہ بالا اقتباسات کے توسط سے عتیق احمد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تیسری دنیا کا وجود غالب اور مغلوب، صالب اور مصلوب کی کشمکش کے خدوخال سے ہوا اور تیسری دنیا ایک ایسی تصویر ہے، جس کے خطوط، دائروں، گوشوں اور بے شمار لکیروں میں وہ آویزش تحریر ہے جو 'دنیائے اول' کے تین بڑے استعماریوں کے استعماری ہتھکنڈوں اور غلبوں کی تاریخ کا جزو ہے۔

غرض کہ یوروپین نے نوآبادیاتی نظام کی بنیاد رکھی اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک پر اپنا تسلط قائم کرتے ہوئے یورپی تہذیب کو فروغ دیا۔ نوآبادیاتی نظام کے بعد بھی یہ سلسلہ ترقی یافتہ وترقی پذیر ممالک کی اصطلاحوں کے ذریعے قائم رہا۔ اس طرح ترقی یافتہ ملکوں نے دنیا کو نظریاتی اور تہذیبی طور پر تین دنیاؤں میں تقسیم کردیا۔ سرمایہ دار ممالک کی آزاد دنیا پہلی دنیا، سوشلسٹ ممالک دوسری دنیا اور ایشیا، افریقہ ولاطینی امریکہ تیسری دنیا کہلائی۔ ان تینوں دنیاؤں میں اصطلاحی سطح پر تیسری دنیا کو بہت جلد مقبولیت مل گئی۔ جنگ، نفرت، استحصال، محرومی، جہالت، افلاس اس دنیا کی پہچان بن گئی کیوں کہ پہلی دنیا کی ہر ممکن یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ تیسری دنیا کو محکوم ومظلوم بنائے رکھے۔ ان اصطلاحات کی مقبولیت تیسری دنیا کی مظلومیت کو بیان کرتی ہے۔

سماجی صورت حال

تیسری دنیا کی سماجی صورتحال کے سلسلے سے بات کی جائے تو وہاں کی بڑی آبادی غذائی قلت میں مبتلا ہے۔ جبکہ مغرب کے دیگر ممالک میں غذائی اشیا کی افزائش ہے۔ تیسری دنیا کے غریب ممالک کے افراد معاشی اعتبار سے اتنے کمزور ہیں کہ وہ زندہ رہنے کے لیے غذائی اشیا خریدنے سے محروم ہیں اور انھیں دو وقت کی روٹی حاصل نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آبادیوں میں معاشی صورتحال بہتر کرنے کی خاطر جو کشمکش

اورلوٹ کھسوٹ تھی وہ خانہ جنگی کی صورت اختیار کرگئی۔ یہ خانہ جنگی ممالک کا شتکار، کاشتکار مزدور، آجر مزدور، استاد شاگرد کے بیچ تھی۔ اس کے علاوہ یہ خانہ جنگی مذہب اور ذات کے نام پر بھی ہوتی رہتی ہے جو بالآخر تشدد کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اس تشدد کے خاتمے کا امکان اسی وقت ممکن ہے جب تیسری دنیا کی سماجی معاشی اور سیاسی صورتحال بہتر ہوجائے۔ عالمی غذائی کانفرنس کے منصوبے کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ دنیا کے پسماندہ اور غریب ممالک کے وہ لوگ جو بھوک اور افلاس کے شکار ہیں انھیں غذائی امداد دی جائے۔ اس ضمن میں کئی پالیسیاں بنائی جائیں جو اس مسئلے کو حل کرنے میں معاون ہوسکیں۔ اس کے علاوہ غذائی ذخیروں کا ایک مربوط بین الاقوامی نظام قائم کیا جائے جس کے تحت ترقی پذیر ممالک کے ساتھ زرعی پیداوار کی تجارت کی شروعات کی جائے۔ یہ تمام ترغیبات صرف غذائی قلت کو ختم کرنے کے لیے تھیں۔ اس طرح 1974 میں عالمی غذائی کانفرنس میں شامل 133 ممالک کے وزرا نے حکومتوں کو یہ صلاح دی کہ غذائی قلت کو مٹانے کے لیے یہ طریقہ کار اپنایا جائے:

''دس برس کے اندر اندر کوئی بچہ بھوکا نہ سوئے گا، کوئی کنبہ اگلے دن کی روٹی کے لیے فکرمند نہ رہے گا اور کسی انسان کا مستقبل یا صلاحیتیں ناکافی غذا کی بناپر مسدود نہ ہوں گی۔''

('تیسری دنیا وسائل و مسائل': مرتب، الطاف گوہر، ص 125)

لیکن یہ کانفرنس اس نصب العین کو پورا نہ کرسکی کیوں کہ غذائی قلت کی جو صورتحال تھی وہی کانفرنس کے 5 سال بعد 1979 میں بھی قائم رہی۔

تیسری دنیا کی مفلوک الحالی اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکہ کوئی ایسی کمیٹی، آزاد سکریٹریٹ یا مشینری کے قیام کا طرفدار نہیں جو تیسری دنیا کے مسائل کو سامنے لائے۔ مغرب کی جانب سے امدادی پالیسیاں تو بنائی جاتی ہیں لیکن ان پالیسیوں کے پیچھے تیسری دنیا کی فلاح کا نظریہ کارفرما نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں ورلڈ بینک کی سالانہ رپورٹ زیادہ مددگار ثابت ہوگی کیوں کہ ورلڈ بینک کی جانب سے ترقی پذیر ممالک کے آگے یہ مطالبے رکھے جاتے ہیں کہ ان مفلوک الحال لوگوں کو زندگی کی ضروریات مہیا کرائی جائیں لیکن یہ پالیسیاں اور مذاکرات بے معنیٰ ثابت ہوتے ہیں۔

تیسری دنیا کے ممالک میں فرد کے حقوق کے تحفظ کے لیے قبائلی یا دیہی کاؤنسلوں کا اہم رول ہوتا ہے۔ مقامی جھگڑوں کا فیصلہ اور کارروائی یہی کاؤنسلیں کرتی ہیں۔ جبکہ مغربی ممالک میں عوام کے انصاف کے لیے جو عدالتیں ہوتی ہیں وہ غریب عوام کے لیے پورے طور سے انصاف کرنے میں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ عدالتیں غریبوں کے لیے زیادہ مہنگی اور پیچیدہ بھی ہوتی ہیں دوسری طرف عورتوں کو بھی وہ مقام حاصل نہیں جن کی وہ مستحق ہیں۔ تیسری دنیا کی سماجی حیثیت کو سمجھنے میں افریقہ کی سماجی صورتحال معاون ہوگی۔ افریقہ میں سیاہ فام سفید فام کے ہاتھوں صدیوں سے لٹتے چلے آرہے ہیں۔ سفید فام کے آگے ان کی حیثیت حیوان سے زیادہ نہیں کیوں کہ سفید فام انھیں انسان نہیں مانتے۔ یہ سیاہ فام ایسی جگہ رہتے ہیں جسے لوکیشن کہا جاتا ہے۔ جسے گندگی کے ڈھیر سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا جاتا ہے۔

سفید فام کی اس ناانصافی کے خلاف سیاہ فام مزاحمت کے رویے بھی اپناتا ہے۔ انھیں یہ احساس بھی

قول ناطق کی تردید اور اس کی جگہ عقل کی روشنی میں قانون قدرت کے نفاذ کی روایت جس پر جدید جمہوریت کے فلسفیانہ تصورات مبنی ہیں، تیسری دنیا میں یورپ سے آئی۔

دلاتا ہے کہ وہ بھی انھیں کی طرح انسان ہے۔ وہ بھی سوچنے والا ذہن اور بولنے کے لیے زبان رکھتا ہے۔ غرض کہ سفید فام کے ہاتھوں سیاہ فام کے استحصال کا سلسلہ نوآبادیاتی نظام کے قیام کے بعد ہی شروع ہوجاتا ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو تیسری دنیا کی سماجی حیثیت غیر تشفی بخش ہے۔ صرف افریقہ ہی نہیں ایشیا، لاطینی امریکہ کے ممالک بھی ان طبقاتی کشمکش اور نسلی امتیازات کے شکار ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے مغربی ممالک کو فعال ہونے کی اشد ضرورت ہے۔

سیاسی

مغربی دنیا میں مغربی جمہوریت کو سب سے بہترین طرز حکومت مانا گیا۔ مغربی دنیا میں مغربی جمہوریت کے معنیٰ ہے:

''جہاں مقننہ کو براہِ راست بالغ رائے دہندگی کے ذریعے منتخب کیا گیا ہو، اور انتظامی حکومت یا تو براہ راست منتخب ہوتی ہے، جیسے کہ صدارتی نظام میں یا بالواسطہ طور پر عوام کے انتخابات میں انتظامی حکومت کو کوئی دخل نہیں دینا چاہیے تاکہ رائے دہندگان پوری آزادی کے ساتھ اپنی پسند کے امیدوار یا پارٹی کو کسی خوف یا لحاظ کے بغیر ووٹ دے سکیں۔ 'پسند' کا مطلب یہ ہوا کہ متعدد پارٹیاں اور امیدوار موجود ہوں گے، اگرچہ بہتر صورت یہ ہوتی ہے کہ دو ہی دو ہوں۔ اس طرح جو حکومت منتخب ہوگی وہ معاشرے کے معاملات میں ان ہی کے سامنے جوابدہ ہوگی جن پر وہ حکومت کرے گی۔''

('تیسری دنیا وسائل و مسائل' مرتب، الطاف گوہر، ص 64)

مغربی جمہوریت کے دو اور اصول ہیں۔ قانون کی حکومت اور عدلیہ کی آزادی۔ عدلیہ کی آزادی کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس کے تحت فرد کی آزادی اور حقوق کی پاسداری ہوسکے۔ انسانی حقوق مغربی جمہوریت کے لیے جزوِ لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسانی حقوق کے تحت فرد کو مذہب، تہذیب وثقافت ہر اعتبار سے سماجی برابری کا حق ملے۔ نوآبادیاتی نظام اور بعض آزاد ممالک میں مغربی جمہوریت کو اولیت حاصل تھی۔ اس طرح لفظ 'جمہوریت' کی اہمیت میں اتنا اضافہ ہوا کہ لفظ 'جمہوریت' کی کئی شکلیں وجود میں آگئیں۔ مثلاً — عوامی جمہوریہ، سوشلسٹ، اسلامی، بنیادی زیر ہدایت وغیرہ۔ مغربی جمہوریت بعد میں لبرل حریت پسند جمہوریت کے نام سے بھی مشہور ہوئی جو بہترین نظام حکومت کی شکل میں امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جاپان اور تیسری دنیا کے چند مستثنیات میں نافذ رہی لیکن رفتہ رفتہ نظام جمہوریت انسانی حقوق کے تحفظ، امن عامہ کے قیام اور معاشی ترقی جیسی ذمے داریوں کو نبھانے میں ناکام ہونے لگی جبکہ جمہوری حکومت کی کامیابی کے لیے ان تمام نکات کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

لیکن تیسری دنیا کے ممالک میں ذہنی پختگی کی کوئی بھی ایسی صورتحال رونما نہیں ہوئی، جس کے لیے یورپ کو اختصاص حاصل ہے۔ یورپ کے مقابلے تیسری دنیا کے ممالک میں جو بھی اصلاحی تحریکیں ہوئیں ان میں قدما کے قول اور استخراجی منطق کا خاص دخل تھا۔ اسی لیے تیسری دنیا میں جمہوریت کے تعلق سے یہ باتیں مناسب لگتی ہیں۔

''قول ناطق کی تردید اور اس کی جگہ عقل کی روشنی میں قانون قدرت کے نفاذ کی روایت جس پر جدید جمہوریت کے فلسفیانہ تصورات مبنی ہیں، تیسری دنیا میں یورپ سے آئی۔''

غرض کہ تیسری دنیا کے سیاسی منظرنامے پر بھی یورپ کا خاص اثر پڑا۔ بعد کی مقامی تحریکوں پر بھی اس یورپی خیالات کا اثر رہا کیوں کہ تیسری دنیا کے کسی بھی ملک میں کوئی اپنا جمہوری ادارہ نہیں تھا بلکہ مغربی اداروں سے ان کا گہرا تعلق تھا جو جمہوریت کی روایت کے پروردہ

تھے۔ مغربی جمہوریت کا اثر تیسری دنیا کے ممالک پر تو دیکھا جاسکتا ہے لیکن تیسری دنیا کے بعض پسماندہ ممالک نے جمہوریت کو نہیں اپنایا، افریقہ میں کوئی جمہوری ملک نہیں۔ ایشیا میں جمہوریت کے تین نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مغرب کے بعض چھوٹے ممالک جیسے کیز بیین اور جزیرہ لاطینی امریکہ کے ایک دو ملک نے ہی جمہوریت کو اپنایا بعض ممالک نے اپنا کر ترک کر دیا۔

ایشیا کے تین ممالک ملیشیا، سری لنکا اور ہندوستان میں جمہوریت قائم ہے۔ ان تینوں ممالک کے علاوہ بقیہ پسماندہ ممالک میں غیر جمہوری نظام کو کیوں کر ترجیح دی گئی اس کی سب سے بڑی وجہ ہے کہ یہ جمہوری نظام عوام کی فلاح اور روایتی طرز حکومت کے تعلق سے پورے طور پر کامیاب ثابت نہ ہو سکے۔ ان ممالک کی مفلوک الحالی اور ان کے ازالے کی کوشش سب سے بڑا سوال ہے۔ اس لیے ان ممالک کے ہی پسماندہ اور بھوک اور افلاس کے شکار افراد کے لیے سب سے پہلے حکومت کو آمدنی میں اضافے پر توجہ دینا ہے۔ آمدنی میں اضافے کی بات ہو یا معاشی صورت حال کی بہتری ان سب کے لیے سرمایہ کاری کی افزائش زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ خواہ ان سرمایہ کا تعلق بیرونی یا اندرونی ملکوں سے ہو۔ یہاں پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ پسماندہ ممالک کی سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ انھیں باہری ملکوں سے سرمایہ منگانے میں مشکلیں درپیش آتی ہیں کیوں کہ مغربی سامراج کی جانب سے 'نئے بین الاقوامی اقتصادی نظام' کے قیام پر توجہ دینے کے بجائے مخالفت اس کی بڑی وجہ ہے۔ جس کی وجہ سے تیسری دنیا کی عوام مفلوک الحالی کا شکار ہیں۔

تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں فی کس آمدنی اتنی قلیل ہے کہ انسانی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتی ہیں اس لیے حکومت کو سرمایہ کاری پر توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ عوام کی فلاح ہو سکے۔ جمہوری نظام حکومت غریب ممالک میں اس لیے بھی کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ انسانی حقوق کے لیے کوئی کارگر اقدام نہیں اٹھائے گئے۔ بلکہ جمہوری حکومتیں ایسی پالیسی اختیار کرتی نظر آتی ہیں جن سے بجت کی جگہ زیادہ صرفہ سامنے آتا ہے۔ دیگر کاموں میں بھی اس کی پالیسی کچھ عجیب رخ اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ جیسے کہ سماجی سہولتوں کے خرچ میں اضافہ، اسکولوں اور اسپتالوں کی تعداد میں اضافہ، اجرتوں ولازمی اشیائے صرف کی قیمتوں کو کم رکھنے کے لیے مالی امداد اور حکومت کے خرچ پر روزگار مہیا کرنا۔ حکومت چاہے کہ مالی معاملات میں ذمے دار ہو نتیجتاً یہ سارے اخراجات مل کر اصل آمدنی سے بڑھ جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر صورت حال پہلے سے ابتر ہوتی نظر آتی ہے اور ایسی صورت میں بے اطمینانی کا بڑھنا لازمی قرار پاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تیسری دنیا کے افراد جدید نوآبادیاتی نظام کے ادارے کی فوجی طاقت کا نشانہ بنتے رہے کیوں کہ یہ ادارے اپنے حقوق کے حصول کے لیے انقلاب کی صدائیں بلند کرنے والے عوام کا قتل کرنے، ایذائیں دینے اور جیل میں قید کرنے سے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے ہیں کیوں کہ اس ادارے کا مقصد جمہوریت اور سامراجی نظام کے مخالف عوام کو ہر طور سے ایذائیں دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری دنیا میں کوئی منظم حکومت قائم نہیں رہتی ہے۔ یہ ادارے تیسری دنیا میں افراط وتفریط کا ماحول جیسے نسلی امتیازات، نفاق اور مناقشات پیدا کر کے اپنے مفاد کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اس طرح تیسری دنیا کے عوام اور رہنما جو احتجاج کرتے ہیں ان کی جانیں لینا ان کا دستور بن گیا ہے۔ ان کے آگے انسانی زندگی اور انسانیت کی کوئی قدر نہیں۔ فوجی طاقت کی بنیاد پر ان غریب ممالک میں دہشت گردی، تخریب کاری، قتل وغارت گری کا بازار گرم رہتا ہے۔ اور ظالم وجابر بادشاہوں کے ذریعے غیر آئینی حکومت قائم کی جاتی ہے جو سامراجی حکومت کی استحصالی قوت کو پناہ دے سکے۔

بحیثیت مجموعی جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ تیسری دنیا کے افراد کے لیے سوہان روح بنتی ہے اور ان کی مفلوک الحالی بدستور قائم ہے۔

تہذیبی و ثقافتی

تیسری دنیا کی تہذیبی وثقافتی شناخت کی بات اگر کی جائے اور مغرب کا ذکر نہ ہو تو بات مکمل نہیں ہو سکتی کیوں کہ تیسری دنیا کے تہذیب وثقافت پر بھی مغرب کا تسلط قائم ہے۔ یہ کہنا بے جا نہیں کہ مغربی ممالک امریکہ اور یورپ تیسری دنیا میں مغربی تہذیب کو فروغ دینے میں متحرک ہیں۔ جس میں مغرب کو کامیابی بھی ملی۔ مغربی تہذیب کو تیسری دنیا کے عوام میں پھیلانا دراصل تہذیبی نفوذ ہے اور تہذیبی نفوذ کے سلسلے میں Duncan Mitchell لکھتا ہے:

''فرد کے نقطۂ نظر سے یہ ادب آموزی کا ایک ایسا عمل ہے جو تربیت بالغان کے عمل سے مشابہ ہے جس میں زبان کو خاص دخل حاصل ہے۔ سماجی نقطۂ نظر سے تہذیبی نفوذ کے مفہوم میں خاص قدروں، اصولوں اور اداروں کی اشاعت بھی آجاتی ہے۔''

Duncan Mitchell, A. Dictionary of Sociology, London 1973

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ تعلیمی اعتبار سے مغرب کا اثر پوری دنیا پر پڑا کیوں کہ مغربی تعلیم کو اپنا کر دیگر ممالک بھی اپنی ترقی اور برتری چاہتے تھے۔ اس طرح مغربی نظام تعلیم ذہنی وثقافتی ہمواری وہم آہنگی پیدا کرنے میں زیادہ معاون ثابت ہوئی، جس کا اثر بیسویں صدی کے نصف اول میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس عہد میں تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت بڑھ گئی جو مغربی نظام تعلیم سے فیض یاب ہوئے تھے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عالمی ثقافتی ارتکاز کے وسیلے کے طور پر مغربی تعلیم ایک خاص اہمیت کی حامل رہی اور شاید یہی وجہ رہی کہ اعلیٰ عہدوں پر تقرری کے لیے انگریزی تعلیم زیادہ ضروری ہوگئی۔ یوگینڈا قبیلے کے تعلیمی نظام کے تعلق سے گورنر جانسن کا اعلان 1900 اہمیت کا حامل ہے۔ اس بیان سے گورنر جانسن کے خیالات بھی واضح ہوتے ہیں اور سیاسی صورت حال بھی سامنے آتی ہے۔ دیکھیے یہ اقتباس:

''یوگینڈا قبیلے کو اپنے ملک کی حکومت سے علیحدہ رکھنا تو درکنار، میں تو ان کی ہمت افزائی کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے لڑکے انگریزی پڑھیں تاکہ سرکاری دفاتر میں ہندوستانی کلرکوں کی جگہ لے سکیں۔''

Johnson to Jackson/1900

یہ اعلان دراصل یوگینڈا کے معاشرے سے وہاں کے تعلیمی نظام کو ختم کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ درباری تہذیب وآداب اور بادشاہ کی خوشنودی پر انگریزی تعلیم کو فوقیت عطا کرنا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشرافیہ طبقہ اس لائحۂ عمل سے مستفید ہوا اور قبیلے کے وہ افراد محروم ہو گئے جو صرف اپنے بچوں کو شاہی محل میں اچھے طور طریقے سیکھنے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ جن کے لیے یہ شاہی محل مدرسہ اور درسگاہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن شاہی محل کی اہمیت ختم ہوگئی کیوں کہ شاہی محل سے مستفید نوجوان کو اعلیٰ منصب میں کوئی جگہ نہیں ملی۔ ان کے مقابلے انگریزی تعلیم سے آراستہ نوجوان کو یہ عہدہ عطا کیا جانے لگا، جسے نوآبادیاتی نظام کا سوچا سمجھا منصوبہ ہی کہا جائے گا۔

افریقہ میں مغربی تعلیم کے فروغ نے قوم پرستی کو جنم دیا اور اس طرح ہر عہدے پر افریقیوں کی تقرری پر توجہ دی جانے لگی۔ مغربی تعلیم کو فروغ دینے کے ساتھ نوآبادیاتی نظام کا یہ منصوبہ بھی تھا کہ افریقہ میں ایک ایسا معاشرہ بنایا جائے جو تجارتی اعتبار سے منافع بخش ہونے کے ساتھ مغربی تہذیب و ثقافت کے فروغ میں بھی معاون ہو اور یہ معاشرہ مغرب کی تیار کردہ چیزوں، ٹوتھ پیسٹ، آٹو موبائیل، گھڑیاں، ٹیپ رکارڈر، سگریٹ،

جام، ریڈیو، ٹیلی ویژن، موٹر گاڑیاں، فرنیچر کا خریدار بن سکے۔ اس کے علاوہ جنوبی افریقہ کو وسائل پیداوار کے علاوہ صنعتی اعتبار سے دیکھا جائے تو معدنیات پر بھی مغرب کے قوی ادارے Imperial British East Africa Company کا تسلط قائم تھا۔ اس کمپنی نے سمندر پار بھی اپنا کاروباری سلسلہ پھیلانا شروع کردیا تھا۔ جبکہ بیسویں صدی کے نصف آخر سے پہلے مواصلاتی انتظامات اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے کیوں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ٹیلی فون اور ٹیلی مواصلات کا نظام وجود میں آیا۔

یہاں پر یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ نوآبادیاتی نظام تعلیم تضاد کا شکار تھا۔ یہ نظام تعلیم مغربی اقدار کو فروغ دے رہا تھا، جس کا واضح اثر افریقہ اور ایشیا کے بعض ممالک پر پڑا۔ اس 'تکنیک وثقافت' کے درمیانی خلا کو پیدا کرنے میں عیسائی مشنری اسکولوں کا اہم رول رہا۔ یہ مشنریاں عیسائی مذہبیت کا ایسا تصور پیش کررہی تھیں جو بالکل فرسودہ تھا۔ جبکہ ان مشنریوں کو جدید تہذیب کے فروغ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا لیکن ایسا کچھ نہیں تھا بلکہ اصل میں یہ مشنریاں تیسری دنیا کے ممالک میں لادینی تہذیب کو فروغ دینے اور نئے مذہب کو پھیلانے کا کام کررہی تھیں۔

عیسائی مشنریوں نے جہاں مذہب کی تبلیغ پر زور دیا وہیں مذہب کی تبدیلی پر بھی زور دیا۔ عیسائیت کی تبلیغ تیسری دنیا کے ممالک میں کس طرح کی گئی اس کا اندازہ مختلف دانشوروں کے قلم سے نکلے ہوئے جملوں سے بخوبی ہوجاتا ہے۔

اس طرح تیسری دنیا کے ممالک کے افراد کشمکش اور مادیت کے شکار ہوگئے اور تعلیم کا مذہب سے تعلق ختم نہیں تو کم ضرور ہوگیا۔

1700 تا 1875 کے درمیان مغربی نوآبادیاتی نظام نے اپنی ترقی کی خاطر تیسری دنیا کے ممالک کو اپنا غلام بنانے کی غرض سے ان ممالک کی معیشت پر اپنا قبضہ کیا، انھیں ہر قدرتی وسائل سے محروم کردیا اور مقروض بنادیا۔ غرض کہ جہاں اس نظام نے اقتصادی استحصال کیا وہیں تہذیبی جارحیت میں بھی پیچھے نہیں رہا۔ تہذیبی جارحیت کی خاطر مذہب کو بطور حربہ استعمال کیا اور عیسائی مشنریاں اس مقصد کے حصول کے لیے فعال رہیں۔ یہ مشنریاں عوام کی توجہ اس جانب مبذول کراتیں کہ ''عیسائیت واحد حقیقی مذہب ہے۔ عیسیٰ مسیح سچے خدا ہیں، ہندوستانیوں کے روحانی تحفظ کے لیے دوسرے تمام مذاہب کو نیست نابود کردینا ضروری ہے''۔ عیسائی مذہب کو حقیقی اور دیگر مذاہب کو غیر حقیقی بتا کر ہندوستانیوں کو عیسائیت کی تعلیم دینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی جس میں برطانوی سامراج کو کامیابی بھی ملی۔ مذہب کے علاوہ تہذیب وثقافت کے تعلق سے بھی ہر ہندوستانی متاثر ہوا اور نتیجتاً مغربی لباس اور مغربی نظام تعلیم کا چلن عام ہوگیا۔ ہر ہندوستانی اس غلط فہمی کا شکار ہوگیا کہ برطانوی سامراج ہندوستان اور ہندوستانیوں کی فلاح چاہتا ہے جبکہ اس کا تعلق حقیقت سے بعید تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے مختلف ممالک میں عالم کاری (Globlization) کے نام پر یہ سلسلہ جاری ہے۔ نوآبادیاتی نظام کا مقصد مغربی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینا اور مقامی تہذیب وثقافت کو فتح کرنا تھا۔ عالم کاری کا ہی نتیجہ ہے کہ تہذیب اپنی اصل معنویت کھوچکی ہے اور انسان ہی انسان کا دشمن بن بیٹھا ہے۔

تیسری دنیا کے افراد اور 'دنیائے اول' کے درمیان

عیسائی مشنریوں نے جہاں مذہب کی تبلیغ پر زور دیا وہیں مذہب کی تبدیلی پر بھی زور دیا۔ عیسائیت کی تبلیغ تیسری دنیا کے ممالک میں کس طرح کی گئی اس کا اندازہ مختلف دانشوروں کے قلم سے نکلے ہوئے جملوں سے بخوبی ہوجاتا ہے۔

کشمکش جاری ہے۔ ظاہری طور پر فلاح کے سارے وعدے کیے جاتے ہیں یعنی یہ کہ تیسری دنیا کی مفلوک الحالی اور ان کی سماجی سیاسی صورت حال کی بہتری کے لیے ظاہراً تو ایسا لگتا ہے کہ ان کی خاطر ترقی پذیر ممالک ہر آن کوشاں ہیں اور ان کے مسائل کے حل کے لیے تجویزیں کی جارہی ہیں لیکن دراصل ان تجاویز کی پاداش میں تیسری دنیا کا معاشی سماجی تہذیبی اور سیاسی استحصال ہوتا رہتا ہے۔ جن کی مزاحمت میں تیسری دنیا کے افراد صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں کیوں کہ انھیں درپیش مسائل کا احساس ہوچکا ہے اور شعوری طور پر یہ بیزار ہوچکے ہیں۔ ان کا ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہے کہ برداشت اور تحمل سے کچھ نہیں ہوگا بلکہ احتجاج کی ضرورت ہے۔ اس لیے تیسری دنیا کے افراد استحصال کا شکار ہوتے ہوئے بھی اپنے انسانی وجود کی بازیافت کی کوشش میں سرگرم عمل ہوگئے۔ احتجاج کا یہ سلسلہ 20ویں صدی کے نصف سے جاری ہے۔

تیسری دنیا کی معیشت پر مغربی ممالک کا تسلط قائم ہونا ان کی مفلوک الحالی کی سب سے بڑی وجہ مانی جائے گی۔ اپنے ہی ذرائع پیداوار پر کوئی حق نہ ہونا انھیں فاقہ کشی اور مقروض زندگی جینے پر مجبور کرتی ہے۔ ذرائع پیداوار کے علاوہ سائنس، ادب، آرٹ غرض کہ تمام تر ترقیات پر مغربی ممالک قابض ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری دنیا کے عوام کے لیے یہ اہم مسئلہ بن چکا ہے کہ وہ اپنے نظریات اور لائحہ عمل کی بنیاد پر زندگی جینے سے محروم ہیں لیکن ان تمام قیود اور پابندیوں کے باوجود تیسری دنیا کے عوام نے اپنی فلاح کے لیے انقلاب کی صدائیں بلند کی ہیں۔ اس طرح ان کی کوششیں جاری ہیں کیوں کہ وہ ایسے نظام کی خواہشمند ہے جو طبقاتی کشمکش، نسلی امتیازات سے مبرا ہو۔ یہ نئے معاشرے کی بنیاد کی خاطر اپنی قیمتی زندگی کو داؤ پر لگانے سے بھی گریز نہیں کرتی ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں آزاد فضا میں سانس لے سکیں اور زندگی کی اصل معنویت واہمیت کو سمجھ سکیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اردو ادب نے تیسری دنیا کے افراد کی مفلوک الحالی، بے بسی، محرومی، ناکامی اور زبوں حالی کو شدت سے محسوس کیا۔ اس کے تمام محرکات پر اس کی نظر رہی اور اس نے تیسری دنیا کے افراد کے لیے مزاحمت اور جدوجہد کی راہ ہموار کرنے کے لیے ہر صنف میں اپنے جوہر دکھائے۔ اردو شاعری میں بھی تیسری دنیا کے تعلق سے اچھی خاصی گفتگو موجود ہے اور ان افراد کو زندگی جینے اور پژمردگی سے نکلنے کا پیغام اردو شاعری نے بھی بڑی خوبصورتی سے دیا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے یہ لکھنے میں کوئی تامل نہیں کہ جس خوش اسلوبی سے اردو فکشن نے یہ کام کیا وہ اردو شاعری کا حصہ نہیں بن سکا اس کی ایک بڑی وجہ فنی مجبوریاں رہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ فکشن نگاروں نے اسے زیادہ خوبصورت ڈھنگ سے پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اردو افسانے اور ناول اس کی زندہ مثال ہیں اور اس مسئلے کو اٹھانے والے اور خوبصورتی وخوش اسلوبی سے قارئین وسامعین تک منظرنامے کو پیش کرنے کے لیے فکشن نگار حضرات یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔ ان فکشن نگاروں کی نگارشات اس بات کا اعلانیہ بھی ہیں کہ اردو کا قلم کار محدود دنیا کا مسافر نہیں بلکہ وہ عمیق مطالعے اور وسیع مشاہدے کا عادی بن چکا ہے اور اردو ادب کو عالمی منظرنامے پر لانے کی سعی جاری ہے اور اس میں بہت حد تک فکشن نگار حضرات کامیاب بھی ہیں۔

□

Dr. Tasneem Fatma, D/o - Md. Tahir Hussain, Sadar Gali, Bagh Kalu Khan, Patna City, Patna-8 (Bihar)

ڈینگو وائرس
کا تعدیہ اور اس کا تدارک

بلال احمد

ڈینگو (Dengue) ایک متعدی بیماری ہے جو کہ flavi virus خاندان سے تعلق رکھنے والے Dengue virus کے ذریعے پھیلتی ہے جو کہ ایک Positive RNA Virus ہے اور اس خاندان کے وائرس ایک lipid invelop کے اندر ملفوف ہوتے ہیں۔ یہ بیماری زیادہ تر Tropical & sub tropical areas میں پائی جاتی ہے اسی لیے یہ مغربی ایشیا، ہندوستان اور افریقہ میں وبا کے طور عموما بارش کے مہینے میں پھیلا کرتی ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے مطابق ہر سال 50 سے 100 ملین لوگ اس بیماری سے متاثر ہوتے ہیں۔

انسانوں کے درمیان یہ بیماری directly منتقل نہیں ہوا کرتی بلکہ ایک مادہ مچھر (Aedes aegypti) بطور vector کام کرتا ہے اس کے علاوہ مغربی ایشیا میں Aedes albopictus نامی مچھر بھی اس بیماری کو پھیلانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ دراصل یہ خاص قسم کے مچھر انسانی خون کو اپنی نشو ونما کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اوسطاً ایک دن میں 3 سے 5 لوگوں کو کاٹ کر اپنی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اس کی ضرورت ایک آدمی کے خون سے نہ پوری ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عموماً یہ دن کے اوقات میں کاٹا کرتا ہے جب انسان بیدار رہتا ہے اور فوراً ہی مچھر کے بیٹھنے کے احساس کے ساتھ ہی اسے بھگا دیتا ہے اس لیے یہ اپنی خوراک حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے اور دوبارہ کسی دوسرے انسان کو اپنا نشانہ بناتا ہے اپنے اسی رویے کی وجہ سے یہ مچھر زیادہ لوگوں کو بیک وقت متاثر کرتا ہے اور یہ مچھر اکثر اس وقت متعدی ہو جایا کرتے ہیں جب یہ کسی ڈینگو کے مریض کو کاٹتے ہیں نتیجتاً وائرس انسانی خون سے منتقل ہوکر مچھر کے اندر پہنچ جاتا ہے اور پھر وہاں پر یہ مکمل ہوتے ہیں اور اپنی تعداد میں بڑھتے ہیں اس کے بعد دوبارہ کسی صحت مند انسان کے جسم سے خون کو چوستے ہیں تو وائرس انسانی خون میں منتقل ہو جاتا ہے اس طرح انسان اور مچھر کے درمیان ایک سائیکل سی چلتی رہتی ہے اور بیماری ایک وبا کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔

یہ بخار ڈینگو وائرس کے چار Serotype (DENV1,2,3,4) میں سے کسی ایک سے ہوتا ہے لیکن ان میں سے کسی ایک سے تعدیہ ہونے کے نتیجے میں آدمی کے اندر باقی دوسرے serotype کے خلاف قوت مدافعت نہیں پائی جاتی ہے۔ ایک متعدی مچھر کے کاٹنے کے بعد علامات ظاہر ہونے میں 2 سے 7 دن درکار ہوتے ہیں جبکہ وائرس مچھر کے اندر داخل ہوتا ہے تو دوبارہ سے کسی انسان کو متاثر کرنے کے لیے مزید 8 سے 12 دن کا وقت درکار ہوتا ہے لیکن اس کے بعد یہ مچھر جب تک زندہ رہتا ہے تب تک تعدیہ پھیلانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

عالمی ادارہ صحت نے اس بخار کی بڑھتی ہوئی وبا پر کافی توجہ دی ہے اور سب سے زیادہ عام ہونے والے اس بخار کے مہلک اثرات کو کم کرنے کے لیے عالمی ادارہ صحت نے کچھ ہدف مہیا کر رکھے ہیں۔

1. 2020 تک ڈینگو سے ہونے والی اموات کو 50 فیصد تک کم کیا جائے۔
2. 2020 تک ڈینگو سے ہونے والی خرابی صحت کو 25 فیصد تک کم کیا جائے۔
3. 2015 تک اس بیماری کو صحیح طور پر سمجھ کر صحیح اندازہ کر لیا جائے کیوں کہ اس بیماری کے تعلق سے ابھی تک کافی بے توجہی برتی گئی۔

اگر اس بیماری کی جلد از جلد تشخیص کر لی جائے جس کے لیے ضروری ہے کہ اچھے ہسپتال میں داخل کرایا جائے جہاں پر بہتر لیب اور ماہر اسٹاف موجود ہو اور فوراً intra venous rehyderation کے ذریعے مریض کو فوری طور پر توانائی فراہم کی جائے تو ڈینگو سے ہونے والی اموات کو کافی حد تک روکا جا سکتا ہے۔

یہ مچھر دوسرے مچھروں سے مختلف ہوا کرتے ہیں ان کے لیے مناسب اور بہتر جگہ جہاں پر یہ آسانی سے اپنی نسل بڑھا سکتے ہیں۔ درج ذیل ہیں:

کولر، ڈرم، شیشے کی چوڑے منھ والی شیشی، کھلے ہوئے برتن، بالٹیاں، گلدان، پودے کے گملے، پانی کا ٹینک جس میں پانی کئی کئی روز جمع ہوا رہے اور لوگ اس کو استعمال کریں، پانی کی بوتل خاص طور پر اگر کھلی ہوئی ہو اور پانی اس کے اندر کئی روز کا ہو، کوڑے کباڑ میں پڑے ہوئے

ٹن کے ڈبے اور برتن، پرانے ٹائر اگر کہیں پر رکھے ہوئے ہوں تو اس کے اندر اکٹھا پانی میں اس مچھر کی افزائش ہو سکتی ہے جو بڑے پیمانے پر بیماری کا سبب بن سکتے ہیں، چھتوں کی نالیوں میں اگر پانی رہ جائے، فریج کے اندر لگے ہوئے پلیٹ کے اندر پانی کا رکا رہنا اور اس کی روزانہ صفائی نہ کرنا، کٹے ہوئے درختوں اور بانسوں کے اندر پانی جمع ہوسکتا ہے، جھرنے اور لان میں لگے ہوئے مصنوعی فوارے۔

ان تمام جگہوں پر اگر پانی رکا ہوا ہے تو یہ ڈینگو کے لیے بہتر ماحول فراہم کرنے میں معاون ثابت ہوں گے لہٰذا ہمیں اس بات کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارے گھر یا گھر کے آس پاس کوئی ایسی جگہ نہ ہو جہاں پر یہ مچھر افزائش کر سکے اس سلسلے میں ہمارے اقدامات کچھ اس طرح ہونے چاہیے۔

1. کولر کے پانی کو روز بدلیں یا کولر کو بالکل ہی سوکھا رکھیں اور بغیر پانی کے استعمال کریں۔
2. احتیاتی طور پر کولر میں پانی کے اوپر تھوڑا کیروسین یا پٹرول ڈال دیں تا کہ مچھر کی افزائش کو ختم کیا جا سکے۔
3. کوشش کریں کہ گھر کے اندر پانی کو اکٹھا نہ کرنا پڑے اور اگر رکھیں تو ایسے برتن میں رکھیں جو اچھی طرح سے بند ہو سکے۔
4. گھر سے ایسی تمام چیزوں کو نکال دیں جس میں پانی اکٹھا ہونے کے خدشات ہوں۔
5. اگر آپ کے صحن یا باغیچے میں کوئی فوارہ یا تالاب ہو تو اس میں larvivorous مچھلیاں ڈالیں تا کہ یہ مچھلیاں مچھر کے larvael کو کھا جائیں اور اس طرح مچھر کی افزائش کو ختم کر سکتے ہیں۔
6. محلے اور علاقے میں ایسی تمام جگہوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں جہاں پر مچھر کی افزائش ہو سکتی ہو۔ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ zonal muncipal health کو اطلاع دی جائے کہ اس بیماری کے پھیلنے کے ذریعے کو فلاں جگہ سے ختم کیا جائے۔
7. ذاتی طور پر mosquito liquid, mosquito coil اور مچھر دانی کا استعمال کریں۔

علامات اور نشانیاں: اس بخار کی تشخیص میں اس کی کافی اہمیت ہے اس لیے لوگوں کو اس کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔

1. شروع کے دو دن شدید بدن درد اور سر درد۔
2. شدید بخار (105F) ٹھنڈک کے ساتھ جو کہ continuous یا saddle back طرز کا ہوا کرتا ہے۔
3. پشت میں شدید درد، جوڑوں میں درد اور اسی بنیاد پر اس کو ہڈی توڑ بخار (Break bone fever) بھی کہتے ہیں۔
4. آنکھوں میں شدید درد کا احساس یہاں تک کہ آنکھوں کے کھولنے اور حرکت کرنے پر درد کا محسوس کرنا۔
5. آنکھیں سرخ ہونا، مسلسل آنکھوں سے پانی کا بہنا۔
6. بھوک کا زائل ہو جانا۔
7. متلی اور قے کی کیفیت کا پایا جانا کبھی کبھی حالت زیادہ خراب ہونے پر خون کی قے ہونے لگتی ہے۔

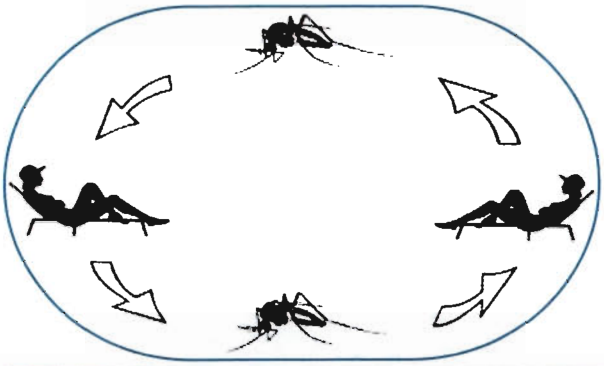

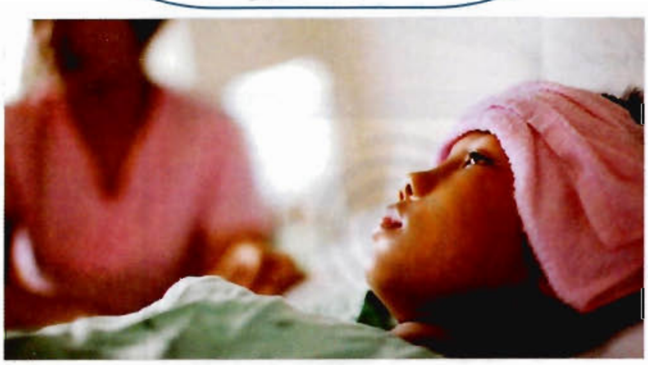

8. بدن پر سرخ دھبے کا پایا جانا جو کچھ ہی دنوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔
9. بدن کا رنگ پیلا اور درجہ حرارت کم ہو کر بدن ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔
10. زبان خشک ہو جاتی ہے اور مریض کافی پیاس محسوس کرتا ہے اس میں dehydration زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس کو دھیان رکھیں۔
11. بہت زیادہ بے چینی اور بے خوابی کا پایا جانا۔
12. مریض کی نبض سریع اور ضعیف ہوا کرتی ہے۔
13. سانس لینے میں تکلیف اور دشواری کا احساس ہونا۔
14. حالت زیادہ بگڑنے پر منھ، ناک اور جلد سے خون کا بہنا۔
15. موت کا واقع ہونا۔ اموات کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں لیکن بچوں میں موت زیادہ ہوتی ہے یا پھر یہ بیماری وبا کے طور پر پھیل جائے اور اس پر توجہ نہ دی جائے تو complications کے نتیجے میں اموات ظاہر ہوتی ہیں۔

classical Dengue کی وجہ سے اموات نہیں ہوتی لیکن جب یہ Dengue haemorhegic fever(DHF) اور Dengue shock syndrome(DSS) ہو تو اموات زیادہ ہوا کرتی ہیں۔

تحفظی و معالجاتی نکات:

1. ایسی جگہوں یا ایسے endemic zone میں جانے سے حتی الامکان گریز کریں جہاں پر یہ بیماری پھیلی ہوئی ہو۔
2. یہ بیماری جب پھیلی ہو تو پوری آستین کا کرتا یا شرٹ پہنیں اس کے ساتھ پائجامہ یا full pant ہر وقت زیب تن کیے رہیں تا کہ مچھر نہ کاٹ سکے بلکہ اب ایسے کپڑے مارکیٹ میں آ گئے ہیں جن کو استعمال کرنے سے آدمی مچھر سے محفوظ رہ سکتا ہے۔
3. ممکن ہو سکے تو جوتا اور موزہ پہنیں۔
4. بچوں کو خاص طور پر پورے کپڑے پہنائیں، بہتر ہوگا کہ شام کے وقت جب بچے باہر یا لان میں کھیل رہے ہوں تو ان کے بدن پر mosquito replicant cream لگائیں تا کہ بچے کھیل میں مشغول ہوں تو بھی مچھر کے کاٹنے سے محفوظ رہ سکیں۔
5. Rehyderation کا پورا خیال رکھیں اس کے لیے صاف پانی کا استعمال کریں ضرورت ہو تو intravenous fluid دیں اور اس بیماری کے پھیلے ہونے کی صورت میں اس طرح کی علامات کے ساتھ آنے والے ہر مریض کا پوری طرح معائنہ کریں اور اس کو تقریباً ایک ہفتے کے observation پر رکھیں اس کے لیے یا تو مریض کو ہسپتال میں بھرتی رکھیں یا پھر روزانہ مریض کو رپورٹ کرنے کے لیے کہیں اگر مریض پڑھا لکھا اور پاس کا رہنے والا جہاں سے وہ کسی ایمرجنسی کی

صورت میں ہسپتال فوراً آسکے۔

6. سبزیوں کا شیرہ یا جوس کافی مفید ہے جیسے گاجر، چقندر، کھیرا اور مولی وغیرہ پتیوں کے ساتھ۔

7. پھلوں کا استعمال کریں جیسے امرود، انار، لیچی، سیب، انناس، سنگترہ اور پپیتہ۔

8. شکرقند (sweat potato) اس کی تازہ پتیاں اور جڑ استعمال کرنا کافی مفید ہے۔ اس کے اندر کافی وٹامنس، منرلس اور کیلوریز پائی جاتی ہیں جو اس بیماری میں مفید ہیں۔ اس پر تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ یہ platelets کو بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔

9. ناریل کا پانی غذائی اجزا کی بنیاد پر اس بخار میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

مفید نسخے

- پپیتے کی 4-2 پتیاں لے کر اسے صاف کریں پھر ان کا عرق کشید کر کے چھان لیں اور 2 چمچے صبح شام استعمال کریں یہ platelets کو بڑھاتا ہے۔
- پیاز کو باریک کاٹ کر ایک چوڑے شیشے کے برتن میں رکھ کر سرکہ سے بھر دیں پھر 2 دن اسے یوں ہی چھوڑ دیں تاکہ سرکہ پوری طرح نفوذ کر جائے پھر کھانے کے ساتھ اس کو استعمال کریں خاص طور سے ڈینگو پھیلنے والے موسم میں تو یہ بیماری سے تحفظ کا ضامن ہوتا ہے۔
- دھنیا کی پتی کو پیس کر استعمال کرنا ڈینگو بخار کو کم کرتا ہے۔
- عرق شاہ ترہ، عرق مکوہ، عرق کاسنی سب 60 ملی لیٹر لے کر اس میں آلو بخارا گیارہ دانہ کو چند گھنٹوں کے لیے بھگو دیں پھر اسے چھان کر شربت نیلوفر 24 ملی لیٹر ملا کر اسپغول مسلم چھڑک کر رات میں استعمال کریں۔
- قرص طباشیر کافوری 2 عدد، مفرح بارد 4 گرام کھلائیں اس کے بعد شیرہ زرشک، شیرہ تخم کاہو، شیرہ تخم کاسنی 3-3 گرام اور شیرہ عناب 5 عدد کو عرق گلاب و عرق بیدمشک 60 ملی لیٹر میں حاصل کر کے شربت نیلوفر 20 ملی لیٹر کے ہمراہ صبح و شام استعمال کرائیں۔

کچھ اہم غذائی اجزا: اگر ہم اپنی غذا میں کچھ nutrients کا خاص خیال رکھیں تو ہماری قوت مدافعت میں اضافے کے ساتھ ساتھ ڈینگو سے نجات میں آسانی حاصل ہوگی جیسے۔

(1) Vitamin C: یہ بہت اہم وٹامن ہے اس کے ذریعے سے adrenal hormone اور lymphocytes بنتے ہیں جو مدافعتی نظام کا ایک اہم حصہ ہوا کرتے ہیں اس کے علاوہ یہ بیکٹیریا اور وائرس کے خلاف بلاواسطہ طور پر جسم انسانی کو ان کے برے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

(2) Vitamin E: یہ بھی قوت مدافعت کو بڑھانے میں کافی معاون ہوتی ہے اور وائرس کو مارنے والے خلیات کو متحرک کرتی ہے جس کی بنیاد پر ڈینگو میں اس کا استعمال مفید ہے۔

(3) Beta carotene: ان کی مدد سے Natural killer cells اور Helper T cell اپنے کام کو بہتر طور پر انجام دینے کے اہل ہوتے ہیں۔

(4) Zinc: اس کی وجہ سے WBC کے اندر ہر طرح کے تعدیہ کے خلاف لڑنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

(5) Selenium: عمدہ اور صحت مند مدافعتی نظام کا ذمے دار ہے۔

(6) Omega-3 fatty acid: جو بچے اس کو استعمال کرتے ہیں وہ اس طرح کی وبائی بیماری سے محفوظ رہتے ہیں۔

جوشاندہ/ Herbal Tea: جوشاندہ کا استعمال عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے اور اس کا استعمال مختلف قسم کی بیماریوں میں ہوتا رہا ہے جیسے بخار، نزلہ زکام، امراض جگر اور معدہ کے امراض میں اس کا استعمال بہت اہمیت کا حامل ہے لہٰذا ڈینگو بخار میں بھی کچھ خاص قسم کے نباتات سے تیار شدہ جوشاندہ یا Herbal Tea کو تجویز کیا جاتا ہے۔

(1) دودھی کلاں (Euphorbia hirta) کے پورے پودے کو لے کر صاف پانی سے دھو لیں پھر ایک لیٹر پانی کو گرم کریں اور آگ کو ہلکا کر کے دودھی کلاں کو اس میں ڈالیں پھر کچھ دیر گرم کریں ٹھنڈا ہونے پر مریض کو ہر 3 گھنٹے کے بعد پلاتے رہیں۔

(2) نیم کی پتی کی چائے بنا کر استعمال کریں۔

(3) تلسی کی پتی کی چائے کالی مرچ کے اضافے کے ساتھ کافی مفید ہے۔

(4) زیتون کی پتی کی چائے اس میں کافی مفید ہے۔

(5) برگ چرائتہ کی بنی ہوئی چائے مفید ہے۔

بھپارہ (steam inhalation) سادہ پانی کو گرم کر کے اس کی بھاپ لینا ان بخاروں میں زیادہ مفید ہے جس میں ٹھنڈک لگ کر بخار آتا ہو۔ اسی طرح eucalyptus, Rosemary, tea trea, levandor کو پانی میں جوش دے کر اس کی بھاپ کو inhale کرنا بہت زیادہ مؤثر اور فائدہ مند ہے۔

لخلخہ (Aroma therapy) طب قدیم میں بہت سارے جسمانی، ذہنی اور روحانی امراض کے لیے لخلخہ کا استعمال کیا جاتا رہا ہے اور اس کو تحفظی تدابیر و علاج دونوں ہی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دراصل اس میں خوشبودار ادویات کو پانی میں حل کر کے سونگھا جاتا ہے جیسے: صندل سفید 6 ماشہ، کافور ایک گرام، گل ارمنی 6 ماشہ، عرق گلاب، عرق بیدمشک، عرق کیوڑہ، آب کشنیز ہر ایک 20 ملی لیٹر لے کر کسی چوڑے منہ کی شیشی میں محفوظ کر کے ڈھکن کو بند کر کے رکھ لیں اور پھر اسے وقفے وقفے سے سونگھتے رہیں اس طرح سے ہم ڈینگو سے ہونے والے نقصانات کو کم کر سکتے ہیں۔

ضماد (local application) سوتی کپڑے کو ٹھنڈے پانی میں تر کر کے بدن کو پوچھیں تاکہ بدن کا درجہ حرارت زیادہ نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ tea trea oil کو بدن پر ہلکے ہلکے لگائیں اور عرق گلاب، روغن بنفشہ کو ٹھنڈے پانی میں ملا کر لگائیں تاکہ بدن کا درجہ حرارت زیادہ نہ بڑھنے پائے۔

غسل (Bathing) ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا بخار کو کم کرتا ہے اس کے علاوہ خوشبودار روغنیات کو پانی میں ملا کر غسل کرنا زیادہ فائدہ مند ہے۔

■

Dr. Belal Ahmad (Guest Faculty), Do/ Amraze Jild, AKTC, AMU Aligarh, 202001- (UP)

تبصرہ وتعارف

مقالاتِ مسعود

مصنف: مسعود حسین خان

صفحات: 230، قیمت: 106 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر مجیب احمد خان، ای 62، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

ادبی دنیا میں پروفیسر مسعود حسین خان ماہر لسانیات، محقق اور ناقد کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ ان کی درجنوں تصانیف و تالیفات زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں۔ پیش نظر کتاب 'مقالاتِ مسعود' ان کے سولہ تحقیقی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ 'پیش لفظ' میں ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کونسل کی ادبی کارکردگی پر روشنی ڈالی ہے اور 'سخن ہائے گفتنی' میں پروفیسر مسعود حسین خان نے نہایت اختصار سے چند اہم مضامین پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

'مقالات مسعود' کا پہلا مضمون 'صوتیات کا خاکہ' اور دوسرا مضمون 'اردو لفظ کا صوتی و تجز صوتیاتی تجزیہ' ہیں جس میں صوتیات کے اصول وضوابط پر بحث کی ہے۔ تیسرا مضمون 'قومی یک جہتی اور ہندوستانی زبانیں' ہے۔ اس میں قومیت اور ہندوستانی زبانوں پر بحث کی ہے۔ اس میں انگلستان یا فرانس کی سی یک لسانی یا یک تہذیبی وحدت تلاش کرنا بے سود ہے۔ پھر بھی مشترک جغرافیائی حالات، تاریخ اور معیشت کے عناصر اس مختلف النسل باشندوں کو ایک وحدت میں جکڑے رہے ہیں۔ گو یہ ہندوستانی قومیت، قومیت کی اکثر شرائط سے عاری تھی۔ بہرحال یہ ایک اچھا مضمون ہے۔ چوتھا مضمون 'مطالعۂ شعر' (صوتیاتی نقطۂ نظر سے) اور پانچواں مضمون 'تخلیقی زبان' لسانیاتی اعتبار سے فکر انگیز مضمون ہیں۔

'اقبال کا صوتی آہنگ' میں موصوف نے بتایا ہے کہ غالب اور اقبال کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کا صوتی آہنگ فارسی کا ہے اس لیے بے بنیاد ہے کہ مذکورہ آوازوں (ف/ز/ژ/خ/غ/اور/ق) کو چھوڑ کر اردو کی باقی تمام آوازیں (بہ شمول مصوتے) خالص ہند آریائی ہیں۔ ہر چندان میں سے بعض فارسی عربی کے ساتھ اشتراک رکھتی ہیں۔ فارسیت کا الزام ان دونوں شاعروں کے شعری فرہنگ پر کیا جاسکتا ہے، صوتی آہنگ پر نہیں۔ یہ مضمون ادبی وفنی خوبیوں سے معمور ہے۔ ساتواں مضمون 'اقبال کے ترکیب بند' ادبی خوبیوں سے مزین ہے۔ آٹھواں مضمون کلام غالب میں قافیے اور ردیف کا آہنگ ہے۔

ایک مضمون 'غالب کی غزل کا ایک تجزیہ' ہے۔ اس میں غالب کی ایک غزل جس کے مطلع کا مصرع اولیٰ ہے 'سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں' میں آورد اور آمد، ردیف و قافیہ پر مدلل بحث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب اس طرحی غزل میں 50 فیصد کامیاب ہیں۔ انھوں نے اس غزل کا ادبی وفنی تجزیہ معروضی انداز میں کیا ہے۔ دسواں مضمون 'غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت' ہے۔ یہ مضمون مختصر ہے مگر لسانی اعتبار سے اس کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ گیارہواں مضمون 'فانی کی ایک غزل کا صوتیاتی تجزیہ' ہے جو لسانیاتی اعتبار سے غور وفکر کا متقاضی ہے۔ بارہواں مضمون 'اصغر گونڈوی کا ایک نقاد: نیاز فتح پوری' ہے۔ یہ ایک ادبی وفنی مضمون ہے۔ تیرہواں مضمون 'میرا شعری تجربہ' صحیح ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی شاعری کی ادبی وفنی خوبیوں کو مدلل پیش کیا ہے۔ چودھواں مضمون 'اردو لغت نویسی کے بعض مسائل' ہے۔ اس میں لغت نویسی کی تاریخ، اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے مسائل یعنی اردو حروف تہجی، اندراجاتِ لغت، املا کے مسائل، تلفظ کا مسئلہ، معنی کا تعین اور ترتیب وغیرہ ہیں۔

'گودان تا گئودان' ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں گئودان کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ اکثر اردو اور ہندی والے گودان اور گئودان میں فرق نہیں کرتے بلکہ گئودان کہتے ہیں۔ حالانکہ گودان ہندی میں کہتے ہیں۔ دراصل یہ سنسکرت ترکیب ہے۔ جب کہ گئودان اسی سے نقلی پراکرتی ترکیب ہے جو اردو کے لیے زیادہ فطری ہے۔ چونکہ گودان (ہندی) پریم چند کی وفات سے چند ماہ قبل شائع ہوگیا تھا۔ گو بعد میں پریم چند کے مترجم اقبال بہادر ورما سحر ہنگامی نے گودان (ہندی) سے گئودان (اردو) میں ترجمہ کیا۔ اس لحاظ سے گئودان (اردو) ایک ترجمہ ہے، تصنیف نہیں۔ البتہ یہ بات غور طلب ہے کہ 'اقبال بہادر ورما سحر ہنگامی نے پریم چند کی زبان و بیان کو اکثر اوقات جوں کا توں رکھا ہے۔ اس لیے اس ترجمے میں اصل تصنیف کی خوشبو شامل ہے اور اس بنیاد پر گئودان (اردو) کو تصنیف تسلیم کیا جاتا ہے۔ سولھواں مضمون 'اردو: مردم شماری کے آئینہ میں' ہے۔ اس میں 1961 اور 1971 میں ہندوستان، اس کے صوبہ جات اور ان کے اضلاع میں اردو کی مردم شماری کے رکارڈ پیش کیے ہیں۔ یہ بھی سچائی ہے کہ اردو کے سلسلے میں اعداد وشمار کی دھاندلی عرصہ دراز سے جاری ہے۔

'مقالات مسعود' معرکۃ الآرا مضامین کا مجموعہ ہے۔ امید ہے کہ ادبی دنیا میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

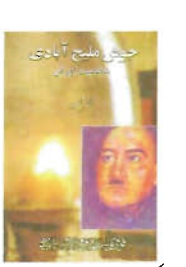

جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود

صفحات: 106، قیمت: 33 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: فردوس بانو فلاحی، A-187/3، شاہین باغ، نئی دہلی 25

جوش کا نام آتے ہی ان کی ایک مشہور ومعروف تصنیف 'یادوں کی برات' ذہن کے پردۂ سیمیں پر ظاہر ہوجاتی ہے۔ میں نے بر سبیل تذکرہ اس کتاب کا نام صرف بوجہ شہرت لیا ہے نہ کہ مقبولیت کے باعث 'یادوں کی برات' کی مقبولیت کیا ہے، کتنی ہے، اس سے صرف نظر کرتے ہوئے میں ظفر محمود صاحب کی تصنیف 'جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن' پر اپنی گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل جوش کی تاریخ پیدائش پر روشنی ڈالنا چاہوں گی۔ کیونکہ یہ قدرے مختلف فیہ مسئلہ ہے۔

جوش ملیح آبادی کا نام شبیر احمد خاں ہے، ان کی شخصیت کے ساتھ ان کا نام بھی بدل گیا اور وہ شبیر حسن خاں جوش ہوگئے۔ چونکہ ظفر محمود کی کتاب جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن پر تبصرہ مقصود ہے اس لیے جوش کی مختلف فیہ تاریخ پیدائش ظفر محمود صاحب کی تحقیق کے روشنی میں دیکھتے ہیں ''جوش کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں مورخین ادب میں تضاد ہے۔ کوئی ان کی تاریخ پیدائش 1894 لکھتا ہے تو کوئی 1896، اور کوئی 1898، مثلاً خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے، شبیر حسن خاں جوش 1894 میں اودھ کے ایک جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے۔''

ڈاکٹر فضل امام جوش کے بھتیجے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جوش ان کے والد نواب محمد یوسف خاں سے چار پانچ برس چھوٹے تھے۔ یوسف خاں کا سنہ ولادت جوش کے بھتیجے کے بیان کے مطابق 1886 ہے لہٰذا اس سے جوش کا سنہ ولادت 1890 یا 1891 قرار پاتا ہے۔

خود جوش نے 1940 میں دہلی میں ایک مسودے پر اپنی تاریخ پیدائش اس طرح درج کی ہے:

''ایں جانب کی تاریخ پیدائش پانچ دسمبر 1898 وقت پیدائش صبح چار بجے۔''

(جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن، ص 11-12)

ظفر محمود کی 106 صفحات پر مشتمل تصنیف کا پہلا عنوان 'پیش لفظ' ہے جو ڈیڑھ صفحات پر مبنی ہے۔ بعد ازاں 'ترتیب' کے نام سے فہرست دی گئی ہے جو نمبر شمار کے حساب سے سات نکات پر مبنی ہے۔ نمبر ایک حرفے چند، نمبر دو جوش کا سفر زندگی۔ تبصرے میں درج بالا تاریخ پیدائش کی تفصیل اسی دوسرے نکتے سے ماخوذ ہے۔ نمبر تین، جوش کے ادبی سرمایے کا تعارف، نمبر چار، جوش کی شاعری میں رومانوی عناصر، نمبر پانچ جوش بحیثیت ترقی پسند شاعر، نمبر چھ جوش کا شاعرانہ کمال، جب کہ ساتویں نمبر پر کتابیات ہے۔

حرفے چند کے تحت جوش کی شاعرانہ شخصیت کے مثبت و منفی خیالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 23 صفحات پر مشتمل 'جوش کا سفر زندگی' موضوع پر تفصیلی گفتگو ہے۔ اس وقت کے سیاسی حالات پر اظہار خیال کیا ہے اور اس ماحول میں جوش کے فکر ونظر اور ان کی شاعری کے مضامین واسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا تیسرا موضوع 'جوش کے ادبی سرمائے کا تعارف' ہے۔ یہ بحث بھی 23 صفحات پر مبنی ہے۔ اس میں جوش کی فکری، ادبی تشکیل و ذہن سازی کے ساتھ ان کی شاعری کے مجموعے پر بالترتیب گفتگو کی گئی ہے۔

چوتھا عنوان 'جوش کی شاعری میں رومانوی عناصر' ہے۔ یہ بحث ساڑھے سترہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اولاً ظفر محمود صاحب نے رومان کے مفہوم کو واضح کیا ہے اس کے بعد مغرب میں اور مغربی ادب میں رائج رومانی تصور ور دمانی تحریک پر روشنی ڈالی ہے نیز اردو ادب میں اس کے اثرات ومیلان ورجحان اور تحریک کے مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے۔

پانچواں موضوع 'جوش بحیثیت ترقی پسند شاعر' ہے۔ یہ بحث سوا سولہ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقا کی تفصیل ہے، اس کے مقاصد پر گفتگو ہے، اس کے اراکین کے جذبۂ عمل کی وضاحت ہے۔ 1936 کی لکھنؤ کانفرنس کا حال اور اس کے بعد ترقی پسند تحریک کی فعالیت وفعال رفقا واراکان کے احوال قلم بند ہوئے ہیں، 1936 میں الہ آباد میں ترقی پسندوں کی دوسری کانفرنس کا حال بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد ترقی پسندوں سے وابستہ ہوتے گئے ادبا وشعرا کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے ترقی پسند تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کا ایک نمائندہ شاعر جوش ملیح آبادی بھی ہے۔

چھٹا موضوع 'جوش کا شاعرانہ کمال' ہے۔ یہ موضوع ساڑھے چار صفحے کو محیط ہے۔ اس کے تحت جوش کی شاعری کے موضوعات اسلوب اور انفرادی طرز ادا کو بیان کیا گیا ہے۔ جوش کے نام سے وابستہ لفظ 'انقلاب' کی وسعت پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ دراصل جوش شاعری میں انقلابانہ وارد ہوئے ہیں جنھوں نے خود روایتی انداز کی شاعری کی لیکن تصرف کے ساتھ شاعری کا مزاج بدلا، لفظوں کے انتخاب واستعمال کا منہج تبدیل کر دیا۔

کتاب کا آخری موضوع کتابیات ہے جس میں ایک صفحے پر مشتمل چودہ بنیادی ماخذ اور ایک ثانوی ماخذ کی فہرست ہے۔ کتاب جوش شناسی کے لیے مفید ہے۔

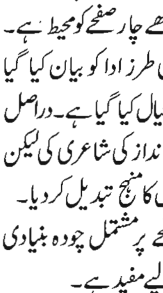

ساحل سیپ سمندر

مصنف: سیدہ شان معراج

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: تخلیق کار پبلشرز، دہلی

مبصر: شمس الرحمٰن فاروقی، 10 ہیسٹنگ روڈ، الہ آباد

سیدہ شانِ معراج کے کلام سے میں بہت دن سے واقف ہوں اور اس کا مداح بھی ہوں۔ ایک آدھ بار ان سے ملا تو ان کی سادگیِ مزاج اور شائستگی نے متاثر کیا۔ اس وقت ان کا مجموعہ سامنے ہے اس میں بھی مجھے وہی اوصاف نظر آتے ہیں جس کو میں اچھی شاعری کا خاصہ سمجھتا ہوں۔ لہجے کی شائستگی کے ساتھ نئے استعارے کی تلاش تھوڑی بہت فارسیت جس میں معاون ہوتی ہے اور حالِ دل کہنے کی ایک ادا جس میں بے تکلفی سے گریز اور بات کو بڑھا چڑھا کر کہنے کے بجائے کچھ سرسری اور اس بات سے بظاہر بے پروائی ہے کہ کوئی سن بھی رہا ہے کہ نہیں یہ ان کی شعر گوئی کے انداز ہیں۔

سیدہ شان معراج گرد وپیش کی دنیا سے بے خبر نہیں ہیں لیکن اپنے حال کی خبر زیادہ رکھتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے دنیا کو دیکھا تو ہے لیکن وہ اسے لائق اعتنا نہیں سمجھتیں۔ لیکن ایسے بھی شعر سیدہ شان معراج کے کلام میں موجود ہیں جہاں دونوں دنیائیں ایک ہو جاتی ہیں۔ اپنے ماحول میں وہ جو کچھ دیکھتی ہیں اس میں انھیں اپنا ہی المیہ نظر آتا ہے۔ لہجے کی یہ شائستگی، جذبے کا یہ خلوص ان دنوں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں حقیقی شاعرات کی تعداد بہت کم ہے اس کی خاص وجہ معاشرتی پابندیاں ہیں۔ آزادی کے بعد صورتِ حال میں کافی تبدیلیاں آئی ہیں اور آزادیِ نسواں کی تحریک کے زیر اثر خواتین میں بھی نہ صرف یہ کہ تعلیم کا رواج بڑھا ہے بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے لگی ہیں اور شعر وشاعری کے میدان میں بھی شاعرات آگے بڑھی ہیں۔ حالانکہ ابھی یہ تعداد قابلِ اطمینان نہیں کہی جا سکتی لیکن صورت حال امید افزا ضرور ہے۔

پچھلے دس بیس برسوں میں جن شاعرات نے اپنی شناخت مستحکم کی ہے اُن میں سیدہ شان معراج کا نام سرِ فہرست ہے۔ شانِ معراج یوں تو غزل کی شاعرہ ہیں مگر کچھ نظمیں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل کی شاعرہ ہیں۔ انھوں نے غزل کو اس کی تمام فنی باریکیوں کے التزام کے ساتھ ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ انھوں نے غزل کو عہد حاضر کے مسائل سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں جدت مصنوعی نہیں اور نہ انھوں نے ایسی علامتوں کا استعمال کیا ہے جو غزل کے روایتی اسلوب سے مطابقت نہ رکھتی ہوں۔ خود شان معراج نے اعتراف کیا ہے کہ ان کی شاعری تشبیہات وعلامات کے بے ضرورت استعمال سے بوجھل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں زبان کی سادگی، انداز بیان کے حسن کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔ ان کے لہجے میں سنجیدگی اور وقار ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

آرزو جینے کی ہے تو جی چٹانوں کی طرح — ورنہ پتے کی طرح تجھ کو ہوا لے جائے گی
ہم کو ہے ہر شام کچھ شمعیں جلا لینے کا شوق — کس کو فرصت ہے یہاں آنے کی آتا کون ہے
پرانے مقبروں کے زیر سایہ — نئے انداز کے گھر بن گئے ہیں
میری بستی میں سبھی شام سے سو جاتے ہیں — کون مجھ سے سبب نالہ شب پوچھے گا

عہد حاضر میں غزل نسوانی جذبات واحساسات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنی ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے مگر غزل کو محض انھیں جذبات کے اظہار تک محدود کر دینا غزل کے ساتھ زیادتی ہے۔ سیدہ شان معراج کی غزلوں میں نرمی، معصومیت اور ایک طرح کی سپردگی کی کیفیت ہے وہ انھیں جذبات کی مرہونِ منت ہے مگر ساتھ میں ان کے یہاں ایک طرح کی توانائی اور بلند حوصلگی بھی ہے:

ایک بستی سی بسی تھی میری آنکھوں میں مگر — میں جسے اپنا کہوں کوئی مکاں ایسا نہ تھا
آج وہ یادوں کی دستاویز جھوٹی ہوگئی — کوئی اُس بستی کے نقشے سے مرا گھر لے گیا
میرے اظہار کی ایک اک ادا اس کی تھی — میرے سینے میں چھپا سوزِ دروں بھی وہ تھا
آئینے عکس سے محروم نگہہ منظر سے — اب یہ تنہائی کا عالم ہے کہ سایہ بھی نہیں

انھوں نے خوابوں کی دنیا سجائی بھی ہے مگر حقائق سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔
امید ہے کہ اس مجموعۂ کلام 'ساحل، سیپ، سمندر' کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

گفتگو: دو بہ دو

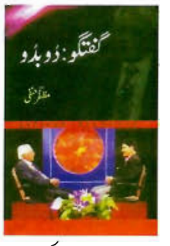

مصنف: مظفر حنفی
صفحات: 256، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ممتاز الحق، E-227، ابوالفضل انکلیو II، نئی دہلی

پروفیسر مظفر حنفی کا شمار ہمارے عہد کے سینئر ادبا اور شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی اب تک اسّی سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس سال موصوف کی شعری کلیات دو حصوں میں شائع ہوچکی ہے۔ زیر نظر تصنیف 'گفتگو: دو بہ دو' ان کی تازہ ترین کتاب ہے۔ یہ دو طرح کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ گفتگو کے تحت مختلف اداروں کے ذریعے کیے گئے گیارہ انٹرویوز ہیں جب کہ دو بہ دو کے عنوان سے 'ادبی شخصیات سے متعلق پرلطف باتیں' درج کی گئی ہیں جن کی تعداد تقریباً سوا تین سو ہے۔

انٹرویو سماجیات اور دیگر علوم میں بہت پہلے سے متعارف رہا ہے۔ ادبیات میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ اس کا عمل دخل بڑھتا جارہا ہے۔ الکٹرانک میڈیا اور ترسیل عامہ کی روزافزوں ترقی اور ہمہ گیر اثرات نے انٹرویو کا دائرہ بہت وسیع کردیا ہے۔ آج اخبار اور رسائل کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ادبی شخصیات سے انٹرویو کی ایک مستحکم روایت قائم ہوچکی ہے۔ اردو میں انٹرویوز کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں 'مظفر حنفی: سوالوں کے حصار میں' بھی ہے۔ اس مجموعے میں مختلف رسائل/اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے لیے گئے تیئیس انٹرویوز شامل ہیں 'گفتگو' اس کے بعد لیے گئے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ جن رسائل اور اخبارات کے لیے یہ انٹرویوز ریکارڈ کیے گئے ان کے نام درج ذیل ہیں: 'چارسو' (راولپنڈی)، 'ادیب انٹرنیشنل' (لدھیانہ)، کوہسار جرنل (بھاگل پور)، انقلاب (ممبئی)، ایوان اردو (دہلی)، چوتھی دنیا (نوئیڈا)، اردو دنیا (نئی دہلی)، بزم سہارا (نوئیڈا)، بے باک (مالیگاؤں)، کنٹمپرری وائس (چنڈی گڑھ) انگریزی رسالہ جس کا اردو ترجمہ شامل کتاب ہے۔

ادبی شخصیات کے انٹرویو میں کچھ مخصوص سوالات کیے جاتے ہیں۔ وقت کی پابندی کی وجہ سے طوالت سے بچنا بھی ضروری ہے۔ ان انٹرویوز میں عام طور پر خاندانی پس منظر، ابتدائی زندگی کے حالات، تخلیق کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی، شعرا یا اساتذہ یا ماحول جس سے تحریک حاصل کی، موجودہ ادبی صورتِ حال، شاعر یا ادیب کی اپنی انفرادیت، اس کے کارناموں کا کس حد تک اعتراف کیا گیا؟ اعزاز وانعامات کی ایک ادیب کے لیے کیا اہمیت ہے؟ ادبی گروہ بندی کے اثرات، تخلیق کار کی مخصوص صنف سے دلچسپی کی وجہ، معرکۂ تخلیق وتنقید، ادبی تحریکات، مشاعروں کی اہمیت اور موجودہ صورت حال اور اردو کے مستقبل سے متعلق سوالات کیے گئے ہیں۔

مظفر حنفی کے یہ انٹرویوز کئی لحاظ سے منفرد کہے جائیں گے اوّل تو ان کی صاف گوئی، بیباکی اور حق پسندی جو ان کی تحریروں کی پہچان ہے ان انٹرویز میں بھی بہت نمایاں ہے وہ کسی ادبی یا معاشرتی پہلو سے متعلق دوٹوک رائے رکھتے ہیں اور اسے پیش کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ ان انٹرویوز میں کچھ ایسے مباحث بھی سمت آئے ہیں جن کا جواب دینا آسان نہیں ہوتا۔ مثلاً اپنی بسیار گوئی سے متعلق پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

''بسیار گوئی اور کم گوئی کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ یہ دونوں باتیں کسی شاعر کے اچھے یا برے ہونے کا پیمانہ نہیں بن سکتیں... میرا پیمانہ یہ ہے کہ زیادہ کہے یا کم کہے مگر اچھا کہے اگر آپ نے اچھا کہا ہے اور زیادہ کہا ہے تو آپ اس سے بڑے شاعر ہیں جس نے اچھا تو کہا ہے مگر کم کہا ہے۔'' (ص: 40)

کتاب کے دوسرے حصے 'دو بہ دو' میں شامل 'ادبی شخصیات سے متعلق پرلطف باتیں' معنی خیز ہیں ان کی بڑی تعداد روزنامہ انقلاب میں شائع ہوچکی ہے۔
ان میں متعلقہ شخص کے ساتھ مظفر حنفی کی اپنی شخصیت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اچھی حسِ مزاح رکھتے ہیں معمولی باتوں میں کوئی نکتہ تلاش کرنے میں وہ ماہر ہیں اس لیے ان کی ان پرلطف باتوں کو 'حاضر جوابیاں' کا بھی عنوان دیا گیا ہے۔ موصوف کی باتیں محض دلچسپ گفتگو تک محدود نہیں ہوتیں وہ ایسے موقعوں پر کام کی بات کہنے سے باز نہیں آتے چاہے اس کے لیے انھیں سخت لہجہ ہی کیوں نہ اپنانا پڑے۔ اپنی ان باتوں کو انھوں نے عنوانات بھی دیے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

''مذاکرہ کم تکرار زیادہ'' احباب سون مرگ جانے کی تیاری کررہے تھے کہ سری نگر دوردرشن سے ایک صاحب آگئے اور کہنے لگے۔ ''مظفر صاحب! ہمارے ڈائرکٹر صاحب (مظہر امام) نے آپ کو بلایا ہے، ٹی وی کے لیے نئی غزل پر آپ کو شہاب جعفری کے ساتھ ایک مذاکرے میں شرکت کرنی ہے۔''

اس کتاب سے نہ صرف یہ کہ مظفر حنفی کی کتاب زندگی کے کئی اوراق سے قاری آشنا ہوتا ہے بلکہ انٹرویو کے فن کی بھی اسے اچھی واقفیت ہوجاتی ہے۔ یہی اس کی اشاعت کا مقصد بھی ہے۔

سرسید اور ہندوستانی نظامِ زراعت

مصنف: پروفیسر افتخار عالم خاں
صفحات: 152، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر محمد امان اللہ
دھنر پا، پوسٹ رام نگر، ضلع مغربی چمپارن 845106 (بہار)

پروفیسر افتخار عالم خان مشہور ومعروف شاعر وصحافی غلام ربانی تاباں کے صاحب زادے ہیں۔ انھوں نے امریکہ سے میوزیم مینجمنٹ کی تربیت حاصل کی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا۔ عراق، صومالیہ میں ملازمت کرنے کے بعد دہلی لکھنؤ اور علی گڑھ میں میوزیم مینجمنٹ کے شعبوں میں کام کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سرسید اکادمی کے آنریری ڈائرکٹر کا عہدہ بھی سنبھالا، انھوں نے سرسید سے متعلق مختلف موضوعات پر آٹھ کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن میں سرسید اور جدیدیت، سرسید تحریک کا سیاسی وسماجی پس منظر، سرسید درون خانہ، سرسید اور فن تعمیر وغیرہ کافی مقبول ومعروف رہی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب سرسید پر ان کی 9ویں تصنیف ہے۔

پروفیسر افتخار عالم خان کو اردو زبان وادب سے پیار اپنے والد سے ورثے میں ملا ہے۔ علی گڑھ کے علمی وادبی ماحول نے ان کے شوق ادب کو مزید جلا بخشی۔ ان کی کتابوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ مختلف کرنے کی جستجو میں سرگرداں رہے ہیں۔ انھوں نے سرسید پر جتنی بھی کتابیں تصنیف کی ہیں وہ سبھی اپنے موضوعات کے اعتبار سے تنوع رکھتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'سرسید اور ہندوستانی نظام زراعت' بھی اپنے موضوع پر واحد کتاب ہے۔ کہاں سرسید اور کہاں ہندوستانی نظامِ زراعت ایک عام انسان سرسید کو مفکر،

دانشور، مصلح قوم اور صحافی کے طور پر جانتا ہے لیکن فاضل مصنف نے اس کتاب کے ذریعے سرسید کو ہندوستانی نظامِ زراعت سے جوڑنے کی سعی کی ہے جو یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ مذکورہ کتاب تین ابواب میں تقسیم کی گئی ہے اور جن کے تحت مختلف ذیلی ابواب بھی دیے گئے ہیں۔

کتاب کے تعلق سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی پیش لفظ میں تحریر کرتے ہیں:

''اس ضمن میں پروفیسر افتخار عالم خان نے اپنی پے در پے شائع ہونے والی متعدد کتابوں کے وسیلے سے اپنے اس اختصاص کو علمی اور تحقیقی دنیا میں محفوظ کرالیا ہے کہ انھوں نے سرسید شناسی کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی توجہ صرف کی جن کا پوری طرح اہل علم کے سامنے نہ آنا سرسید شناسی کے بنیادی تقاضوں کے منافی تھا۔'' (ص 1)

کتاب کا آغاز ہندوستانی زراعت کی ابتدا اور ارتقا سے ہوتا ہے۔ مصنف نے کتاب میں ہندوستانی زراعت کے حوالے سے تاریخی و معاشی معلومات یکجا کردی ہے۔ 1857 سے قبل کے ہندوستانی زرعی نظام کا پورا منظرنامہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے باب میں سرسید کے ذریعے سائنٹفک سوسائٹی کے قیام سے لے کر ان کے مختلف زرعی منصوبوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں سرسید اور ہندوستانی زراعتی ترقی کے منصوبے، زرعی اصلاحات، ملوکانہ نظامِ حکومت جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

یہ کتاب سرسید شناسی کے باب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

کتاب سے نہ صرف ہندوستانی نظامِ زراعت کے سلسلے میں سرسید کے موقف اور ان کی کوششوں کا بھی علم ہوتا ہے۔

پروفیسر افتخار عالم خان نے سرسید کی مختلف تحریروں، یادداشتوں، حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ سرسید کے وقت میں برٹش سرکار کی بنائی گئی زراعتی پالیسیاں کاشت کاروں و دیہی عوام کے لیے بہت بہتر نہیں تھیں اور اس میں بہتری کی گنجائش تھی۔ سرسید نے مختلف مواقع پر اس سلسلے میں کئی تجاویز پیش کی تھیں جن کا اطلاق آج کے دور میں بھی ممکن ہے۔ سرسید کی دور بینی اور عبقریت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ انھوں نے آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل زراعت اور کاشت کاری کو جدید ترقی سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کوشش بھی کیں۔ کتاب بے حد آسان اور عام فہم زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ پروف کی غلطیاں کم ہونے سے کتاب کی دلکشی میں اضافہ ہوگیا ہے۔

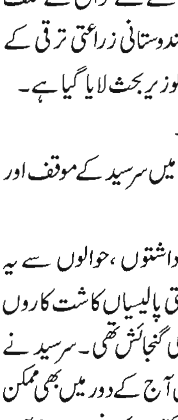

مشاہیر بدایوں

مصنف: محمد تنویر خاں قادری

صفحات: 156، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: بزمِ قرطاس وقلم، بدایوں

مبصر: رابعہ ناز، 350 کوینا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

اردو زبان وادب کی ارتقا اور ترقی میں صوفیا کرام کا اپنا ایک الگ مقام رہا ہے۔ صوفیا کرام کا سلسلہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام اسلامی ممالک میں ایک لمبے عرصے پر محیط ہے۔ صوفی ازم کے تحت مختلف خانوادے اور پیر و مرشد کے سلسلے بھی شروع ہوئے۔ زیر تبصرہ کتاب 'مشاہیر بدایوں' (مجموعۂ مضامین) اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے 'بزم قرطاس وقلم۔ بدایوں' نے شائع کیا ہے۔ مشاہیر بدایوں کے مصنف ''محمد تنویر خاں قادری ہیں جو خود بھی صوفی مشرب ہیں اور مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں سے وابستہ ہیں۔ اس کتاب میں خاص طور سے بدایوں سے وابستہ مشہور و معروف شخصیات کا تذکرہ ہے۔ قریب 156 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں 21 مشہور ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ کتاب میں جن مضامین کو شامل کیا گیا ہے ان میں ہند و پاک کے رسائل میں شائع ہو چکے مضامین کے علاوہ وہ مضامین بھی شامل ہیں جو شائع نہیں ہو سکے تھے۔

کتاب کا انتساب مصنف نے اپنے تایا اور والد کے نام کیا ہے۔ کتاب میں جن لوگوں کی تقریظات شامل ہیں ان میں محمد سالم قادری' اسید الحق قادری' قاضی الیاس رشید 'شاداب ذکی بدایونی' نجمی قادری بدایونی' ڈاکٹر مسرت اللہ خاں اشرفی اور رضیہ پروین ہیں۔ یہ تمام افراد بھی بدایوں سے تعلق رکھنے والے ہیں اور درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ تقریظات کے بعد مصنف کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ پیش لفظ میں مصنف نے اپنی زندگی کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان خطوط کو بھی شامل کیا ہے جو اسید الحق قادری صاحب نے اپنے مصر میں قیام کے دوران لکھے تھے۔

کتاب میں شامل بیشتر مضامین بزرگانِ دین کے حوالے سے ہیں۔ ان بزرگ ہستیوں میں حضرت میرانجی صاحب کا ذکر سب سے پہلے مضمون میں کیا گیا ہے اس کے بعد ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے قائم ہونے کے درمیان اس وقت کے بدایوں کے مشہور صوفیا کرام اور اولیا کا ذکر کیا ہے۔ ان اسلامی حکومتوں میں سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان شمس الدین التمش کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں تاریخی نقطہ ? نظر سے اہم مضامین ہیں۔ ان کے علاوہ یمن کے شہزادے: سرکار کے حالات' حضرت پیر مکہ صاحب 'خواجہ سید احمد بخاری عیہ الرحمتہ' حضرت خواجہ ضیا دین نخشبی' حضرت حاجی جمال ملتان' عہد اکبری کے ممتاز مورخ عبدالقادر بدایونی' عین الحق حضرت مولانا شاہ عبدالمجید قادری قدس سرہٗ' امام العلما حضرت مولانا شاہ' فضل رسول بدایونی قدس سرہٗ' مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی' سید العلما اعلیٰ حضرت تاج الفحول' مولانا عبدالقادر بدایونی قدس سرہٗ' صاحب الاقتدار حضرت مولانا' عبدالمقتدر بدایونی قدس سرہٗ' عاشق الرسول حضرت مولانا شاہ' عبدالقادر بدایونی قادری دولہا قدوس سرہ'' رہنمائے قوم وملت حضرت مولانا عبدالماجد بدایونی' شکیل بدایونی: کچھ روشن یادیں' حضرت مفتی اقبال حسن قادری بدایونی' شاعرا? ستانہ شاد قادری لکرالوی' رونق بدایونی اور ممتاز تاریخ داں: ضیاعلی خاں اشرفی کے عنوانات سے مضامین شامل ہیں۔ آخر کے چار مضامیں ادب کے طلبا کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان میں شکیل بدایونی جیسے بڑے شاعر کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے ان کی حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ادب میں ان کا مقام اور فلمی کیریئر پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے۔ شاد قادری' رونق بدایونی اور تاریخ داں ضیا علی خاں اشرفی کے حوالے سے جو مضامین شامل ہیں وہ معلوماتی ہیں۔ مظامین کے بعد حوالہ جات کا التزام ہے مصنف کی مطبوعہ کتب کی بھی فہرست شامل کی گئی ہے۔ تصویروں کا گوشہ ان کے علاوہ ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب صوفی ازم پر کام کرنے والے طلبا کے لیے مفید ہے۔ خاص کر بدایوں کی تاریخ اور بدایوں کی اہم شخصیات کے حوالے سے یعنی' مشاہیر بدایونی'۔

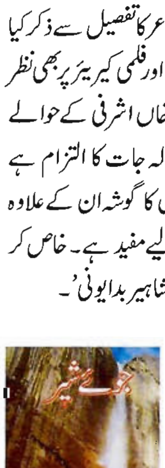

جوئے شیر

مصنف: محمد شاہد پٹھان

صفحات: 224، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: مصنف

مبصر: شاہ نواز حیدر شمسی، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

غزل اردو کی شعری اصناف میں ممتاز اور نمایاں ہے۔ اس صنف میں رمز وایما اور ایجاز واختصار کا ہنر ہی کا کمال ہے اور اسی سے اس کی جمالیات کا تعین ہوتا ہے۔ غزل میں شائستگی، سنجیدگی و پاکیزگی کی جو فضا ہے اور جلوہ خیزی و سحر آمیزی کی جو کیفیت ہے یہ اس

کا طرۂ امتیاز ہے۔ غزل کے گیسوؤں کو سنوارنے اور اسے آبرو عطا کرنے میں جن شعرا نے اہم کردار ادا کیا اس میں جدید غزل کے حوالے سے شاہد پٹھان کا نام لیا جاسکتا ہے۔

شاہد پٹھان کی شاعری تخلیقی رعنائی اور دلکشی سے پر ہے ان کے اندر انسان فہمی اور اس کے توسط سے زمانے کے احساس و ادراک کا کافی اچھا شعور ملتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے مسائل و مباحث پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اس کے پیچ وخم سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل میں انسان کے ذاتی اور اجتماعی کرب کو خصوصی طور پر جگہ دی ہے۔ شاہد پٹھان کی غزلوں میں عصری حسیت کے علاوہ کلاسیکی اقدار اور روایات کے اہتمام وانسلاک کی بہت خوبصورت اور زندہ جاوید تصویریں ملتی ہیں۔ 'جوئے شیر' کے مطالعے سے ایسا ہی تاثر قائم ہوتا ہے۔

'جوئے شیر' شاہد پٹھان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو 2013 میں شائع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ خالص غزلوں پر مشتمل ہے۔ شاعری کے علاوہ شاہد پٹھان کی دوسری ادبی جہت ناقد کی ہے ان کے تنقیدی مضامین کے چار مجموعے زرنقد: 2009، تعبیر وتاویل: 2011، تفہیم وتنقید: 2012، ادب، تہذیب اور تنقید: 2013 کے نام سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ تخلیقی ذہانت کے ساتھ ساتھ تحقیق وتنقید سے ان کا حد درجہ انہماک بلا شبہ ان کی فکری پختگی اور فنی ریاضت ومہارت پر دلالت کرتا ہے۔

شاہد پٹھان کا شعری مجموعہ 'جوئے شیر' 108 غزلوں پر مشتمل ہے۔ چار تنقیدی مقالات کے مجموعے کو جب اس کے مدمقابل رکھتے ہیں تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہوس پرستی اور رکاکت پسندی کی وبا سے آزاد ہیں اور معروضیت ورجائیت کے قائل ہیں۔ اس باعث انھیں کلاسیکیت و روایت اور تہذیب وتقدس سے نسبت ہے اور وہ قدما کے قبیلے کا رکن معلوم ہوتے ہیں۔ شاہد پٹھان کی غزلوں میں حیات وکائنات کی دھڑکنیں اور یہ کروٹیں درآتی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی مختلف رنگوں حرکتوں اور ہیئتوں میں رقصاں نظر آتی ہے۔ ان کیفیتوں سے بیشتر رنج وغم اور ظلم وجبر کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں انسانیت کے درد وغم اور مصائب وآلام کو ہی نہیں پیش کرتے بلکہ ظلم وزیادتی، جبر واستحصال، ناانصافی اور حقوق کی پامالی پر بھی آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔

ان کی زبان بھی شگفتہ وسریع الفہم ہے۔ موضوعات ومسائل بھی اہم اور اسلوب بھی دلکش وجاذب نظر۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

اسی لیے تو سفر کا جنون زیادہ ہے — ہماری راہ میں دشوار مرحلے ہیں بہت
زیست کا ہر رنگ ہر منظر ہے مجھ میں جلوہ گر — چشم بینا کے لیے ایک آئینہ خانہ ہوں میں
یہی اہل محبت کا طریق زندگانی ہے — کبھی خون جگر کرنا، کبھی دل کو لہو کرنا
کتاب حسن کی تفہیم آساں ہے کہاں ایسی — کہ اٹھتے ہیں معانی سے حجاب آہستہ آہستہ
نماز عشق سے اپنی جبیں کو سرخرو کرنا — نہ ہو پانی تو پھر خون جگر ہی سے وضو کرنا

مجموعی طور پر شاہد پٹھان کا فن عصری حسیت، کلاسیکی اقدار اور حیات انسانی کی تصویروں کی واقعیت اور قطعیت کے ساتھ پیش کرنے کا فن ہے۔ ان کی شاعری فطری و تخلیقی ہے۔ وہ جہد مسلسل اور تلاش وتجسس کے عادی ہیں اور ان عناصر سے اٹھتے ہوئے شرارے نے ان کے اشعار میں بھرپور دلچسپی و دلکشی کے ساتھ جادو کا سا اثر پیدا کردیا ہے۔ اس بنیاد پر 'جوئے شیر' میں شامل غزلیں لائق تحسین و قابل داد ہیں۔ وہ ہمارے مطالعے ومشاہدے کا متقاضی ہے۔ 224 صفحات پر مشتمل شعری مجموعہ 'جوئے شیر' اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ کتاب کے ابتدائی اور اواخر چند اوراق میں شامل ناقدین ادب اور دانشوروں کے تاثرات بھی شاہد پٹھان کے فکر وفن کی تفہیم وتحسین میں بہت حد تک معاون ہیں۔ اس ذیل میں بطور خاص پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر علیم اللہ حالی، علقمہ شبلی، ڈاکٹر یعقوب یاور اور عبدالاحد ساز کی تحریریں لائق توجہ ہیں۔ یہ تحریریں اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ اردو غزل کا مستقبل شاہد پٹھان جیسے شعرا کے ہاتھوں محفوظ ہے۔ کتاب کے صفحات اور طباعت معیاری مگر قیمت غیر مناسب ہے۔ نئی نسل اور نوجوان طالب علموں کو شعر وادب کی طرف راغب کرنے کے لیے دیگر متعلقات واقدامات کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کتابیں معقول رقم میں دستیاب کرائی جائیں۔

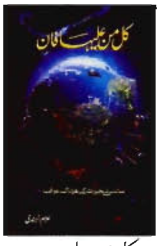

کل من علیہا فان

مصنف: علام الہندی

صفحات: 110، قیمت: 105، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: پرنٹیا پبلی کیشنز

مبصر: محمد زکریا ندوی، 206 ستلج ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

علم وادب کی دنیا میں علام الہندی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ کل من علیہا فان ان کے رشحات قلم کا بہترین شاہکار اور 'دریا بکوزہ' کے صحیح مصداق ہے۔ یہ کتاب 15 مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ مؤلف کے پاس جدید سائنسی معلومات اور مطالعات کا ایک خزانہ موجود ہے۔ بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی باتوں کو ادبی شگفتگی، موزوں الفاظ اور غیر معمولی روانی وسلاست کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انداز وبیان اور مضامین کی ندرت کے اعتبار سے یہ کتاب موجودہ سائنسی دور کے تناظر میں شاذ کا درجہ رکھتی ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی سابق صدر شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، پٹنہ کے استقبالیہ کلمات نے کتاب کی اہمیت میں اضافہ کردیا ہے۔ یہ کتاب انسانی آبادی اور خاص طور پر دور جدید کے تعلیم یافتہ ذہنوں کے لیے ایک تازیانۂ عبرت ہے۔ یہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ بلاشبہ انٹرنیٹ اور ٹیلی مواصلات نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں (گلوبل ولیج) میں تبدیل کردیا ہے۔ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کی خبر منٹوں اور سکنڈوں میں مل جاتی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی اس حیرت انگیز ترقی سے انکار کی گنجائش نہیں۔ لیکن انسانی معاشرے کو یہ چیزیں کتنی مہنگی پڑ رہی ہیں، جناب علام الہندی نے اعداد وشمار اور حقائق کے معقول اور مدلل تفصیلات کے توسط سے ہمارے ذہنوں میں سائنسی تسخیرات کے ہولناک نتائج کا احساس دلاکر مستقبل کی بربادیوں سے ہمیں آگاہ کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کتاب کا آغاز ایک فُکاہیہ سے کیا گیا ہے۔ فُکاہیہ میں پوشیدہ سوالات انسان کی ذاتِ واحد سے لے کر اس کے کنبے، معاشرے، ملک اور ساری دنیا کے انسانوں کے ساتھ اس کے روابط کی سطحیت، انسان کی خود فریبیاں، خوش فریبیاں، ریاکاریاں اور سائنسی ایجادات کے ذریعے ساری دنیا کے انسانوں کا تکنیکی استحصال وغیرہ کا تشفی بخش جواب مطلوب ہے۔

فطرت ایک توازن پر قائم ہے اور انسان کی ترقی پذیری فطرت کے اس توازن کو پے درپے جھنجھوڑ رہی ہے۔ مہمیز مشتعل کر رہی ہے۔ اگر فطرت برانگیختہ ہوگئی تو؟ کار گہ فطرت ہزاروں، لاکھوں سونامیاں ڈھالنے اور ڈھانے پر قادر ہے۔ اور تب قسم ہے زمانے کی کہ انسان خسارے میں ہوگا۔ اس کتاب میں مؤلف نے اپنی گفتگو ماحولیات اور سائنسی ایجادات تک محدود رکھی ہے۔ لہٰذا ان کا اشارہ دنیاوی خساروں کی طرف ہے۔ ورنہ ایمان والے، نیک عمل کرنے والے، اور حق پر ثابت قدم رہنے والے کا کیا خسارہ ہے۔

ڈیجیٹل ڈوائسز اور ہمارا شوق ارتباط کے حوالے سے مؤلف نے بڑی حقیقت آمیز بات کہی ہے کہ آج نوجوان کے لیے موبائل فون اسٹائل اسٹیٹس اور نشان امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ عصر حاضر کے لٹیرے اس موبائل فون کے سحر سے انسان کا سب کچھ اس کمال ہنرمندی

سے لوٹ رہے ہیں کہ اُس کو اِس کا احساس تک نہیں ہو رہا ہے۔ نیز جدید ٹکنالوجی انسان کی قوتِ فکر کے لیے رحمت کے ساتھ ساتھ بسا اوقات زحمت بن جاتی ہے۔

کل من علیہا فان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز فانی ہے۔ ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے مقصدِ تخلیق پر غور کرتے ہوئے عمل صالح کر کے آخرت کی پونجی تیار کرنا چاہیے، اور موت آنے سے پہلے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔ اسی طرح کرۂ ارض کے ماحولیاتی توازن اور عدم توازن، گلوبل وارمنگ کے اسباب اور اس کی تباہ کاری، آبی وسائل، فاسٹ فوڈ اور جنک فوڈ نیز پلاسٹک کے استعمال سے ہونے والے خطرات کو جس محققانہ انداز اور منطقی استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے یہ ان کی علمی پختگی، فکر و فن کی بالیدگی، بلند نگاہ اور وسیع المطالعہ ہونے کی دلیل ہے۔

اس کتاب کا آخری مضمون 'ہر سچ کو چیلنج کرتا ایک سچ' کے تحت مؤلف نے ایک مزید بات یہ کہی ہے کہ گلوبل وارمنگ کا دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ ہے گلوبل کولنگ، یعنی ارضی یخ بستگی۔ گلوبل وارمنگ کا قانون جہاں براہ راست کاربن ڈائی آکسائڈ کے تناسب پر مبنی ہے وہیں گلوبل کولنگ کا قانون کرۂ ارضی کے محوری جھکاؤ، اس کی گردش کے راستے کی شکل اور محوری سمت میں قدرتی تبدیلیوں کے بارے میں بات کرتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ زمین ہمیشہ تغیر پزیر رہتی ہے اس میں انسانی دخل اندازی کے شواہد مشکل سے ہی ملیں گے، سچ تو یہ ہے کہ آج کا ہر سچ اپنی جلو میں جھوٹ اور فریب کے اتنے رہوار لے کر آتا ہے کہ سارا ماحول گرد و غبار سے اٹ جاتا ہے۔ سارے مناظر دھندلکوں میں گم ہو جاتے ہیں اور فضا میں ان کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

موضوع کی قدر و قیمت اور کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مجھے قوی امید ہے کہ یہ کتاب شوق کے ہاتھوں لی جائے گی اور قدر کی نگاہوں سے پڑھی جائے گی۔

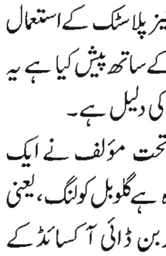

انیسویں صدی میں اردو زبان

مصنفہ: ناہید فاطمہ

صفحات: 354 قیمت: 350 روپے

ناشر: فیصل پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر شفقت اعظمی 'دلکشا'، این 49، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب یعنی 'انیسویں صدی میں اردو زبان' دراصل ڈاکٹر ناہید فاطمہ نے معروضی انداز میں محض اس نیک نیتی کے ساتھ لکھی ہے کہ ان کے اس اندازِ نگارش سے ممکن ہے کہ ملک کی دو بڑی زبانیں ایک دوسرے سے قریب آ جائیں اور باہم دگر شیر و شکر بن کر رہنے لگیں اور ہندوستان کی اکثریت یہاں کی سب سے بڑی اقلیت سے اس طرح ہمکنار ہو جائے جیسا کہ آزادی سے پیشتر اس کی مثالیں ملا کرتی تھیں۔ یہ ملک کثیر المذاہب، کثیر اللسان اور ہمہ جہت ہونے کے باوصف فسطائی طاقتوں کے علی الرغم اتحاد و اتفاق کا جو منظر پیش کرتا ہے اس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ کثرت میں وحدت کے اس حسن کو انگریزوں نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ وہی انگریز جنھوں نے تجارتی نقطۂ نظر سے ہی سہی یہاں کی مقبول ترین، نیز شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک بولی جانے والی زبان یعنی اردو کے فروغ کے لیے فورٹ ولیم کالج قائم کیا، جس کی بیش بہا خدمات سے انکار کی گنجائش بھی نہیں، لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ملک میں چھوٹی بڑی کئی سو زبانیں اور بولیاں رائج ہونے کے باوجود باہم برسرِ پیکار نہیں، لیکن چونکہ اردو اور ہندی پورے ملک میں نہ صرف رابطہ کی زبان ہیں بلکہ انھیں نمائندہ زبانوں کی حیثیت سے بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا انگریزوں نے نفاق کی غرض سے انھیں بطور حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مصنفہ کی تحقیق کے مطابق انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج کے پس پردہ نہایت لطیف زہر دینا شروع کر دیا۔ انھوں نے ایک سازش کے تحت ہندوؤں کو آلۂ کار بنا کر مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ انھوں نے مسلمانوں کو ظالم و جابر ثابت کرنے کے لیے تاریخ کو مسخ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ لسانی تفرقہ کا زہر کچھ اس انداز میں انجکٹ کیا کہ تمام تر کوششوں کے باوجود بابِ وطن کے دلوں سے گردِ کدورت دور نہ ہوئی۔ اس تحقیقی کتاب کے درج ذیل پانچ ابواب میں حقائق و معارف کو اس نادر انداز میں سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے کہ اگر اس کا معروضی مطالعہ تعصب کی عینک اتار کر کیا جائے تو کتنے مفروضات کا قلع قمع ہو جائے گا اور کتنے پندار کے بت خود بخود ٹوٹ جائیں گے:

بابِ اول: اردو ہندی بیسویں صدی سے قبل، باب دوم: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات پر مبنی ہے۔ بابِ سوم: ہندوستانی عوام کی بیداری پر مشتمل اس باب میں ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال، ہندوؤں میں مسلم منافرت کی تخم ریزی مذہب کی بنیاد پر تقسیم کی کوششیں، زبان کی بنیاد پر تقسیم کی کوششیں جیسے اہم موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بابِ چہارم میں ہندی اردو تنازعہ اور اردو ہندی حامیوں کی شدت پسندی پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب کا واحد مقصد اردو اور ہندی کے باہمی تنازعات کی حقیقت کی عکاسی اور ان کا حل تلاش کرنا ہے۔

کتاب کے آخری باب اردو ہندی انیسویں صدی کے بعد کی جھلک پیش کرتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آزادئ ہند کے سلسلے میں اپنی عظیم الشان خدمات اور فقید المثال قربانیوں کے باوصف آج قومی زبان کا درجہ حاصل ہونا تو درکنار حقیقی معنوں میں اس کی علاقائی حیثیت بھی نہیں رہ گئی۔

بالکل منفرد زاویے سے لکھی جانے والی یہ کتاب مخلصانہ جذبِ دروں کی غماز ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس اہم تحقیقی کتاب کے تراجم ہندی اور انگریزی زبانوں میں بھی شائع کیے جائیں، تا کہ اس کا دائرہ مزید وسیع ہو اور برادرانِ وطن کے دلوں کی کدورت اور غلط فہمیاں دور ہوں نیز لسانی و مذہبی خلیجیں نہ صرف کم بلکہ ختم ہو جائیں۔

زبان انتہائی سلیس، کتابت وطباعت دیدہ زیب اور کاغذ معیاری ہے۔ ہارڈ باؤنڈ مع خوبصورت ڈسٹ کور نے صوری حسن سے مزین کیا ہے۔

سہوِ کتابت سے کافی حد تک پاک اس معلومات آفریں اور خوبصورت پیشکش پر ڈاکٹر ناہید فاطمہ مستحق مبارکباد ہیں۔ امید کہ اردو کے شیدائیوں اور سنجیدہ قارئین کے حلقوں میں اس کی بھر پور پذیرائی ہوگی اور ان خطوط پر دیگر محبان اردو اربابِ قلم کے دلوں میں بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کا داعیہ ضرور پیدا ہوگا۔

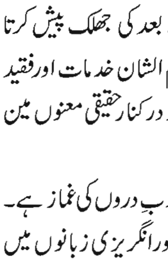

عظیم صحافی، عظیم رہنما: ابو الکلام آزاد

مصنف: احمد سعید ملیح آبادی

صفحات: 208، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن، نئی دہلی

مبصر: محمد شمس الدین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

مولانا ابوالکلام آزاد کی حیثیت سیاسی اور ادبی لحاظ سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی خدمات پر اب تک بہت ساری کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ بلکہ مولانا آزاد کی تعلیمی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے 11 نومبر کو قومی یوم تعلیم بھی منایا جاتا ہے۔ احمد سعید ملیح آبادی کی کتاب 'عظیم صحافی، عظیم رہنما: ابوالکلام آزاد' میں بھی ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ مگر یہ کتاب دیگر کتابوں سے مختلف ہے۔ اس میں کسی

ایک موضوع کے تحت نہیں بلکہ مختلف اوقات کے مختلف موضوعات کو شامل کیا گیا ہے۔

دراصل احمد سعید ملیح آبادی کی یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مولانا آزاد کے انتقال کے بعد مختلف اوقات میں اپنی صحافتی زندگی میں تحریر کی۔ اس کتاب میں تقریباً 16 موضوعات ہیں جن میں ان کی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر نظر ثانی کی گئی ہے۔

کتاب کے شروع میں ایک خط اور ایک مضمون بھی شامل کیا گیا ہے جو عزت مآب کے رحمٰن خاں، مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور، حکومت ہند کا ہے۔ احمد سعید ملیح آبادی نے اپنی اس کتاب میں مولانا آزاد کی سیاسی، سماجی اور ادبی خدمات کے علاوہ دیگر موضوعات کو بھی شامل کیا ہے۔ 'مولانا آزاد کی پڑوسن' اور 'وہ دو کتابیں مولانا کی نہیں ہیں' مختلف انداز کے مضامین ہیں۔ جس میں 'سواد اعظم' اور 'انسانیت موت کے دروازے پر' کو مولانا کی تصنیفات ہونے سے انکار کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ تصنیفات عبدالرزاق ملیح آبادی کی ہیں۔

احمد سعید ملیح آبادی کے والد گرامی عبدالرزاق ملیح آبادی کے تعلقات مولانا ابوالکلام آزاد سے کافی گہرے تھے۔ قید و بند کی زندگی میں بھی کافی وقت ساتھ رہے۔ مولانا کی کئی کتابیں ایسی ہیں جنھیں انھوں نے خود تحریر نہیں کی بلکہ صرف ڈکٹیشن دی اور عبدالرزاق ملیح آبادی نے اسے تحریر کیا۔ احمد سعید ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ 'آزاد کی کہانی، خود ان کی زبانی' ایک ایسی ہی کتاب ہے جسے مولانا آزاد نے 1922 میں جیل میں ڈکٹیٹ کیا تھا مگر یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ احمد سعید ملیح آبادی عبدالرزاق ملیح آبادی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مولانا بولتے جاتے اور میں لکھتا جاتا تھا مگر کئی بار ایسا ہوا کہ جب مسودہ تیار ہوا تو مولانا نے اسے نظر ثانی کے لیے مانگا اور وہ مسودہ غائب ہوگیا۔ اس طرح اردو ادب ان کی بہت سی ادبی خدمات سے محروم رہ گیا۔

احمد سعید ملیح آبادی اپنے ایک مضمون 'مولانا آزاد ایک ماہر تعلیم' میں لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کے بعد وزیر تعلیم رہے اور اس حیثیت سے بہت اہم خدمات انجام دیں۔ انھوں نے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن، ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی اور للت کلا اکادمی قائم کیں۔ اہل ہند کو دنیا کے آرٹ و کلچر سے واقف کرانے کے لیے 'انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز' جیسی آرگنائزیشن کو عمل میں لائے، جس کے وہ خود صدر رہے۔ مولانا کی ان تمام سرگرمیوں سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ یقیناً ماہر تعلیم تھے۔

آخری مضمون 'قول فیصل: ہندوستان کا منشورِ آزادی' کافی طویل ہے۔ دراصل مولانا آزاد جب پہلی بار 1921 میں کلکتہ میں گرفتار ہوئے تب برٹش حکومت نے ان پر جو مقدمہ درج کیا تھا اس کے جواب میں مولانا نے اپنا تحریری بیان جاری کرتے ہوئے آزادی کا مطالبہ کیا وہی بعد میں 'قول فیصل' کے نام سے جانا تا ہے۔

احمد سعید ملیح آبادی نے روزنامہ 'آزاد ہند' کلکتہ اور ہفتہ وار 'اجالا' میں تقریباً 62 سال تک صحافتی زندگی گزاری اور مولانا آزاد کے کافی قریب بھی رہے۔ آج کل راجیہ سبھا کے آزاد ممبر ہیں۔ ان کی تین کتابیں اللہ کے گھر میں، آج کا پاکستان اور بغداد سے مدینہ منورہ تک کافی مقبول ہوئیں۔ ان کی یہ چوتھی کتاب 'عظیم صحافی، عظیم رہنما: ابوالکلام آزاد' مجموعی طور پر کافی اہمیت کی حامل ہے اور مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلو سے واقف کراتی ہے۔ اس کتاب کے اخیر میں چند تصاویر بھی ہیں جو مولانا آزاد کے گھر، ان کے مزار، ان کے والد کے مزار اور ان کی زوجہ کے مزار سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس کتاب کو مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔ کاغذ نہایت عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔ البتہ کہیں کہیں چند باتوں کی تکرار ملتی ہے جس کا مصنف نے اپنی تحریر میں خود اعتراف کیا ہے۔ ان سب کے باوجود امید ہے یہ کتاب سبھی کے لیے کافی اہم ثابت ہوگی اور مولانا آزاد کے تعلق سے نئی معلومات عوام تک پہنچائے گی۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ حیات و خدمات

مصنف: ڈاکٹر محمد فاروق اعظم

صفحات: 240، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: البلاغ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ 25

مبصر: رحمت یونس، گنگا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

مذکورہ بالا کتاب میں اردو کے ممتاز محقق اور مترجم شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ شانتی رنجن نے بنگال کے تعلق سے بھی شعر و ادب کے بارے میں تحقیقی مواد جمع کیے اور تحقیق و تنقید کے تعلق سے اہم کام انجام دیے ہیں۔ ڈاکٹر محمد فاروق اعظم پیش گفتار میں یہ ذکر کرتے ہیں کہ بنگال کی سرزمین سے تعلق رکھنے والا یہ فنکار ہمہ جہت شخصیت کا مالک تھا لیکن آج تک ان پر کوئی اہم کام نہیں ہوا۔ فاروق اعظم نے اپنی اس کتاب میں شانتی رنجن کی زندگی، تعلیم، سماجی و سیاسی شخصیت اور ادبی خدمات پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کتاب کو تین ابواب میں منقسم کیا گیا ہے، پہلے باب کا عنوان ''شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی ابتدائی زندگی اور تعلیم'' ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا اصل نام شانتی تھا اور وہ ایک بنگالی برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سات سال تک شانتی رنجن فرید پور میں تھے جہاں انھوں نے کلاس دوم تک بنگلہ میڈیم کے ذریعے تعلیم حاصل کی اور پھر حیدر آباد آگئے۔ حیدر آباد میں دویک بردھنی ہائی اسکول میں درجہ دوئم میں ان کا داخلہ ہوا جہاں پانچویں کلاس تک تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں حیدر آباد میں اردو کا بول بالا تھا اور اسے دفتری زبان کا شرف بھی حاصل تھا، گویا شانتی رنجن کو اردو سے خاص قسم کی رغبت ہوگئی۔ انھوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے محبوب کالج (ہائی اسکول) میں داخلہ لیا جہاں پہلی زبان انگریزی اور دوسری اردو تھی۔ انھوں نے سکنڈری کی تعلیم محبوب کالج (ہائی اسکول) سے مکمل کی۔ اس کے بعد مالی پریشانی کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رہ سکی اور وہ اعلیٰ تعلیم سے بہرور نہ ہو سکے۔ لیکن پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی انھوں نے تخلیقی کام شروع کر دیا اور اپنا پہلا ناول دھرتی سے آکاش تک کے عنوان سے لکھا۔ ان کے دوسرے ناول کا نام ''منزل کہاں ہے تیری'' ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''راہ کا کانٹا'' اور ''شاعر کی شادی'' ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے باب کا عنوان ''شانتی رنجن بھٹاچاریہ بحیثیت سماجی و سیاسی شخصیت'' ہے۔ اس باب میں شانتی رنجن کی سماجی و سیاسی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کی تلنگانہ تحریک سے وابستگی پر روشنی ڈالی گئی ہے ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ شانتی رنجن حیدر آباد میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بانی بھی تھے۔ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے لیے ان کی جدو جہد کی وضاحت کی گئی ہے۔ جب شانتی رنجن کا قیام کلکتہ ہوگیا تو انھوں نے کلکتہ کے سیلاب متاثرین کے لیے چندے مانگے اور غریب بچوں کا اسکول میں داخلہ کرایا۔ یہاں تک کہ سری نواس ڈھالی میموریل اسکول کھلوانے کے لیے اپنے گھر سے کرسی ٹیبل بھی فراہم کیا۔ انھوں نے مغربی بنگال میں اردو اکادمی کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اس کتاب کا باب سوم ''شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی ادبی خدمات'' ہے۔ اس باب کے تحت مندرجہ ذیل عنوانات پر خصوصی گفتگو کی گئی ہے۔

(1) شانتی رنجن بھٹاچاریہ بحیثیت افسانہ نگار (2) شانتی رنجن بھٹاچاریہ بحیثیت محقق
(3) شانتی رنجن بھٹاچاریہ بحیثیت مترجم (4) شانتی رنجن بھٹاچاریہ بحیثیت ناقد

اپنے تخلیقی سفر میں انھوں نے 'راہ کا کانٹا' کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ بھی اردو ادب کو دیا۔ اس مجموعے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شانتی رنجن کی تلنگانہ تحریک سے

وابستگی کو دہراتا ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ 1960 میں شائع ہوا۔ کچھ عرصے بعد 'شاعر کی شادی' کے عنوان سے دوسرا افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ ایک محقق بھی تھے۔ ان کی تحقیقی تصنیفات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مثال کے طور پر بنگال میں اردو کے مسائل، اردو اور بنگال، ہندوؤں کی اردو خدمات، آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو، بنگال میں اردو زبان و ادب (چند مضامین) اور غالب اور بنگال وغیرہ

شانتی رنجن بھٹا چاریہ ترجمہ نگاری کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے اور ان کے تمام لوازمات کو ملحوظ نظر رکھتے تھے۔ اس کتاب کی تفصیلات بتاتی ہیں کہ وہ زبان کی باریکیوں، خوبیوں اور اردو و بنگلہ زبان کے محاورات و کہاوتوں سے آشنائی رکھتے تھے۔

شانتی رنجن نے سوتی کمار چٹرجی کے بنگلہ مقالات کا ترجمہ اردو میں بڑی حسن و خوبی سے کیا ہے۔ ترجمہ شدہ مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں: البیرونی اور سنسکرت، کوچوان، ڈراپ خاں غازی، کابلی والے ہمسفر، عرب کا عظیم شہر، نمازی، صوفی طریق اور فلسفہ۔ شانتی رنجن جہاں اردو زبان سے گہری واقفیت رکھتے تھے وہیں بنگلہ زبان پر بھی ان کی دسترس تھی۔ چنانچہ انھوں نے ترجمہ نگاری کے فن کو بھی تقویت بخشی۔ اس طرح اردو ادب کو بنگلہ زبان کی ادبی روایت سے استفادے کا بھی موقع فراہم ہوا۔

کتاب کے آخری حصے میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ شانتی رنجن بھٹا چاریہ نہ صرف ایک اچھے محقق اور مترجم تھے بلکہ وہ اہم تنقید نگار بھی تھے 'اقبال ٹیگور اور نذرل، تین شاعر، ایک مطالعہ' ان کی مایہ ناز کتاب ہے۔ جس میں انھوں نے تینوں کی شاعری کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان کے افکار کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ ان تینوں شاعروں پر تفصیلی گفتگو بھی کی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اردو کے ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

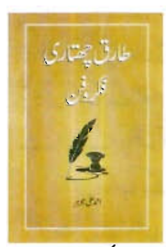

طارق چھتاری: فکروفن

مصنف: احمد علی جوہر

صفحات: 260، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عزیر احمد، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

معاصر افسانہ نگاروں میں جن لوگوں نے اردو دنیا میں اپنی پہچان بنائی ہے ان میں میں ایک اہم نام طارق چھتاری کا بھی ہے۔ انھوں نے افسانہ کے علاوہ فکشن تنقید پر بھی کام کیا ہے مگر ان کی پہچان ایک افسانہ نگار کی ہے۔ طارق چھتاری نے کم لکھا ہے لیکن جو بھی لکھا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ وہ موضوعات کے تنوع اور اپنے عمدہ اسالیب کی وجہ سے قاری کے دل و دماغ میں اپنا نقش چھوڑنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کا واحد افسانوی مجموعہ 'باغ کا دروازہ' افسانہ کی دنیا میں ان کو پہچان دلانے کے لیے کافی ہے۔ طارق چھتاری کے فکروفن پر یوں تو کئی ناقدین نے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے افسانے پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر صغیر افراہیم اور دوسرے معتبر ناقدین کی توجہ اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب رہے ہیں۔ لیکن ان کے فکروفن پر ایک مبسوط کتاب کی ضرورت تھی۔ زیر تبصرہ کتاب اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے لکھی گئی ہے۔ ڈھائی سو صفحات سے زائد اس کتاب میں انھوں نے افسانہ نگار طارق چھتاری کے فکروفن کا مختلف موضوعات کے تحت جائزہ لیا ہے۔ احمد علی جوہر نے کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ 'جدید مابعد جدید اردو افسانہ'، 'طارق چھتاری، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی کشمکش' اور تیسرا باب انھوں نے نمائندہ افسانوں کے تجزیے کے لیے خاص کیا ہے۔ ہر باب کے تحت انھوں نے ذیلی عنوان باندھ کر موضوع کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے باب میں انھوں نے تین اہم عناوین قائم کیے ہیں۔ (الف) طارق چھتاری کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی جائزہ، (ب) طارق چھتاری کی افسانہ نگاری کا فنی جائزہ۔ (ج) طارق چھتاری کے یہاں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی کشمکش۔ یہ موضوعات کتاب کی اصل ہیں۔ انھوں نے ان موضوعات کے ذریعے طارق چھتاری کے افسانوں میں موضوعات کے تنوع اور فنی باریکیوں کو بہتر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ (ص 179)

مصنف کی جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ ہے غیر ضروری تفصیلات اور بے جا تکرار۔ مصنف نے تقریباً آدھی کتاب جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تشریح و توضیح اور اردو افسانے پر ان کے اثرات بیان کرنے میں صرف کردیا ہے۔ یہ موضوعات اگرچہ اہم ہیں لیکن ان کو اس قدر اہمیت دینا کہ اصل کتاب کہیں گم ہو جائے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ آخری مضمون 'طارق چھتاری کے یہاں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی کشمکش' کے بعد اس کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے باب کے پہلے اور دوسرے مضمون میں تکرار سے بھی طبیعت مکدر ہوتی ہے۔

پوری کتاب پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ مصنف نے طارق چھتاری کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں محسوس کی، وہ کون ہیں، ان کی پیدائش کہاں ہوئی، تعلیم کہاں پائی اس تعلق سے کتاب مکمل طور پر خاموش ہے۔ مصنف ایک مضمون طارق چھتاری کی شخصیت پر بھی شامل کردیتے تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی۔ مصنف نے کتاب کا نام 'طارق چھتاری۔ فکروفن' رکھا ہے لیکن موصوف نے اپنی ساری توجہ طارق چھتاری کی افسانہ نگاری پر ہی مرکوز رکھی ہے۔ ان کی فکشن تنقید پر کوئی گفتگو نہیں کی۔ افسانوں میں بھی انہوں نے صرف 'باغ کا دروازہ' کے افسانوں کو ہی سامنے رکھا ان کے دوسرے افسانوں کو شامل نہیں کیا۔

ایک جگہ وہ طارق چھتاری کے افسانہ 'آن بان' کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں۔
''...... ہری سنگھ کے والد تیج بہادر ہری سنگھ کو اسکول سے اٹھوالیتے ہیں۔ لیکن ویدجی ہری سنگھ کو پڑھانا نہیں چھوڑتے۔'' (ص 91) یہاں 'اٹھوانے' کی جگہ اسکول چھڑانا زیادہ مناسب تھا۔ احمد علی جوہر ایک نئے قلم کار ہیں اس وجہ سے ان کے یہاں اس قسم کی زبان و بیان کی بھی بہت سی خامیاں آگئی ہیں۔ انھوں نے جدید اردو افسانہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''جدید افسانہ میں جانوروں جیسے کتا بچھو سانپ وغیرہ کو اور بے جان اشیاء کو بھی کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے، اس سے بھی جدید افسانہ میں کردار نگاری کو نقصان پہنچا ہے۔'' (ص 23) جانوروں اور غیر جاندار اشیا کو کردار بنا کر تمثیلی پیرائے میں افسانہ لکھنا جدید افسانہ ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ پریم چند اور دوسرے افسانہ نگاروں نے بہت پہلے یہ تجربے کیے ہیں۔ اس سے اردو افسانے میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے اس کو کمزوری کے طور پر نہیں دیکھا جاسکتا۔

اس کتاب کا سب سے عمدہ حصہ کتاب کا آخری باب ہے جو طارق چھتاری کے آٹھ منتخب افسانوں کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ کتاب کا یہ حصہ مصنف کی فنی مہارت کو ثابت کرتا ہے۔ انھوں نے جس طرح سے ان افسانوں کی فنی باریکیوں کی نقاب کشائی کی ہے اس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتاب کے دوسرے مباحث گرچہ کمزور ہیں لیکن کتاب کے اس آخری حصے کا مطالعہ ادب کے طالب علم کو کرنا چاہیے۔ امید کی جاتی ہے کہ احمد علی جوہر کی اس اولین کاوش کو ادب دوست حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ملے گی۔

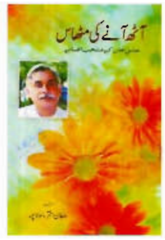

آٹھ آنے کی مٹھاس

مرتب: سلطان اختر
صفحات: 154، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: مہر فاؤنڈیشن (مادھو پورا، پالا بازار، دھولیہ)
مبصرہ: بی بی شفقت آرا، A - 128، تھرڈ فلور، شاہین باغ
جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

زیر تبصرہ کتاب آٹھ آنے کی مٹھاس، عباس خان کے منتخب افسانے کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ موصوف نے اس کی تخلیق میں افسانہ کے تمام اصولوں پر کھرا اترنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ افسانے کی سرخی بھی اس کی مقبولیت اور قاری کی دلچسپی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس کتاب کی سرخی بھی مرکزی خیال سے جڑی ہوئی ہے۔ اس کتاب کا عنوان بھی کافی دلچسپ ہے۔ اسی سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس کا عنوان ہی اس کی مقبولیت کا ضامن ہے، بالکل سچ ہوگا۔ اس کتاب کی تحریر میں دلکشی اور جاذبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

واقعات کی ترتیب بھی افسانے کی مقبولیت میں اہم کردار ادا کرتی ہے، جس کا زیر تبصرہ کتاب میں صاحب کتاب نے خوب خیال رکھا ہے، جب کہ بہت سارے افسانہ نگار اس کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔ واقعات کی ترتیب کے بعد واقعات میں حرکت پیدا کرنے کے لیے کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آٹھ آنے کی مٹھاس، عباس خان کے منتخب افسانے کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ صاحب کتاب نے اس معیار پر بھی کھرا اترنے کی پوری کوشش کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'آٹھ آنے کی مٹھاس، عباس خان کے منتخب افسانے' میں باریک بینی کے علاوہ جزئیات نگاری پر بھی خاص دھیان دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہر لحاظ سے بھرپور ہے۔ وہ عام افسانہ نگاروں سے ہٹ کر خاص روایتی انداز کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کی ہر کہانی میں ایک مرکزی خیال یا واقعہ ہوتا ہے، جس کے اردگرد کہانی گھومتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں کے موضوعات بھی براہ راست زندگی سے اخذ کیے گئے ہیں۔

ہر افسانہ نگار کی یہی کوشش ہونی چاہیے کہ افسانوں میں وضاحتی جملے کم سے کم ہوں۔ اس کے علاوہ افسانے اور ناول میں بھی فرق یہی ہے کہ ناول میں تفصیل سے تمام جزئیات کو بیان کیا جاتا ہے جب کہ افسانے میں بہت سی تفصیلات جان بوجھ کر تشنہ چھوڑ دی جاتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ افسانے میں واقعات کا منطقی بیان نہیں ہونا چاہیے۔ منطقی بیان ضرور ہونا چاہیے لیکن تفصیلات اور وضاحتی جملوں سے گریز کرنا چاہیے۔

'آٹھ آنے کی مٹھاس'، عباس خان کے منتخب افسانے کو مرتب کرتے وقت سلطان اختر، سولا پوری نے بڑی دانشمندی اور عقلمندی سے کام لیا ہے۔ فہرست ترتیب دیتے وقت انھوں نے جس علمی ذوق کا ثبوت دیا ہے اس سے اس کی مقبولیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے 'اپنا اپنا انصاف' کو پیش کیا ہے اور سب سے اخیر میں 'آمنے سامنے' کو کتاب کی زینت بنایا ہے۔ ان کے اس طرز عمل نے قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور دیگر افسانہ نگاروں کے علاوہ قاری حضرات کو بھی سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔

آٹھ آنے کی مٹھاس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک حساس دل اور ان کا ذہن مسائل کا تجزیہ کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ ان کے افسانے کئی اعتبار سے منفرد ہیں، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ان پر ترقی پسندی کی چھاپ ہے اور نہ ہی جدیدیت کا رنگ غالب ہے۔ انھوں نے افسانے کو اپنے جذبات اور احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور اسے خالص بیانیہ اسلوب میں پوری ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کردیا۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ انھوں نے اپنی کہانی کو تجربوں کی بھینٹ چڑھنے نہیں دیا۔ انھوں نے افسانے میں کہانی کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ان کی زبان نہایت سادہ، صاف اور سریع الفہم ہے۔ ان کے افسانوں کی تفہیم میں ترسیل کا المیہ آڑے نہیں آتا، بلکہ ان کا بیانیہ اسلوب اس قدر شفاف ہے کہ افسانے کا کوئی منظر ہو یا منظر کا کوئی گوشہ قاری پر روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتا ہے۔ پہلی ہی نظر میں افسانے کے سارے ابعاد منکشف ہوجاتے ہیں۔

ادب کی کسی بھی صنف میں جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے، وقت اسے ادب کے ترازو میں ضرور تولتا ہے کہ تخلیق کیے جانے والے فن پارے کی ادبی حیثیت کیا ہے، اس کا کتنا حصہ قابل قدر ہے، اس میں نئے رجحانات، امکانات اور زاویے نظر آئے ہیں یا نہیں، ان رجحانات وامکانات کا مجموعی سماجی حالات و واقعات سے کوئی تعلق بنتا بھی ہے یا نہیں؟ حقیقت میں یہی وہ پیمانہ ہے جو کسی ادیب یا اس کے فن کو ادب میں نمایاں مقام طے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ آٹھ آنے کی مٹھاس، انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے، اس کے علاوہ انسان کی ذہنی الجھنوں کو حل کرنے میں بھی کافی معاون ثابت ہوئی ہے۔ عباس خان اصلاح معاشرہ کے علمبردار بھی ہیں، انھوں نے اپنی تخلیق کے ذریعے اس کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے کو پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کسی پیش رو کا اثر قبول نہیں کیا اور اپنے لیے بالکل جدا اور الگ تھلگ راہ نکالی جو ان کی شناخت میں معاون ثابت ہوئی۔ انھیں افسانہ لکھتے وقت کسی تمہید کی ضرورت نہیں پڑتی ہے وہ بلا جھجھک اپنی بات کہہ دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کو فوراً سمجھ میں آجائے۔ اخیر میں بغیر کسی تامل کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیر تبصرہ کتاب لوگوں میں کافی مقبول ہوگی اور عباس خان کے افسانے کی ہر چہار جانب دھوم مچے گی۔

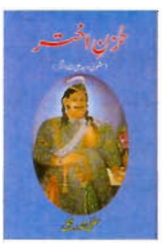

حزن اختر

مصنف و ناشر: سلمیٰ محمد رفیق
صفحات: 212، قیمت: 121 روپے، سنہ اشاعت: 2013
مبصر: انجم آرا، ہندوستانی زبانوں کا مرکز
جے این یو نئی دہلی 67

واجد علی شاہ کی تصنیف 'حزن اختر' صنف مثنوی سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ مثنوی اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے ان کی دیگر تصانیف سے مختلف ہے۔ جہاں ایک طرف یہ ادب کا بہترین نمونہ ہے وہیں اس کی تاریخی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ یہ مثنوی بادشاہ اودھ کی زندگی کے آخری ایام کی المناک داستان ہے، جس میں ان کے قید ہونے سے لے کر آخری دنوں تک کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ واجد علی شاہ کے بارے میں یوں تو تاریخ کی کتابوں میں بہت کچھ مل جاتا ہے جو ان کی سیاسی زندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس مثنوی کی اہمیت میرے خیال میں ادبی سے زیادہ تاریخی اور سوانحی ہے اس بنا پر یہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

واجد علی شاہ کو عموماً ان کی رنگین مزاجی اور عیش پسندی کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک عام قاری ان کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں سے بہت کم واقف ہے۔ واجد علی شاہ کے تعلق سے یہ خیال عام ہے کہ ان کو ان کی نااہلی کی بنا پر معزول کردیا گیا تھا۔ اس حوالے سے مصنفہ نے نہ ہی اس کی تصدیق کی ہے اور نہ ہی تردید۔ حالانکہ یہ ان کی زندگی کا ایک رخ ہے جو خود اپنی جگہ سیاسی پس منظر میں تحقیق کا متقاضی ہے۔

حسن پرستی واجد علی شاہ کی سرشت کا حصہ تھی، رقص اور موسیقی سے ان کو فطری دلچسپی تھی۔ یہ چیزیں لکھنؤ کی پُرتکلف اور پُرتصنع تہذیب کا حصہ تھیں۔ ان کی تصانیف کو مدون اور مرتب کرنے کا سلسلہ بیسویں صدی میں شروع ہوا۔ اس کتاب میں مثنوی کی تاریخی، سوانحی، ادبی اور تہذیبی اہمیت کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مصنفہ نے اس کتاب میں واجد علی شاہ کی مثنوی 'حزن اختر' کی تدوین کا کام کیا ہے جس کو تیار کرنے

میں تین مدون شدہ نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔جس کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے نہایت محنت اور دلجمعی کے ساتھ تحقیق کے فرائض انجام دیے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب وتدوین سے قبل اردو میں کوئی ایسی مستند کتاب نہیں جو واجد علی شاہ کی شخصیت کا مکمل احاطہ کرتی ہو۔یہ کتاب جہاں ایک طرف واجد علی شاہ کے بارے میں عام قاری کی معلومات میں اضافے کا باعث ہوگی وہیں موجودہ دور میں جب مثنوی نگاری تقریباً ختم ہوچکی ہے اس کتاب کے ذریعے ممکن ہے کہ قاری کا رجحان مثنوی کی طرف بڑھے۔اور نایاب مثنویوں کی تلاش وجستجو میں اضافہ ہو،اس مثنوی کی تدوین کرتے وقت مشکل اور نامانوس الفاظ کی وضاحت حاشیہ میں کر دی گئی ہے اور مثنوی کو حاشیہ کے ساتھ پیش کرنے میں بہت دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔مصنفہ نے اس کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باب اول: اردو میں مثنوی کی روایت

باب دوم: (الف) واجد علی شاہ حیات وشخصیت

(ب) واجد علی شاہ کی تصانیف کا مختصر جائزہ

باب سوم: مثنوی ''حزن اختر'' کی تحقیق وتدوین

کتاب کے پہلے باب میں اردو ادب کی تاریخ میں مثنوی نگاری کی روایت اور صنف مثنوی سے متعلق اہم مباحث پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔مثنوی کے مختلف موضوعات میں اخلاقی، مذہبی، عشقیہ، رزمیہ، تاریخی وسوانحی، ملی وقومی وغیرہ موضوعات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور مثنوی کی مختلف ہیئتوں اور ان سے متعلق اجزا کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔جب کہ دوسرے باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔حصہ اول میں واجد علی شاہ کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، اور تہذیبی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شخصیت کی مختلف النوع جہات کو سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے نیز اس میں بادشاہ اودھ کے بدلتے ہوئے حالات اور اس کے شکست وریخت کو مدلل انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔اس کے علاوہ باب دوم کے دوسرے حصے میں واجد علی شاہ کی تخلیقات تقریباً 43 کتابوں کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔جس سے بادشاہ اودھ کی تخلیقی بصیرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔واجد علی شاہ نے نظم اور نثر دونوں میں طبع آزمائی کی لیکن نثر کے مقابلے نظم کا حصہ زیادہ ہے۔ان کی شاعری میں ان کے معاصرین کا رنگ وآہنگ نظر آتا ہے۔اصناف شاعری میں ان کا اصل میدان مثنوی اور مرثیہ ہے۔لیکن ادب کی مختلف اصناف میں بھی ان کی تصنیفات موجود ہیں چاہے وہ پند ونصائح ہوں یا اخلاق، مراثی ہوں یا تجربات خاص، فن موسیقی ہو یا کہ غزل، بیشتر اصناف میں ان کے جواہر پارے دستیاب ہیں۔اور ان تمام علوم وفنون میں جو خصوصیت مشترکہ طور پر موجود ہے وہ ہے ان کی جدت پسندی۔

اس کتاب کا تیسرا اور آخری باب 'حزن اختر' کی تحقیق وتدوین کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے جس میں حزن اختر کو زندانی ادب کا بہترین نمونہ بتایا گیا ہے۔یوں تو یہ کتاب ایم۔فل کا مقالہ ہے مگر اس کے باوجود جس دلجمعی اور محنت شاقہ کے ساتھ اس کتاب کی تدوین اور تحقیق کی ہے اس سے مصنفہ کی تحقیقی بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔کیونکہ اس کتاب میں تحقیق وتدوین کے اصولوں کو برتنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔اس مثنوی کے متن کو سامنے رکھ کر اس کے مختلف نسخوں سے موازنہ کرکے اس کے اصل نسخے کو بنیاد بنا کر تدوین کے فرائض انجام دیے گئے ہیں۔بہر کیف یہ کتاب زبان وبیان اور اسلوب کے اعتبار سے آسان اور رواں ہے البتہ سرورق جاذب نظر نہیں ہے۔قیمت مناسب ہے۔امید ہے کہ یہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے۔

لرن اردو

مصنف: خالد سعید

صفحات: 120، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: پیش رفت پبلی کیشنز، گلبرگہ

مبصر: عبدالحی

پروفیسر خالد سعید مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور اردو زبان وادب کی فعال شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔انھیں درس وتدریس کا طویل تجربہ رہا ہے۔ان کی تنقیدی کتاب 'تعبیرات' کو گلبرگہ یونیورسٹی سے ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔کرناٹک اردو اکادمی سے بھی ان کی کتابوں کو انعامات مل چکے ہیں۔ان کی تقریباً 2 درجن کتابیں شائع ہوکر اردو حلقے میں مقبول ہوچکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''لرن اردو'' انگریزی سے اردو سکھانے والی کتاب ہے۔یہ کتاب ایس وی پی نیشنل پولس اکادمی حیدرآباد اور ایم سی آر (ایچ آر ڈی) حیدرآباد میں آئی اے ایس میں کامیاب امیدواروں کو اردو پڑھانے کے تجربات پر مشتمل ہے۔120 صفحات پر مشتمل کتاب کو 12 یونٹوں اور 24 اسباق میں تقسیم کیا گیا ہے۔یہ کتاب سیلف ورک بک کے طور پر ترتیب دی گئی ہے۔اس کتاب کی مدد سے خود سے مشق کر کے کوئی بھی انگریزی جاننے والا شخص اردو سیکھ سکتا ہے۔کتاب میں اردو رسم الخط کے ساتھ ساتھ انگریزی میں حروف اور الفاظ کا تلفظ بھی دیا گیا ہے، ہر سبق میں مشق کے لیے الگ سے حصے ہیں۔کتاب نہ صرف اردو لکھنا پڑھنا بلکہ بولنا سکھانے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔دو حروف کو جوڑ کر کس طرح سے لفظ بنایا جاتا ہے یہ اس کتاب میں نہایت آسان انداز میں بتایا گیا ہے۔

کتاب میں زیر، زبر، پیش، مد، تشدید، دو زبر کے استعمال پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔اردو میں ان کا استعمال گفتگو میں ضرور ہوتا ہے لیکن تحریری طور پر نہیں کیا جاتا لیکن اردو سیکھنے والے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ لکھی ہوئی تحریر پر خود سے ان کا استعمال کرنا سیکھ لے۔اس کتاب میں ے اور ی کے استعمال کے الگ الگ طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ایک جیسی آوازوں والے حروف ض، ظ، ز، ژ، ذ جیسے حروف کے استعمال والے الفاظ پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

اسی طرح دو چشمی ھ، ہ، ح کے استعمال کا بھی آسان طریقہ بتایا گیا ہے۔حمزۂ اور واؤ کے استعمال میں بھی عام طور پر شبہ رہتا ہے۔ان کے استعمال کو کتاب میں آسان کر دیا گیا ہے۔ایسے حروف جو اردو تحریر میں استعمال کے بعد اپنی شکل تبدیل کرتے ہیں ان کا ذکر بھی کتاب میں کر دیا گیا ہے۔وہیں کچھ ایسے حروف بھی ہیں جو اپنی شناخت برقرار رکھتے ہیں، ان کے بارے میں بھی ذکر ہوا ہے۔

پروفیسر خالد سعید سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز میسور سے بھی وابستہ رہے ہیں اور زبان ولسانیات کے درجنوں ورکشاپ اور پروجیکٹ کا حصہ رہے ہیں۔انھیں اردو سیکھنے والوں کو درپیش دشواریوں کا خوب اندازہ ہے اور اسی لیے انھوں نے ایک ایسی کتاب ترتیب دی جو اردو لرنرس کو ہونے والی تمام مشکلات کا ازالہ کرسکے۔و، ن، ی، ہ جیسے حروف کے استعمال پر پورا ایک ایک سبق کتاب میں دیا گیا ہے۔Vowels اور Consonants پر بھی یونٹ شامل کیے گئے ہیں۔کتاب کے آخری اسباق میں حروف کی بناوٹ وتبدیلی، مخفف، Punctuation Marks of اور اردو گنتیوں کو چارٹ کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔

المختصر یہ کتاب اچھی اور کارآمد ہے۔ایک بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ موضوعات کی فہرست جو صرف انگریزی میں دی گئی ہے اسے اردو میں بھی ہونا چاہیے تھا۔اسی طرح موضوعات اور اسباق کے عنوانات انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی دیے جاتے تاکہ اردو سیکھ رہے طالب علم ان کے اردو معنی ومطالب سے واقف ہوجاتے۔

عالمی اردو نامہ

پاکستان

انجمن ترقیِ اردو پاکستان کی یادگار تقریبِ پزیرائی

کراچی: وفاقی حکومت کے مقتدر علمی اور ادبی ادارے

انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر آفتاب احمد خان اور معتمدِ اعزازی جمیل الدین عالی کی خصوصی ہدایت پر انجمن کے نگراں انتظامی و ادبی امور ڈاکٹر جاوید منظر نے کینیڈا کے مہمان ادبی اسکالر تسلیم الٰہی زلفی کی تقریبِ اعترافِ کمالِ فن اور پزیرائی کا پروقار و یادگار اہتمام کیا۔ اس تقریب میں شہر کراچی کے سب ہی مقتدر اور سینئر اہلِ علم و دانش مہمان کی پزیرائی اور خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے بڑی تعداد میں موجود تھے۔

کینیڈا کے مہمان تسلیم الٰہی زلفی کا اعترافِ کمالِ فن کرتے ہوئے جمیل الدین عالی نے کہا کہ 1978 اسلام آباد میں پہلی اہلِ قلم کانفرنس کے بعد سے اب تک دنیا بھر کے بیشتر علمی، ادبی اجتماعات میں تسلیم الٰہی زلفی کا ساتھ رہا ہے۔ آفتاب احمد خان کا کہنا تھا کہ تسلیم الٰہی زلفی کی عربی، فارسی اور انگریزی زباں دانی نے ان کے اردو رشحاتِ قلم کو اعلیٰ معیار دیا ہے۔

پیرزادہ قاسم نے کہا کہ کراچی یونیورسٹی میں میرے ہم عصر تسلیم الٰہی زلفی اپنی علمی، ادبی، تخلیقی، نشریاتی صلاحیتوں، اعلیٰ تعلیم، عالمی مشاہدات و تجربات کو بروئے کار لاکر کینیڈا میں رہ کر جو علمی، ادبی، تخلیقی، اشاعتی، نشریاتی، اجتماعاتی اور سماجی نمایاں اور بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں جو قابل ستائش پہل ہے۔ سرشار صدیقی نے کہا کہ زلفی اپنے تعلیمی زمانے سے آج تک ہم سب کے دلوں میں قدر و منزلت کے مقام پر براجمان ہیں۔ فاطمہ حسن نے کہا کہ ساری عمر بیرونِ ملک قیام نے اٹھارہ گرانقدر کتابوں کے مصنف تسلیم الٰہی زلفی کو 'نگہہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز' کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیا ہے۔ اس موقع پر انجمن کے صدر آفتاب احمد خان نے معزز مہمان کو پھول اور انجمن کی اہم مطبوعات کا تحفہ بھی پیش کیا۔

پریس ریلیز، تسلیم الٰہی زلفی، انجمن ترقی اردو پاکستان ایونٹ رپورٹ، 28 اپریل 2014

ہندوستانی شعرا کی پاکستان میں پزیرائی

نئی دھلی: معروف شاعر اور انجمن تعمیر اردو دہلی کے صدر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کی قیادت میں ہندوستانی شعرا نے پاکستان کا دورہ کیا اور وہاں کے مختلف شہروں لاہور، کراچی اور اسلام آباد میں مشاعروں میں شرکت کی جس میں سامعین کی بڑی تعداد شریک رہی۔ پاکستان میں ہندوستانی شعرا نے خوب واہ واہی لوٹی۔ وطن واپسی پر گلزر دہلوی نے ایک پریس ریلیز کے ذریعے بتایا کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان خیرسگالی کا جذبہ حوصلہ افزا ہے اور اردو زبان دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ دنیا کے مختلف اردو شعبوں سے شعرائے کرام تشریف لائے تھے۔ ان مہمانوں کے علاوہ کراچی کے مقامی شعرا بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ اسلام آباد سے ڈاکٹر عالیہ امام، صدر ساؤتھ ایشیا یونین اسلام آباد سے تشریف لائی تھیں۔ یہ مشاعرے 'انجمن فروغ اردو، انجمن ساکنان شہر قائد کراچی انجمن سادات امروہہ کراچی، جم خانہ کلب، کراچی کلب، اردو مرکز ہیلتھ کیئر اسپتال وغیرہ اداروں کی طرف سے منعقد ہوئے۔ گلزار دہلوی کو وقار اردو، آفتاب اردو، یادگار گلستان داغ کے القاب و خطابات سے بھی نوازا گیا اور مومنٹو پیش کیے گئے۔ دوسرے شعرا کو بھی تحفہ جات سے نوازا گیا۔ ان تمام مشاعروں کی صدارت اور افتتاح گلزار دہلوی نے کیا جن میں پاکستان کے متعدد ادب نواز وزرا و دیگر سیاسی، سماجی اور دینی شخصیات نے مشاعروں میں رونق بخشی۔ ہندوستانی شعرا پنڈت گلزار دہلوی، اظہر عنایتی، ڈاکٹر نسیم نکہت اور پاپولر میرٹھی کو سامعین نے داد و تحسین سے نوازا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 اپریل 2014

قطر

گزرگاہِ خیال فورم کے زیرِ اہتمام غالب فہمی اجلاس

گزرگاہِ خیال فورم کے زیرِ اہتمام غالب فہمی کا سترہواں ماہانہ علمی و ادبی اجلاس بعنوان 'انا لبحر' پچھلے جمعہ علامہ ابن حجر لائبریری میں اہل علم و ادب خوش گفتار جناب ظفر صدیقی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا، جس میں زیبا طلعت بزرگ جناب مرزا اطہر بیگ نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت فرمائی۔ ہندوستان سے تشریف لائے کہنہ مشق شاعر جناب طاہر گلشن آبادی نے مہمانِ اعزازی کی مسند کو رونق بخشی۔ گزرگاہِ خیال فورم کے ذریعے غالب فہمی پر مبنی ان علمی و ادبی اجلاسوں کا آغاز ماہ اکتوبر 2012 میں ہوا تھا۔ تواتر سے ان علمی نشستوں کا سلسلہ ہر ماہ جاری ہے۔ اجلاس کا آغاز معروف شاعر و ادیب جناب محمد رفیق شادا کولوی نے قرآن حکیم کی آیاتِ مبارکہ کی تلاوت سے کیا۔ مہمانِ خصوصی جناب مرزا اطہر بیگ نے اس سلسلے میں اپنے خیالات پیش کیے۔ آخر میں صاحب صدارت جناب ظفر صدیقی نے اپنے خطاب میں گزرگاہِ خیال فورم کے بانی صدر ڈاکٹر فیصل حنیف خیال کی نادر کوشش کو سراہتے ہوئے غالب فہمی کے سلسلے میں منعقد ہونے والے ان اجلاسوں سے حاضرین کو زبان و کلام کے سلسلے میں ہونے والے فوائد پر روشنی ڈالی۔ نشست کے اختتام

پر ڈاکٹر فیصل حنیف خیال نے گزرگاہِ خیال فورم کی جانب سے تمام حاضرین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: ڈاکٹر فیصل حنیف خیال، 22 مارچ 2014

چاہتوں کا خمار

قطر کی 54 سالہ قدیم ترین اور اولین تنظیم بزم اردو قطر نے 18 پریل 2014 کو نامور شاعر شوکت علی ناز کے

مجموعہ غزلیات 'چاہتوں کا خمار' کی تقریب رونمائی سلا طہ قدیم دوحہ میں واقع سوئیس بیل ہوٹل میں منعقد کی جس کی صدارت معروف ادب نواز سید صبیح بخاری نے کی۔ مہمان خصوصی کے لیے بانی انجمن محبانِ اردو جناب ابراہیم خان کمال اپنی علالت کے سبب تشریف نہ لا سکے لہٰذا شوکت علی ناز کے استاد اور سابق صدرِ بزم امجد علی سرور نے یہ ذمے داری سنبھالی، مہمان اعزازی شوکت علی ناز تھے اور اسٹیج پر ان شخصیات کا استقبال نومنتخب صدر بزم سید فہیم الدین اور چیئرمین محمد ممتاز راشد نے کیا۔ نظامت کے فرائض بزم کے نومنتخب جنرل سکریٹری کلمات صدرِ بزم نے ادا کیے اور شوکت علی ناز کو مبارکباد بھی پیش کی، کتاب کی رسم اجرا بزم کے چیئرمین کی معاونت سے صدر تقریب کے ہاتھوں ادا ہوئی اور پھر بزم اردو قطر کی جانب سے شوکت علی ناز کو ان کی ادبی خدمات پر لوح سپاس بھی عطا کیا گیا۔ شکوت علی ناز کی شخصیت اور شاعری پر بزم کے جنرل سکریٹری احمد اشفاق، معروف شاعر عزیز نبیل، معروف شاعر جناب سید فہیم الدین، بزرگ شاعر و ادیب اور معلم محمد شفیق اختر، استاد شاعر امجد علی سرور، اور 'خیال وفن' کے مدیر محمد ممتاز راشد نے اپنے اپنے مقالے پڑھے۔ بزم اردو قطر کے عہدیداران اور دیگر احباب کا شکریہ ادا کیا اور اپنی کتاب پر بھی روشنی ڈالی۔ تقریب کے بعد غیر طرحی مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا۔

رپورٹ: انجینئر طاہر جمیل، دوحہ قطر، اردو ہمعصر، ڈنمارک 24 اپریل 2014

ماریشس

عنایت حسین عیدن کی کتاب 'چھوٹا بنگلہ نہیں بلکہ...' کی رسم اجرا

ماریشس ایک کثیر المذاہب اور کثیر السان ملک ہے۔ ہماری مادری زبان کریولی ہے، سرکاری زبان انگریزی ہے، ابلاغِ عامہ کی زبان فرانسیسی ہے نیز مشرقی زبانیں بھی ہمارے تعلیمی کریکلم میں شامل ہیں جن میں سے ایک اردو زبان ہے۔ ماریشس کے بیشتر پرائمیری اور ثانوی اسکولوں میں اردو کی تدریس ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر بھی اردو زبان پڑھائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے اکثر بچے اردو کو تیسری زبان کی حیثیت سے سیکھتے ہیں۔ اردو زبان کی تدریس و آموزش ہمارے لیے اکتسابی عمل ہے۔ اب اردو زبان ہماری تہذیبی شناخت ہے۔ ماریشس میں اردو زبان ترقی کی راہ پر گامزن ہے چونکہ اردو ادب کے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی جارہی ہے نیز اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ مقام مصنّفین میں عنایت حسین عیدن کا نام سرِ فہرست ہے۔

25 مارچ 2014 کو عنایت حسین عیدن کی چھٹی کتاب 'چھوٹا بنگلہ نہیں بلکہ' کی رسم اجرا عمل میں آئی جس میں سفیرِ پاکستان عالی وقار جنابِ الفت حسین اور ایم جی آئی کے ڈائرکٹر جنرل وجئی مادھو صاحب تشریف فرما تھے۔ ایم جی آئی اور شعبۂ اردو نے پوری تقریب کا اہتمام 'سبرامنیم بھارتی لکچر تھیٹر' میں کیا گیا۔ شرکا میں شعبۂ اردو کے لکچرار، دوسری مشرقی زبانوں کے لکچرار، سابق صدرِ شعبۂ اردو قاسم ہیرا اور ڈاکٹر گودڑ، پرائمیری اسکولوں کے انسپکٹر، ثانوی اسکولوں کے اساتذۂ کرام، بی اے آنرز اردو کے طلبا و طالبات، مصنف کی فیملی اور ان کے عزیز تھے۔ ڈاکٹر ریاض گوکھول نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے یہ کہا کہ کتاب میں وہ ساری لوازمات ہیں جو افسانے کے لیے ضروری ہیں۔

عنایت حسین عیدن بڑی عاجزی و انکساری کے ساتھ حاضرین سے مخاطب ہوئے۔ سب سے پہلے انھوں نے تمام منتظمین کا شکریہ ادا کیا جن کی بدولت رسم اجرا کی تقریب ہو پائی۔ انھوں نے سفیر پاکستان اور ایم جی آئی کے ڈائرکٹر کی تشریف آوری پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر انھوں نے اپنے افسانوں کی تخلیق پر روشنی ڈالی۔ ایم جی آئی کے شعبۂ اردو کی لکچرار محترمہ سکینہ رسم علی نے اظہارِ تشکر کے کلمات ادا کیے۔

پریس ریلیز، پروفیسر ابن کنول، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی، 21 اپریل 2014

برمنگھم (انگلینڈ)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی کتاب 'کہانی بول پڑتی ہے' کا اجرا

سماجی و ادبی تنظیم 'آگہی' کی جانب سے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی پوپ کہانی کے مجموعے 'کہانی بول پڑتی ہے' کی تقریب رونمائی کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جرمنی میں مقیم معروف ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف حیدر قریشی نے کی جب کہ خصوصی جدید لہجے کے نامور شاعر زاہد مسعود تھے۔ مقررین نے نہ صرف 'پوپ کہانی' جیسی نئی صنفِ نثر کے ارتقا کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا۔ حیدر قریشی نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کو پوپ کہانی کی صنف میں بنیادی کام کرنے پر سراہا۔ زاہد مسعود نے کہا کہ جوں ہی اس صنف میں اور تخلیقی کام ہوا، یہ نئی صنف بھی اردو ادب کی ایک معتبر صنف کے طور پر جانی جائے گی۔ حمیدہ معین رضوی اور خواجہ محمد عارف نے 'کہانی بول پڑتی ہے' کی ادبی کارکردگی پر مقالات پیش کیے۔ اس تقریب میں مصنفہ نے اپنی کہانیوں کے اقتباسات بھی پڑھ کر سنائے۔ بعد ازاں عالمی یومِ خواتین کے حوالے سے ایک مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا۔ رپورٹ: محمد اسماعیل اعظم (برمنگھم)، اردو ہمعصر ڈنمارک، 11 مارچ 2014

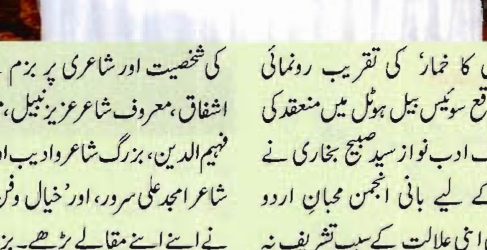

اردو نیٹ جاپان کی پانچویں سالانہ تقریب

سائتاما: اردونیٹ جاپان 20 اپریل 2014، سائتاما پریفیکچر کے شہر کوشی گایا میں واقع معروف JU TOKYO CAR AUCTION کے وسیع ہال میں اردونیٹ جاپان کی پانچویں سالانہ تقریب چیف ایڈیٹر ناصر ناکاگاوا کی

صدارت میں منعقد کی گئی۔ تقریب میں جاپان بھر سے ڈیڑھ سو سے زائد مہمانوں نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض انجام دینے کے لیے کمیونٹی کی ہر دلعزیز شخصیت اور معروف کمپیئر جاپانی نژاد جاپانی شہری الطاف غفار ہایاشی نے دی۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز زینت القرا اور اسلامک مرکز تجوید القرآن انٹرنیشنل کے سربراہ قاری علی حسن کی تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا، نعتِ رسولِ مقبولؐ کی سعادت معروف نعت خواں معوذ ٹیپو نے پڑھا۔ اردونیٹ جاپان کی اس شاندار تقریب کے مہمانِ خصوصی ٹوکیو یونیورسٹی شعبۂ مطالعاتِ خارجی میں اردو زبان کے پاکستانی پروفیسر ڈاکٹر سہیل عباس خان اور اردو کے پروفیسر تسوگوچی، سفارتخانۂ پاکستان ٹوکیو کے پریس اتاشی ڈاکٹر رفیق احمد سومرو، کمرشل اتاشی شہزاد علی، قومی ایئرلائین پی آئی اے کے قائم مقام کنٹری مینیجر عبدالوحید قادری، اسلامک سرکل آف جاپان کے امیر سعید بیگ، سابق امیر عشرت ہاشمی، ندوۃ ایجوکیشن جاپان کے سربراہ ڈاکٹر حافظ سلیم الرحمٰن خان ندوی، معروف فلاحی جاپانی تنظیم APFS کے سربراہ JOTARO KATO جوتارو کھاتو، جاپانی لیبر یونین کے سربراہ یاماگوچی، منہاج القرآن انٹرنیشنل جاپان کے ڈائریکٹر علامہ شکیل احمد ثانی، صالح خان، انعام الحق، اسلامک سوسائٹی جاپان کے سربراہ رئیس صدیقی، ہوکائدو اتارُو مسجد کمیٹی کے سربراہ محمد شفیق، میزر آن لائین کے سربراہ سید کمال حسین رضوی، انجمنِ فروغِ ادب کے سربراہ عبدالرحمٰن صدیقی، سینئر پاکستانی حسین خان، اوکیناوا مسجد کمیٹی کے سربراہ سید ذاکر علی، مسجد انوارِ مدینہ ایبارا کی کے خطیب وامام حافظ فیض اللہ سعیدی، جاپان انٹرنیشنل پریس کلب کے صدر چوہدری شاہد رضا، NHK انٹرنیشنل اردو سروس کے انچارج جعفر بلوچ کے علاوہ تھویاما، ہوکائدو، اوکیناوا، فوکوشیما، ایبارا کی، ٹوکیو، کھاناگاوا، توچیگی، ناگانو، چیبا، گُنما پریفیکچر اور دور دراز شہروں سے مہمانوں نے شرکت کی۔

میزر آن لائین کے سربراہ، اصلاحی کالم نگار اور رضوی ٹریڈنگ کے چیئرمین سید کمال حسین رضوی نے کہا کہ اردونیٹ جاپان کے ناصر ناکاگاوا نے اپنی مصروفیت کے باوجود اردونیٹ جاپان کو آن لائین نیوز نیٹ کو صفِ اول میں لا کھڑا کیا ہے، انھوں نے کہا کہ وہ امید کرتے ہیں ناصر ناکاگاوا مستقبل میں بھی اپنی غیر جانبدار پالیسی کو جاری رکھتے ہوئے کسی بھی خبر جو کسی کی ذات سے متعلق ہو اس کی تحقیق ضرور کریں گے، ناصر ناکاگاوا نے اردونیٹ جاپان کے توسط سے پوری کمیونٹی کو متحد کرنے میں انتھک محنت کی ہے۔ رئیس صدیقی نے کہا کہ ناصر ناکاگاوا جب سے جاپان کی صحافت میں آئے ہیں انھوں نے زرد صحافت اور لفافہ صحافت کا خاتمہ کرنے میں اپنا اعلیٰ کردار ادا کیا ہے۔ شکیل ثانی نے کہا کہ وہ جب سے جاپان آئے ہیں روزِ اول سے ہی اردونیٹ جاپان کے قاری ہیں۔ ناصر ناکاگاوا کی شاہکار کتاب انھوں نے کئی بار مطالعہ کی ہے جسے جاپان کا انسائکلوپیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ پریس اتاشی ڈاکٹر رفیق احمد سومرو نے کہا کہ وہ سفیرِ پاکستان کی خصوصی ہدایت پر اس تقریب میں شامل ہوئے ہیں انھوں نے سفیرِ پاکستان جناب فاروق عامل صاحب کی طرف سے مبارکباد کا پیغام دیا اور کہا کہ اردونیٹ جاپان اس وقت کمیونٹی پسندیدہ آن لائی اخبار ہے جو ہر روز باقاعدگی سے اپ ڈیٹ ہوتا ہے انھوں نے ناصر ناکاگاوا اور انکی ٹیم کو شاندار کارکردگی پر مبارکباد پیش کی۔ اردو زبان کے جاپانی پروفیسر TSUGUCHI نے کہا کہ ناصر ناکاگاوا سے انکے پرانے تعلقات ہیں انھوں نے جاپان میں اردونیٹ جاپان کے توسط سے نہ صرف اردو کمیونٹی بلکہ اردو کے جاپانی مداح، طلبا و طالبات اور پرستاروں میں اردو کو متعارف کروانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا اور جاپانی اردو طلبا کے لیے اردونیٹ جاپان اردو سیکھنے کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے۔ NHK انٹرنیشنل اردو سروس کے انچارج جعفر بلوچ نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردونیٹ جاپان پر نہ صرف جاپان بلکہ دنیا بھر سے تازہ ترین خبروں کی اشاعت قابلِ ستائش ہے، اسلامک سرکل آف جاپان کے امیر سعید بیگ نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ ناصر ناکاگاوا کے بہت مشکور ہیں کہ انھوں نے کہا کہ اردونیٹ جاپان پر تمام مکتبۂ فکر کی خبریں شائع ہوتی ہیں، اردونیٹ جاپان کے چیف ایڈیٹر ناصر ناکاگاوا نے ہمیشہ دیگر اداروں سمیت اسلامک سرکل آف جاپان کی تقریبات کی بھی شاندار کوریج کی ہے، اردونیٹ جاپان کی جاپان میں اسلام و اردو کے فروغ کے لیے خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سہیل عباس خان نے کہا کہ 2008 میں جب وہ اوساکا میں یونیورسٹی میں پڑھایا کرتے تھے تو اس وقت ٹوکیو میں اردو کی صد سالہ تقریب میں ناکی ناصر ناکاگاوا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، انھوں نے اردونیٹ جاپان کے ذریعہ جاپان میں اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے، ڈاکٹر سہیل نے کہا کہ جاپان میں پہلی بار ایک سو سال قبل برِصغیر سے اردو کے استاد برکت اللہ صاحب تشریف لائے تھے، مہمانِ خصوصی نے کہا کہ اس وقت جاپان کی تین جامعات میں اردو کے تقریباً تین سو کے قریب طلبا و طالبات ہر سال اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اردونیٹ جاپان اردو کے طلبا و طالبات میں بھی مقبول ہے اور انھیں اردونیٹ جاپان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ آخر میں راشد بٹ نے سامعین سے اردونیٹ جاپان اور جاپان کے بارے میں چند دلچسپ سوالات کیے اور صحیح جوابات دینے والوں کو انعامات تقسیم کیے گئے۔ ناصر ناکاگاوا نے اپنے ان تمام کرم فرماؤں کا بھی شکریہ ادا کیا جو ہمیشہ اردونیٹ جاپان پر اپنے اشتہارات کے ذریعے ان کی مالی اعانت کرتے ہیں، ناصر ناکاگاوا نے کہا کہ اردونیٹ جاپان کی ترقی میں ہر اس لکھاری، ادیب و شاعر کا اہم کردار ہے جو ہمیشہ قارئین کے لیے معلوماتی اور اصلاحی تحریریں بھیجتے ہیں۔ ناصر ناکاگاوا نے معروف پاکستانی ریستوران نیوہاٹ مصالحہ کے روحِ رواں رانا عامر اور ان کے تمام ساتھیوں کا بھی شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، ناصر ناکاگاوا، اردونیٹ جاپان، ڈاٹ کوم، 20 اپریل 2014

خبر نامہ

قومی اردو کونسل اردو عربی اور فارسی کے معیاری مسودات کو مالی تعاون دینے کے لیے پرعزم: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

کونسل کے زیر اہتمام دو روزہ ورکشاپ کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی کے زیر اہتمام دو روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کے مختلف علاقوں سے کونسل کو موصول ہوئے مسودات پر مالی تعاون دینے کے سلسلے میں 187 مسودات اردو، عربی اور فارسی کے موصول ہوئے جنھیں ماہرین کی آرا کی روشنی میں مالی تعاون فراہم کیا جائے گا تاکہ اردو، عربی اور فارسی کے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ مسودات کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے انھوں ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر ناشر نقوی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر ارتضی کریم، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر اختر حسین اور پروفیسر انور پاشا نے بھی شرکت کی اور اپنی آرا سے کونسل کو مستفید کی۔

کونسل میں منعقدہ ورکشاپ کا منظر

سنجیدگی سے غور خوض کیا گیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ کونسل ہر سطح پر اردو عربی اور فارسی کے ادیبوں و قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہے اور ان کے مسودات کو مالی تعاون دیتی آئی ہے۔ امسال کونسل کو نے کہا کہ کونسل مالی تعاون دینے کے لیے تنقید، تخلیق، شاعری، افسانہ، ڈرامہ، ناول اور دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب و جدید موضوعات پر بھی خاص توجہ دے رہی ہے۔

اس دو روزہ ورکشاپ میں اردو، عربی اور فارسی کے ماہرین نے شرکت کی جن میں پروفیسر ایس اے اشرفی، ورکشاپ میں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی، ریسرچ آفیسر جناب شاہنواز خرم، ڈاکٹر کلیم اللہ، ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر توقیر راہی، ڈاکٹر قاسم انصاری، سید مجیب اور محترمہ مسرت جہاں نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 مئی 2014

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

اردو شاعری کے بابائے آدم: ولی دکنی'

بیدر: 20 اپریل (محمد یوسف رحیم بیدری) پریم چند ہندی کے بڑے مصنفین میں شمار ہوتے ہیں، ان کا بڑا ہونا اردو جاننے کی وجہ سے تھا۔ اگر کوئی اردو نہیں جانتا تو ہندی زبان یا کسی اور زبان میں غزل کہہ نہیں سکتا۔ مادام تساد میوزیم کے مومی مجسمے بنائے جاسکتے ہیں لیکن ان مجسموں میں جان نہیں ہوتی اسی طرح مردہ غزل کہنا اچھی بات نہیں۔ یہ بات ڈاکٹر سنیل پنوارواری نے کہی۔ وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور پریوگ والنٹیری آرگنائزیشن بیدر کے اشتراک سے منعقد ہونے والے سیمینار میں بحیثیت مہمان خصوصی سیمینار کا افتتاح کرنے کے بعد خطاب کر رہے تھے۔ 'اردو شاعری کے باوائے آدم: ولی دکنی' نامی اس سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ اردو کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو زبان قدیم شہر سے باہر نکلے، لوگوں کی دلچسپی کے لیے چھوٹے چھوٹے کتابچے فراہم کیے جائیں انھیں اردو پڑھائی جائے جبکہ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اردو کو پڑھنے اور پڑھانے کا دعویٰ کرنے والے خود

'اردو شاعری کے بابائے آدم: ولی دکنی' پر منعقدہ سیمینار کی ایک تصویر

اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں تعلیم دلا رہے ہیں۔ سیمینار کی صدارت ڈاکٹر عبدالرب استاد سابق صدر شعبۂ اردو وفارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ نے کی اور کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ ولی دکنی کے زمانے میں دہلی میں فارسی شاعری ہو رہی تھی، اس وقت ان کے استاد سید شاہ سعداللہ گلشن دہلوی نے صلاح دی کہ تم ریختہ (اردو) میں شعر درست کیوں نہیں کرتے؟ دہلی میں ریختہ کو بول چال کی حد تک محدود رکھ لیا گیا تھا۔ اہل دہلی سمجھتے تھے کہ ریختہ کو ادب کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ لیکن ولی دہلی پہنچے اور جو شاعری کی اس کی دھوم اہلیان دہلی میں مچ گئی۔ ولی دکنی کی قدر ومنزلت ان کی اپنی کوشش اور زبان وادب کے تئیں ان کے جذبۂ صادق کی وجہ سے ہوئی۔ ولی دکنی کے سر پر اولیت کا تاج ہے تو صرف اس لیے کہ جہاں (دہلی) اہمیت نہ تھی وہاں انھوں نے سترہویں صدی کی آخری دہائی اور اٹھارویں صدی کے آغاز کے دوران اردو غزل کی اہمیت منوائی۔ ذکی احمد سکریڑی پریوگ والنٹیری آرگنائزیشن نے اظہار تشکر کیا جبکہ محمد سعید نے نظامت کا فریضہ انجام دیا۔

پریس ریلیز محمد یوسف رحیم بیدری، 20 اپریل 2014

بھائی نندلال گویا کی فارسی شاعری

مالیرکوٹلہ: نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ (پنجابی یونیورسٹی) مالیرکوٹلہ کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی کے اشتراک سے ایک دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد انسٹی ٹیوٹ کی نئی عمارت میں کیا گیا۔ سیمینار کا آغاز کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کی صدر ڈاکٹر روبینہ شبنم نے انسٹی ٹیوٹ کی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور ساتھ ہی مہمانان کو خوش آمدید کہا۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر امرونت سنگھ نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے بھائی نندلال گویا کی شاعری میں گورو گوبند سنگھ جی کا مقام کے موضوع پر ایک نظم پیش کی اور ساتھ ہی اردو ترجمہ بھی بتایا۔ انھوں نے کہا کہ گورو گوبند سنگھ جی مہاراج ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر بلوندر سنگھ ٹوانا، ڈائریکٹر یو جی سی اکادمک اسٹاف کالج، پنجابی یونیورسٹی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ بھائی نند لال گویا درویشانہ طبیعت کے مالک تھے۔ سیمینار کے صدر ڈاکٹر جسپال سنگھ، وائس چانسلر پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ نے بھائی نندلال گویا کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ بھائی نندلال گویا نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ ان کی شاعری انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے۔ وائس چانسلر نے یونیورسٹی کی طرف سے اپنے اس انسٹی ٹیوٹ اور اس کی اردو خدمات کے لیے پانچ لاکھ روپے کی رقم دینے کا بھی اعلان کیا۔ اس تقریب میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے دانشور حضرات وعمائدین شہر موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 اپریل 2014

کشمیر یونیورسٹی میں علامہ اقبال یادگاری خطبہ

سری نگر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے تعاون سے شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی کشمیر میں پہلے علامہ اقبال سالانہ یادگاری خطبے کا انعقاد عمل میں آیا۔ شعبے کے استاد مشتاق حیدر نے جلسے کے آغاز میں

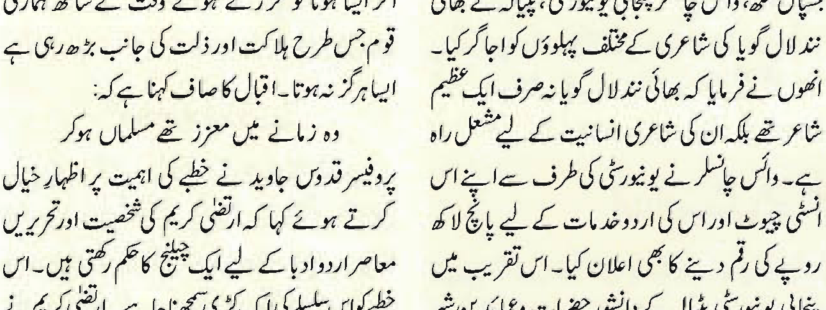

علامہ اقبال یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم

شعبہ اردو کی ادبی، علمی اور تدریسی خدمات پر روشنی ڈالی، نیز علامہ اقبال کے کلام اور فکر پر گفتگو کرتے ہوئے قومی کونسل کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس قومی ادارے نے ہمارے شعبہ اردو کو ہر سال اس نوع کے یادگاری خطبے کی منظوری مرحمت فرمائی ہے اس کے لیے شعبہ کونسل کا تہہ دل سے شکرگزار ہے۔ خطبے کا عنوان تھا 'ہم نے اقبال سے کیا سیکھا'۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے خطبے میں اقبال کی فکر، فلسفے اور اشعار کے حوالے سے اس بات کی اہمیت منوائی کہ ہم نے اقبال سے کچھ نہیں سیکھا۔ عام مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کو اپنی زندگی میں پوری طرح داخل نہیں کیا بلکہ صرف نمازِ جمعہ کی ادائیگی میں ہی تمام تر اسلامی احکامات کی تکمیل کو تصور کرلیا بالکل اسی طرح کلامِ اقبال پر ہم صرف سر دھنتے رہے لیکن اس کی روح تک ہماری رسائی نہ ہوسکی۔ اقبال نے ہمیں تعصب، فرقہ پرستی، نفرت، منافقت سے بچنے کی تعلیم دی۔ کلام اقبال کو ہم نے تدریسی اور نصابی طور پر استعمال تو کیا لیکن ہم نے اقبال کے پیغام پر نہ تو عمل کیا نہ اس سے کچھ سیکھنے کی کوشش کی، اگر ایسا ہوتا تو گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ہماری قوم جس طرح ہلاکت اور ذلت کی جانب بڑھ رہی ہے ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ اقبال کا صاف کہنا ہے کہ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر

پروفیسر قدوس جاوید نے خطبے کی اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ارتضیٰ کریم کی شخصیت اور تحریریں معاصر اردو ادبا کے لیے ایک چیلنج کا حکم رکھتی ہیں۔ اس خطبے کو اس سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔ ارتضیٰ کریم نے بہت سادہ مگر دلنشین انداز میں حاضرین کو جھنجھوڑتے ہوئے نہایت اہم سوال قائم کیا کہ ہم نے اقبال سے کیا سیکھا؟ صدارتی تقریر میں پروفیسر زماں آزردہ نے فرمایا کہ اقبال شناسی میں کشمیر یونیورسٹی کا بڑا نمایاں رول رہا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے کشمیر کی سرزمین میں ہی اقبال کی تفہیم کے اہم کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال نے ہمیں جس یگانگت، ہم آہنگی، مسلکی اختلافات سے احتراز، خودی اور خداشناسی کی تعلیم دی تھی، افسوس کہ ہم نے ان تعلیمات کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس موقعے پر شعبہ اردو کے سالانہ ادبی و تحقیقی مجلّہ 'بازیافت' کے تازہ شمارے کی بھی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ اس یادگاری

ادبی تقریب میں پروفیسر مجروح رشید، پروفیسر شاد رمضان، پروفیسر بشیر احمد، پروفیسر عارفہ بشریٰ، ڈاکٹر مشتاق گنائی، ڈاکٹر الطاف حسین، ڈاکٹر عرفان عالم، ڈاکٹر الطاف انجم کے علاوہ اسکالروں اور طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ آخر میں ناظم جلسہ مشتاق حیدر نے مہمانِ خصوصی پروفیسر ارتضیٰ اور دوسرے شرکا کا شکریہ ادا کر کے تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 اپریل 2014

'معاصر ادبی رویے'

کشمیر یونیورسٹی میں دو روزہ سیمینار 'معاصر ادبی رویے' کا ایک منظر

سرینگر : قومی اردو کونسل کے جزوی مالی تعاون سے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں 26 مارچ کو دو روزہ قومی سیمینار 'معاصر ادبی رویے' کا افتتاح ہوا۔ پہلی نشست کی نظامت ڈاکٹر عرفان عالم نے کی جب کہ جامعہ کشمیر کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر محمد امین صوفی، پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر بشیر احمد نحوی اور پروفیسر نیلوفر خان نے صدارت کی۔ ناظمہ فاصلاتی تعلیم جامعہ کشمیر پروفیسر نیلوفر خان نے اس موقعے پر مہمانوں اور دیگر شرکا کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر سیمینار کے سوینیر کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی۔ یہ پہلا موقع ہے جب اردو دنیا میں کسی سیمینار کا سوینیر جاری کیا گیا ہو۔ منتظم سیمینار ڈاکٹر الطاف انجم نے اس سوینیر کی اشاعت پر بحث کرتے ہوئے حاضرین کو اپنے خیالات سے روشناس کرایا۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی نے اردو زبان و ادب کی موجودہ صورتِ حال پر اظہار کیا۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر الطاف انجم کی کتاب 'اردو میں مابعد جدید تنقید: اطلاقی مثالیں، مسائل و ممکنات' کا اجرا بھی ہوا۔ حقانی القاسمی جو اس کتاب کے اولین قاری ہیں، نے اس کتاب پر بحث کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد قایم مقام رئیس الجامعہ کشمیر پروفیسر محمد امین صوفی نے صدارتی کلمات پیش کیے۔ سیمینار کی دوسری نشست پروفیسر ظہور الدین اور پروفیسر قدوس جاوید کی صدارت میں شروع ہوئی جس کی نظامت ڈاکٹر الطاف انجم نے انجام دی۔ اس نشست میں ڈاکٹر حبیب نثار اور دُردانہ قاسمی نے مقالے پیش کیے۔

سیمینار کے دوسرے روز یعنی 27 مارچ کو تین نشستوں کا اہتمام کیا گیا۔ پہلی نشست کی صدارت پروفیسر ظہور الدین اور پروفیسر شاہد حسین نے کی۔ نظامت ڈاکٹر نذیر آزاد نے کی اور نشست میں کل پانچ مقالے پڑھے گئے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر شفق سوپوری، حقانی القاسمی، پروفیسر نذیر احمد ملک، ڈاکٹر محمد یوسف خان عادل اور پروفیسر قدوس جاوید شامل تھے۔ دوسری نشست ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اور ڈاکٹر حبیب نثار کی صدارت میں ہوئی جس کی نظامت ڈاکٹر محی الدین زور نے کی۔ اس نشست میں ڈاکٹر ریاض توحیدی، ڈاکٹر الطاف حسین، سبزار احمد اور مشتاق حیدر کے مقالات سامعین کی توجہ کے مرکز بنے۔ تیسری نشست کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید اور پروفیسر ظہور الدین نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر الطاف انجم نے انجام دیے۔ اس نشست میں ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر محی الدین زور، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، پروفیسر شاہد حسین اور پروفیسر ظہور الدین نے مقالات پیش کیے۔ پروفیسر شاہد حسین نے منتظمینِ سیمینار کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس نوعیت کے سیمینار بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں مقالات پر بحث و تمحیص کے مواقعے فراہم کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر ظہور الدین نے پڑھے گئے سبھی مقالات پر اظہارِ خیال کیا اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ناظمہ پروفیسر نیلوفر خان اور شعبہ اردو سے وابستہ اساتذہ ڈاکٹر الطاف انجم اور ڈاکٹر عرفان عالم کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر قدوس جاوید نے آخری نشست کے صدارتی کلمات پیش کیے۔ پروفیسر نیلوفر خان نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، الطاف انجم، کشمیر یونیورسٹی، 28 مارچ 2014

اردو ادب میں غیر مسلم شعرا اور ادیبوں کا حصہ

لکھنؤ: آسٹرل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی و قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'اردو ادب میں غیر مسلم شعرا اور ادیبوں کا حصہ' عنوان پر ایک سیمینار رائے اماناتھ بلی آڈیٹوریم قیصر باغ میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی پروفیسر روپ ریکھا ورما نے اپنے خطاب میں کہا کہ سوسائٹی نے غیر مسلم شعرا پر سیمینار منعقد کر کے ایک اچھا کام کیا ہے۔ اردو ادب میں ہندو شعرا نے کافی کام کیا ہے، فراق گورکھپوری، چکبست لکھنوی، مشہور افسانہ نگار پریم چند، کرشن چندر اور

'اردو ادب میں غیر مسلم شعرا اور ادیبوں کا حصہ' پر منعقدہ سیمینار کا ایک منظر

دیگر ادبا نے ادب کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ اردو کی خاصیت ہی یہ رہی ہے کہ وہ اپنے چاہنے والوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ اردو ادب میں ہندو شعرا کا کافی اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے جہاں حب الوطنی کے پیغام دیے ہیں وہیں دونوں قوموں کو جوڑنے کا اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ تلک چند محروم، دیانارائن نگم، دتاتریہ کیفی، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی وغیرہ نے اردو ادب کی ترقی میں کافی اہم رول نبھایا ہے۔ اردو کو ترقی دینے میں جہاں مسلم شعرا نے کام کیا ہے وہیں برادران وطن بھی پیچھے نہیں رہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صبیحہ انور، پروفیسر صابرہ حبیب، سینئر صحافی حفیظ نعمانی اور سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر سوسائٹی کی جانب سے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر شمیم احمد، روپ ریکھا ورما، حفیظ نعمانی، ڈاکٹر صبیحہ انور، پروفیسر صابرہ حبیب اور پروفیسر شارب ردولوی کو مومنٹو دیا گیا۔ پروگرام کی نظامت رضوان احمد فاروقی نے کی اور مہمانوں کا شکریہ کنوینر مہندر سنگھ نے ادا کیا۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ، 13 اپریل 2013

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

بہادر شاہ ظفر کے باقیات واپس لانے کا صدر جمہوریہ کا وعدہ

نئی دھلی: ہندوستان کے آخری مغل فرماں روا اور پہلی جنگ آزادی 1857 کے سپہ سالار بہادر شاہ ظفر کی باقیات رنگون سے ہندوستان واپس لانے کی کوششوں نے گرچہ ابھی تک رنگ نہیں دکھایا ہے مگر خوش آئند خبر یہ ہے کہ صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی، بہادر شاہ ظفر مرحوم کی باقیات ہندوستان واپس لانے میں دلچسپی دکھا رہے ہیں۔ ساتھ

ہی ساتھ انھوں نے انتخابات ختم ہونے کے بعد باقیات واپس لانے کے تعلق سے اقدامات کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی نے یہ وعدہ جسٹس راجندر سچر (ریٹائرڈ)، مشہور صحافی سعید نقوی اور کلدیپ نائر کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران کیا۔ یہ تینوں افراد بہادر شاہ ظفر کی آخری خواہش کے احترام کے عنوان پر صدر جمہوریہ سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ مسٹر نقوی نے بتایا کہ ''بہادر شاہ ظفر کا پورا مقبرہ ہندوستان منتقل کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ رنگون میں جہاں ان کا مقبرہ ہے وہاں بھی بہادر شاہ ظفر کے ہزاروں عقیدت مند ہیں اس لیے ہم نے صدر جمہوریہ کے سامنے یہ تجویز رکھی ہے کہ ''بہادر شاہ ظفر کے مزار سے مٹی منگوا کر خواجہ بختیار کاکیؒ کے مقبرہ کے پاس ایک مزار بنوا دیں تاکہ اس عظیم شہنشاہ کی وہ آخری تمنا پوری ہو سکے جس کی قیادت میں مسلمان اور ہندو دونوں نے مل کر پہلی جنگ آزادی لڑی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اپریل 2014

غالب انسٹی ٹیوٹ میں غالب توسیعی خطبہ، دائیں سے: پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر سید رضا حیدر، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم، شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کا غالب توسیعی خطبہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 6 مئی کو 'غالب توسیعی خطبہ' کے موقع پر ممتاز ادیب و دانشور اور ماہر غالبیات پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے 'غالب کے غیر متداول دیوان' کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب کا غیر متداول دیوان ایک عرصے سے لوگوں کی توجہ کا اس طرح مرکز نہیں ہے جیسے اُسے ہونا چاہیے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ سوالات بھی اٹھائے کہ غیر متداول دیوان میں جو کلام موجود ہے اور جس کے بارے میں غالب نے یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اس کلام کو مسترد کر دیا تھا وہ مسترد کلام اصلاً کس کا رد کیا ہوا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ غالب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں مشکل گوئی ترک کر دی اور میر کا انداز اختیار کر لیا یہ بات بھی سراسر غلط ہے کیونکہ غالب کا تمام معروف اور مشہور کلام اُن کے ابتدائی زمانے کا کہا ہوا ہے۔ اس سے قبل غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آپ اس عہد کے بڑے ماہر غالبیات میں سے ہیں۔ غالب پر آپ نے جو کچھ تحریر کیا اُسے علمی و ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ آپ کی کتاب 'تفہیم غالب' غالب فہمی میں دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے یہ بھی کہا کہ ''غالب کے غیر متداول دیوان'' پر آپ کی جو بھی گفتگو ہوئی اُس سے یقیناً غالب تحقیق و تنقید میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے معروف غالب شناس ڈاکٹر خلیق انجم نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے علمی و ادبی مرتبے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان و ادب خصوصاً غالبیات کے حوالے سے آپ کی کاوشوں کو اردو دنیا میں ہمیشہ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے جلسے کی نظامت کرتے ہوئے غالب توسیعی خطبہ کو تاریخی قرار دیا انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے ایسے موضوع پر خطبہ پیش کیا۔ شاہد ماہلی نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور تمام سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی اہم کتاب 'تفہیم غالب' کے تیسرے ایڈیشن کی رسم رونمائی بھی ہوئی۔ جلسے میں امریکہ میں اردو کے ادیب جناب سید امجد حسن بھی موجود تھے جنھیں غالب انسٹی ٹیوٹ کی کتابوں کا تحفہ پیش کیا گیا۔

پریس ریلیز، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 7 مئی 2014

جشن صدائے دلی

نئی دھلی: قومی راجدھانی دہلی کے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ثقافتی تنظیم حسن آرا ٹرسٹ کے زیر اہتمام 'صدائے دلی' کے موضوع پر جشن کا اہتمام کیا گیا جس میں شہید ہند سردار بھگت سنگھ کی قربانیوں کو یاد کیا گیا اور نئی نسل کو ملک کی ترقی و سلامتی کے لیے شہدائے وطن سے درس لینے کی تاکید کی گئی۔ اس موقعے پر معروف مصور ڈاکٹر علی جعفر نے مہمانان خصوصی کی خدمت میں بھگت سنگھ

کی تصویر بھی پیش کی۔ ممتاز صوفی شاعر سندیپ سانکس کی صدارت میں منعقد اس تقریب کا افتتاح سپریم کورٹ کے جسٹس ٹھاکر نے کیا جب کہ مہمانانِ معظم کے طور پر سابق گورنر آسام وجھارکھنڈ سید سبط رضی، دوردرشن کے ڈائرکٹر جنرل ایس ایم خاں، جسٹس انا ملہوترہ، سماجی کارکن وبیرسٹر ڈاکٹر سمنت بھاردواج، جسٹس سردار اہلووالیہ و دیگر اہم شخصیات موجود تھیں۔ اس موقعے پر پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے استقبالیہ کلمات ادا کیے اور پروگرام کی اہمیت کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر سید سبط رضی نے کہا کہ دہلی جس کا قدیمی نام دلی ہے ہمیشہ سے ہندوستانی ثقافت کا مرکز رہی ہے، یہاں تمام مذاہب کے فیسٹول، تمام زبانوں کے جشن منعقد کیے جاتے تھے۔ جسٹس ٹھاکر نے اردو شعراء کرام کی پذیرائی کی اور کہا کہ ثقافتی فروغ کے لیے وہ ہمیشہ دہلی کی قدیمی تہذیب کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ پروگرام کے دوسرے سیشن میں ایک شعری نشست کا بھی انعقاد کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اپریل 2014

'ٹیپو سلطان کا تصور ہندوستان'

سرسید اویرنس فورم کے ذریعے 'ٹیپو سلطان کا تصور ہندوستان' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ خطاب کرتے ہوئے

علی گڑھ: بزدل زندگی میں کئی بار مرتے ہیں اور بہادر صرف ایک بار۔ ٹیپو سلطان شہید بہادروں کی طرح زندگی بھر جیے اور جام شہادت بھی بہادروں کی طرح پیا۔ ان خیالات کا اظہار مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ نے سرسید اویرنس فورم کے ذریعے منعقدہ 'ٹیپو سلطان کا تصور ہندوستان' موضوع پر منعقدہ اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔ مہمان خصوصی مسٹر ایس ایم اے کاظمی، سابق ایڈوکیٹ جنرل یوپی نے کہا کہ ٹیپو سلطان اس ملک کی مشترکہ تہذیب میں مسلم حکمرانوں کے تاریخی کارناموں کی زندہ مثال ہیں جنھوں نے اپنی اسی فیصدی غیر مسلم رعایا کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور انصاف سے اتنا متاثر کیا۔

اپنے کلیدی خطبے میں دینیات فیکلٹی کے ڈین اور مشہور عالم دین پروفیسر سعود عالم قاسمی نے کہا کہ حکومتیں محبت اور انصاف سے چلتی ہیں اور جو حاکم یہ نہ کرسکے اسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ پروگرام کے ڈائرکٹر اور سرسید اویرنس فورم کے صدر ڈاکٹر شکیل صمدانی نے کہا کہ ٹیپو سلطان کے یوم شہادت پر ان کو یاد کرنا نہ صرف قومی بلکہ ملی فریضہ ہے۔ شعبۂ ماس کمیونی کیشن کے چیئرمین پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ آج کے سیاسی تناظر میں ٹیپو کو یاد کرنا ایک صالح روایت کو زندہ کرنا ہے۔ شعبۂ ماس کمیونی کیشن کے سینئر استاد پروفیسر این اے کے درانی نے جن کا تعلق میسور سے ہے، تفصیل سے ٹیپو سلطان کے بارے میں بتایا۔ ٹیپو نے میسور میں نہ صرف سلک کے کاروبار کو فروغ دیا بلکہ پوری دنیا کو میزائل جیسے ہتھیار سے روشناس کرایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مئی 2014

حسرت موہانی: مشن اور شاعری

نئی دھلی: مولانا حسرت موہانی نے سب سے پہلے ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولوشن پیش کیا تھا، جس کو وقتی طور سے گاندھی جی نے نامنظور کردیا مگر 1929 میں

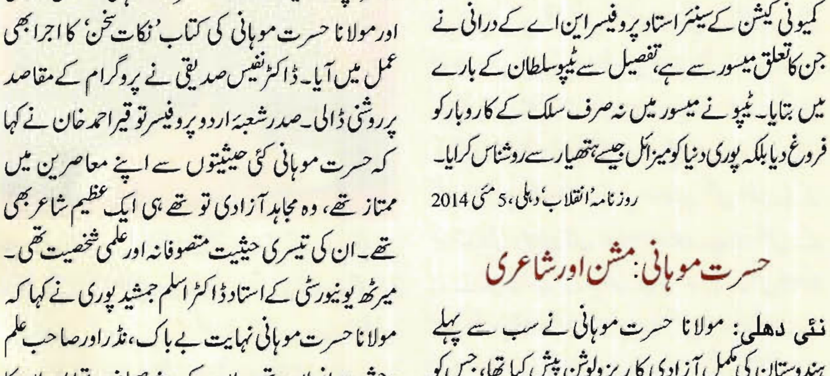

کتابوں کا اجرا کرتے ہوئے ڈاکٹر عزیز قریشی، پروفیسر محمد سلیم قدوائی، پروفیسر توقیر احمد خان، ڈاکٹر نفیس احمد، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، اسرار احمد ودیگر

خود جواہر لال نہرو نے اس نعرے کو دہرایا۔ وہ بے باک خطیب، لیڈر، مجاہد، شاعر اور صحافی تھے۔ ان کے نام سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی میں 'حسرت موہانی چیئر' قائم کیا جانا چاہیے، تاکہ ان کی حیات وخدمات کے تمام ترگوشے سامنے آسکیں۔ مولانا حسرت موہانی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 'حسرت موہانی مشن اور شاعری' کے عنوان سے غالب اکادمی میں منعقدہ ایک روزہ قومی سیمینار کے موقعے پر اتراکھنڈ کے گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی نے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ دستور اساسی کی تشکیلی کمیٹی کے ممبر تھے، جب ان کے پاس دستور کا مسودہ دستخط کے لیے پیش کیا گیا تو انھوں نے دستخط کرنے کے بجائے ایک نوٹ لکھ کر واپس کردیا کہ یہ دستور غریبوں کے بنیادی حقوق کے خلاف ہے اور ان کے دستخط کے بغیر ہی یہ دستور پالیمنٹ میں پاس ہوگیا۔ انھوں نے پارلیمنٹ کے ممبر ہونے کے باوجود کوئی الاؤنس اور سرکاری کوارٹر لینا گوارا نہیں کیا۔ انھوں نے مسلم لیگ کے نظریہ تقسیم کی بھی سخت مخالفت کی اور تقسیم کے بعد ہندوستان میں ہی رہنا پسند کیا۔ پروگرام میں ڈاکٹر نفیس صدیقی ایڈوکیٹ کی تحریر کردہ کتابیں، فرسٹ کمپلیٹ انڈپنڈنٹ ریزولوشن اینڈ حسرت موہانی جیل ایکسپرینسیز، بھارت کا پرتھم پورن سوتنترا پرستاؤ اینڈ مقدمہ اور حسرت موہانی کا جیل آلوکن اور مولانا حسرت موہانی کی کتاب 'نکات سخن' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ڈاکٹر نفیس صدیقی نے پروگرام کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر توقیر احمد خان نے کہا کہ حسرت موہانی کئی حیثیتوں سے اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، وہ مجاہد آزادی تو تھے ہی ایک عظیم شاعر بھی تھے۔ ان کی تیسری حیثیت متصوفانہ اور علمی شخصیت تھی۔ میرٹھ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ مولانا حسرت موہانی نہایت بے باک، نڈر اور صاحب علم وحیثیت انسان تھے۔ ان کے پیشہ صحافت تھا اور ان کا اخبار اردوئے معلی نے جنگ آزادی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اخیر میں ڈاکٹر نفیس صدیقی نے تمام سامعین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اپریل 2014

عالمی صوفی کانفرنس کا منظر

شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تقسیم انعامات

نئی دھلی: ہم مقابلہ جاتی اور اسپیشلائزیشن کے زمانے میں جی رہے ہیں، ایسے وقت میں نئی نسل کو مقابلہ جاتی دور کے تقاضوں سے روشناس کرانے، اس کو معیار کے مطابق تیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے طلبہ زبان وادب کی اچھی طرح خدمات انجام دے سکیں۔ شعبہ فارسی کے اساتذہ اور طلبہ اس اہم کام کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے شعبۂ تاریخ کے سیمینار حال میں تقسیم انعامات، بیت بازی اور رسم اجرا کی تقریب کے مہمانِ خصوصی ایران کلچر ہاؤس کے ڈپٹی کونسلر احمد عالمی نے کیا۔ نظامت بزم دانش جویان کے مشیر ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر عبدالحلیم نے پیش کیے۔ تقریب کی صدارت شعبۂ فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی نے کی۔ اس موقعے پر طلبہ کے درمیان فارسی بیت بازی کا مقابلہ عمل میں آیا۔ بنیاد علی امید، ایم اے سال اوّل، عامر اعظم، انصاری عبدالرحمٰن، بی اے سال دوم کو بالترتیب پہلے دوسرے تیسرے انعامات سے نوازا گیا۔ جب کہ تین خصوصی انعامات وحید بشریٰ، بی اے سال آخر، محمد اقرا، محمد فیصل، بی اے سال اوّل کو دیے گئے۔ اس موقعے پر کمال احمد صدیقی کی کتاب 'بادبان کا عروضی مطالعہ' تجزیہ نگار بھٹناگر شاداب کی رسم اجرا احمد عالمی اور پروفیسر عراق رضا زیدی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اپریل 2014

ڈاکٹر رشید جہاں کی سوانح انگریزی میں

نئی دھلی: جدید اردو ادب میں اگر کسی مصنفہ نے ہمت کے ساتھ عورتوں کے حق میں آواز بلند کی تو وہ ڈاکٹر رشید جہاں تھیں۔ رشید جہاں کی اسی خصوصیت نے عصمت چغتائی جیسی مصنفہ کو بھی خاص متاثر کیا۔ اترپردیش کے علی گڑھ میں 25 اگست 1905 میں پیدا ہوئی رشید جہاں کی زندگی سے متعلق ان باتوں کا انکشاف انگریزی میں شائع ہونے والی ان کی سوانح عمری میں ہوا ہے۔ 'سوشل چنج' جریدے سے منسلک سرکردہ ادیبہ اور اردو کی معروف ریسرچر ڈاکٹر رخشندہ جلیل کے ذریعے ترتیب دی گئی اس سوانح عمری کا اجرا حال ہی میں اندرا گاندھی راشٹریہ کلا کیندر میں کیا گیا۔ اس موقعے پر معروف مارکسسٹ مفکر ڈاکٹر اعجاز احمد جیسے لوگوں نے بھی کتاب کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محترمہ جلیل کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر رشید جہاں کی تصانیف سے نہ صرف عصمت چغتائی بلکہ رضیہ سجاد ظہیر اور عطیہ حسین جیسی ادیبائیں بھی خاصی متاثر تھیں۔ یہ دیگر بات ہے کہ ڈاکٹر رشید عصمت چغتائی کی طرح مقبول نہیں ہو پائی اور مورخین نے ان کو آنکنے میں سستی دکھائی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ نہ صرف مصنفہ تھیں بلکہ ایک مایہ ناز کمیونسٹ ورکر بھی تھیں۔ پیشے سے رشید جہاں ڈاکٹر تھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے وقت نکال کر 1930 کی دہائی میں عورتوں کے مسائل پر اپنی تصانیف کو سماج کے سامنے پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 مئی 2014

عالمی صوفی کانفرنس

پٹیالہ: بابا فریدؒ، پنجاب سے متعلق وہ صوفی بزرگ ہیں جنھوں نے اپنے پیغام اور کلام سے نہ صرف تصوف کو منفرد شناخت دی بلکہ مقدس گروگرنتھ صاحب میں شامل ہوکر اپنی عظمت کا لوہا منوایا ہے۔ پنجاب صوفیوں اور بابا فرید کی دھرتی ہے اس کا اعلان ڈاکٹر جسپال سنگھ وائس چانسلر نے پنجابی یونیورسٹی میں بابا فرید صوفی سینٹر قائم کر کے کیا ہے۔ یونیورسٹی میں منعقدہ 4 اور 5 مارچ کی عالمی صوفی کانفرنس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے یہ بھی کہا کہ برصغیر ہند و پاک میں تصوف کا آغاز پنجاب کے داتا صاحب لاہوری سے ہوتا ہے۔ خصوصی مہمان پدم شری ڈاکٹر سرجیت پاتر نے کہا کہ صوفی بزرگ وہ گھنیرے درخت ہیں جو اسلام کی چار دیواری میں ضرور پیدا ہوئے لیکن ان پیڑوں کے پھل سب کے لیے مشترک ہیں۔ درگاہ اجمیر شریف کے گدی نشین پروفیسر لیاقت حسین معینی نے پنجاب کے صوفیائے دوسرے اہم صوفیائے کرام، امام مشہد علیؒ، شاہ حسین، سلطان باہو، بلھے شاہ، مجدد الف ثانی، وارث شاہ وغیرہ کی عظیم شخصیات اور ان کی انسانی خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ اپنے صدارتی خطبے میں وائس چانسلر ڈاکٹر جسپال سنگھ نے کہا کہ تصوف پنجابیوں کا طرزِ حیات ہے اس کی روشنی میں ہی سکھ مذہب پروان چڑھا بابا فرید کا کلام اس کی مثال ہے جس کا ہم آیات کی طرح جاپ کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جلد ہی ہم صوفی سینٹر سے انسائکلو پیڈیا آف صوفی ازم، پنجابی اور اردو میں بھی تیار کرا کر شائع کرائیں گے۔ افتتاحی تقریب میں سینٹر کے چھ ماہی رسالہ 'گنج شکر' کا بھی اجرا عمل میں آیا۔ کانفرنس کے پہلے اکادمک اجلاس کی صدارت راجستھان کے شمسی تہرانی اور چنڈی گڑھ کے پروفیسر سکھ دیو سنگھ نے کی جس میں پروفیسر تجندر سنگھ پٹیالہ نے بابا فرید کے پیغامات کی اہمیت پر گفتگو کی اور پنجابی کے کلامِ فرید کو دوسری ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کر کے چھاپنے کی تجویز رکھی جسے ڈاکٹر ناشر نقوی نے پورا کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ ڈاکٹر کمیل پریت نے شاہ حسینؒ کے بغاوتی صوفیانہ کلام پر پنجابی میں مقالہ پیش کیا۔ اجمیر یونیورسٹی کی ڈاکٹر شمع خان نے تصوف کے روحانی عناصر کے موضوع پر ہندی میں اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے صوفیانہ عشقِ حقیقی کی علامتی تشریح کی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر ناشر نقوی، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ، 6 مارچ 2014

'بہار میں تخلیقی نثر' پر ادبی مذاکرہ

نئی دھلی: غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں ڈاکٹر قیام نیر کی کتاب 'بہار میں تخلیقی نثر (آزادی کے بعد)' پر منعقدہ ایک ادبی مذاکرے میں ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے کوآرڈی نیٹر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ اردو کے استاد پروفیسر شہزاد انجم نے مذکورہ کتاب کو بہار کی جدید نثری ادبیات کے حوالے سے ایک جامع مرقع بتایا۔ پروفیسر شہزاد انجم مذاکرے میں صدر کی حیثیت سے شریک تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر کوثر مظہری اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تخلیق کار کو کسی ایک علاقے سے جوڑ کر دیکھنا بہت ہی افسوس ناک ہے۔ دیال سنگھ کالج دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر مولا بخش اسیر

فروغ اردو کا کام پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں کے تحت استقبالیہ پروگرام کے اسٹیج کا منظر

نے کہا کہ ہر ادب علاقائی ہوتا ہے کیونکہ ادب اپنے مقام اور مرکز سے الگ نہیں ہوسکتا۔ ادب پہلے مقامی ہوتا ہے پھر آفاقی۔ انھوں نے کتاب پر بحث کرتے ہوئے قیام نیر کی کوششوں کو سراہا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے کی۔ اس موقعے پر کتاب کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر قیام الدین نیر نے تمام مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 اپریل 2014

فروغِ اردو کا کام پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں

دهلی: اردو پاکستان کی قومی زبان ہے، مگر اس کی سرپرستی اور اس کے فروغ کے لیے جتنا کام ہندوستان میں ہورہا ہے اتنا پاکستان میں نہیں، یہاں اردو کے فروغ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو جتنی گرانٹ حکومت ہند کی جانب سے ملتی ہے، پاکستان میں اردو کے فروغ کے لیے وہاں کی مرکزی حکومت ریاستی حکومتوں اور بلدیاتی اداروں سے ملنے والی رقم اس کے مقابلے بہت کم ہے، ان خیالات کا اظہار پاکستان سے آئے روزنامہ جنگ کے سابق ایڈیٹر محمود شام نے معروف صحافی محمد عتیق صدیقی کی جانب سے منعقد ایک تقریب میں کیا۔ پاکستان کے ادبی وصحافتی ماحول کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پاکستان میں بھی لوگ اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم دلاتے ہیں، اس کے باوجود اردو بہت پڑھی جاتی ہے۔ محمد عتیق صدیقی نے دہلی کے مختصر قیام کے دوران اس تقریب کے لیے وقت نکالنے پر مہمان کا شکریہ ادا کیا اور اردو صحافت کے حوالے سے مسائل اور اس کے رجحان کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر شیخ منظور، قاری محمد میاں مظہری، ممتاز چاولہ، سابق کونسلر حامد حسین خضر، فاروق ارگلی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے آخر میں شاعر گلزار دہلوی کی صدارت میں ایک مختصر شعری نشست ہوئی، جس میں محمود شام کے علاوہ شہباز ندیم، فاروق ارگلی، ڈاکٹر ظفر مراد آبادی، رؤف رضا، اقبال فردوسی اور وقار مانوی نے اپنے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اپریل 2014

بچوں کی صحت اور ٹیکہ کاری سے متعلق اردو ایڈیٹرس کا مذاکرہ

نئی دهلی: حکومت ہند کے ذریعے نئی نئی صحت اسکیمیں لائے جانے کے بعد بھی ملک میں حفظانِ صحت ابھی بھی چیلنج ہے، خاص طور سے بچوں کی صحت کے لیے ٹیکہ کاری اور اس کے تحفظ کے لیے ہمیں معاشرہ کو بیدار کرنا ہوگا۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں یونیسیف اور سماجی تنظیم شکھر کے اشتراک سے منعقدہ بچوں کے اندر حفظانِ صحت اور ٹیکہ کاری کے سلسلے میں اردو ایڈیٹرس کی میٹنگ میں حفظانِ صحت کے تئیں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اردو کے اخبارات سے وابستہ لوگوں نے اس سلسلے میں پیش آنے والے چیلنجز کو حل کرنے کے لیے اہم مشورے دیے۔ اس موقعے پر لسانی اقلیات حکومت ہند کے کمشنر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو زبان ہندوستان کے ایک تہائی افراد کی زبان ہے اور یونیسیف کے ذریعے بچوں کے حفظانِ صحت اور ٹیکہ کاری کے سلسلے میں کیے جانے والے اس بیداری مہم پروگرام میں اردو ایڈیٹر کو اہم کردار ادا کرنا چاہیے۔ اردو ایڈیٹرس کی یہ میٹنگ اس کے حل کرنے میں بڑی اہم ثابت ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ پولیو مہم کی کامیابی میں بھی اردو والوں کا ہاتھ رہا ہے۔ پروفیسر اصغر وجاہت نے کہا کہ ہمیں بیماریوں کے وجوہات کی طرف غور کرنا چاہیے۔ ہندوستان ایک کثیرالجہت ملک ہے ایسی صورت میں ہمیں کثیر جہتی لائحہ عمل اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے ابتدائی سیشن کی صدارت این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی۔ جب کہ مہمان اعزازی کی حیثیت سے شامل دوردرشن کے ڈائریکٹر جنرل ایس ایم خان اور سہارا اردو کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے بھی ملک اور خاص طور پر مسلم کمیونٹی میں حفظانِ صحت کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی حفظانِ صحت کے تئیں بیداری پیدا کرنے پر زور دیا۔ اس موقعے پر بچوں کی صحت کے تئیں بیداری پیدا کرنے اور اس سلسلے میں حائل چیلنجز کو ختم کرنے کے طریقہ کار پر مشتمل ایک شارٹ فلم بھی دکھائی گئی۔ میٹنگ میں یونیسف کی کمیونکیشن افسر سونیا سرکار نے ان تمام باتوں کو عملی جامہ پہنانے کا عہد کیا۔ شکھر تنظیم کے ذمے دار پروفیسر ریحان خان سوری نے میٹنگ کی نظامت کی اور اخیر میں تنظیم کے جنرل سکریٹری ندیم اختر نے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اپریل 2014

دهلی:

دہلی یونیورسٹی میں مہاتما گاندھی پر سیمینار

نئی دهلی: مہاتما گاندھی نے ایک متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھا تھا جہاں لوگوں کی شناخت ان کی زبان، ذات اور دھرم کی بنیاد پر نہ ہو۔ وہ سبھی زبانوں کی بات کرتے تھے لیکن ان کا ماننا تھا کہ ایک زبان رابطے کی ہونی چاہیے، اس کے لیے وہ ہندوستانی کی وکالت کرتے تھے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پروفیسر ابن کنول نے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ سنسکرت، ہندی، انگلش، اردو، عربی اور فارسی کی جانب سے مشترکہ طور پر منعقد ہونے والے یک روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ پروفیسر ابن کنول نے سیمینار کو گاندھی جی کے خوابوں کی تعبیر قرار دیتے ہوئے کہا کہ گاندھی جی کے اپنے ہم عصر ادیبوں اقبال، ٹیگور اور پریم چند سے تعلقات تھے۔ ان سب نے گاندھی سے اثرات قبول کیے اور گاندھی جی بھی ان سے متاثر ہوئے۔ ترقی پسندوں کے منشور میں بھی زیادہ تر نکات وہی ہیں جس کی دعوت گاندھی جی اپنی تحریروں اور تقریروں میں دیا کرتے تھے۔ پروفیسر آر این واٹس نے اپنے خطاب میں موجودہ زمانے میں گاندھی ازم کی اہمیت اور افادیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ملک ترقی گاندھی واد پر چل کر ہی کرسکتا ہے۔ شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے عربی اور فارسی کو بھی ہندوستانی زبانوں میں شامل کرنے پر پروگرام کے کنوینر پروفیسر بھاردواج صدر شعبۂ سنسکرت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ دہلی یونیورسٹی نے عربی اور فارسی کو ہمیشہ ہندوستان کی زبان مانا ہے۔ پروفیسر بھاردواج نے اپنے خطاب میں پروفیسر نعمان کی تائید کرتے ہوئے کہا

جے این یو میں محمد حسن یادگاری خطبے کے دوران دائیں سے رتن سنگھ، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر خواجہ محمد اکرام اور پروفیسر انور پاشا

کہ ہماری تاریخ کا ایک بڑا سرمایہ فارسی اور عربی میں ہے، ہم ان زبانوں کو غیرملکی کہہ کر شرمندگی اپنے سر مول لینا نہیں چاہیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اپریل 2014

جے این یو میں پروفیسر محمد حسن میموریل لیکچر

نئی دهلی: اقبال سے بڑا انقلابی فکر کا حامل شاعر اور دانشور اردو ہی نہیں دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی نظر نہیں آتا ہے۔ اقبال دراصل پیدائشی انقلابی تھے۔ اقبال کا مطالعہ بنی نوع انسان کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ آج نئی نسل کو ذمے داری کے ساتھ اقبال کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں پروفیسر محمد حسن یادگاری خطبے کے دوران ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے 'علامہ اقبال کی انقلابی فکر' کے حوالے سے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کے اشعار کا حوالہ دے کر ان کی آفاقیت اور عصری معنویت کو اجاگر کیا۔ مشہور ترقی پسند نقاد، عصری ادب کے مدیر، ضحاک جیسے ڈرامہ کے خالق پروفیسر محمد حسن جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے بنیاد گزاروں میں تھے، ان کے نام سے ہر سال جے این یو میں محمد حسن میموریل لیکچر منعقد ہوتا ہے۔ پروفیسر انور پاشا نے پروفیسر محمد حسن کی خدمات اور ان کے ساتھ بیتے ہوئے لمحوں کو جذباتی انداز میں یاد کیا۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی اور این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ پروفیسر محمد حسن صرف ادیب ہی نہیں بلکہ ادب ساز بھی تھے۔ وہ ہر کام میں اصول کے پابند تھے، اصول شکنی کبھی برداشت نہیں کرتے اور اپنے شاگردوں کو ہمیشہ اس بات پر تنبیہ کرتے۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے مرکز کے استاد ڈاکٹر شفیع ایوب نے کہا کہ پروفیسر محمد حسن اور پروفیسر عبدالحق دونوں علامہ اقبال کے عاشق زار ہیں۔ اس طرح پروفیسر محمد حسن یادگاری خطبے کے موقعے پر علامہ اقبال کی یاد کے لیے پروفیسر عبدالحق کا انتخاب بے حد حسین سنگم ہے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے مشہور افسانہ نگار رتن سنگھ نے ترقی پسند ادب کو فروغ دینے کے لیے پروفیسر محمد حسن کے احساسات و جذبات کا ذکر کیا۔ انھوں نے جے این یو کے طلبہ کو مخاطب کر کے کہا کہ اس میموریل لیکچر کا مقصد اس وقت پورا ہوگا، جب آپ میں سے کوئی محمد حسن بن کر سماج کو سمت و رفتار عطا کریں گے۔ خطبہ کے آغاز میں سینٹر کے موجودہ چیئرپرسن پروفیسر رام بخش جاٹ نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اپریل 2014

اردو میڈیم اساتذہ کے لیے تربیتی ورکشاپ

نئی دهلی: اکادمی برائے فروغِ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیر اہتمام کشمیر اردو میڈیم اساتذہ کے دس روزہ تربیتی ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس میں مہمانِ خصوصی پروفیسر عبدالرحیم قدوائی ڈائریکٹر اکیڈمک اسٹاف کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اردو کے حوالے سے اساتذہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آموزگار کی ذہنی سطح، اس کی رغبتوں اور دلچسپیوں کو اپنی سرگرمی کا محور بنائیں۔ انھوں نے نصاب اور مقررہ نظام تعلیم کے باریک فرق کو واضح کرتے ہوئے اساتذہ میں درسی سرگرمیوں کی فضا کو اپنی شخصیت کا حصہ بنانے پر زور دیا۔ خیرمقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر واحد نظیر نے کہا کہ دس روز تک چلنے والے اس تربیتی ورکشاپ میں کشمیر خطے کے اردو میڈیم اساتذہ کو پہلی بار بلایا گیا ہے۔ 30 اساتذہ پر مشتمل اس پورے پروگرام میں کل 37 سیشن ہوں گے جن میں تدریس زبان و ادب کے مختلف موضوعات پر ماہرین اور اساتذہ لیکچرز دیں گے۔ پروفیسر غضنفر علی، ڈائریکٹر اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے صدارتی خطبے میں انسان کی چار خوبیوں قوتِ متخیلہ، قوتِ احساس، قوتِ ممیّزہ اور قوتِ گویائی کو جلا دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ افتتاحی پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر نوشاد عالم نے انجام دیے۔ آخر میں پروگرام کو آرڈی نیٹر ڈاکٹر نوشاد عالم نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اپریل 2014

دہلی کالج کا سالانہ جلسہ

نئی دهلی: ذاکر حسین دہلی کالج میں سالانہ جلسہ کا انعقاد کیا گیا، جس میں نامور مورخ محمود فاروقی نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دہلی کالج کی اپنی ایک تابناک تاریخ رہی ہے۔ یہ کالج ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا ایک عظیم گہوارہ تھا۔ اس کالج سے مولوی محمد باقر، مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ماسٹر رام چندر جیسی عظیم شخصیات وابستہ تھیں، جنھوں نے جدید تعلیم اور جدید فکر و نظر کو پروان چڑھانے میں خصوصی کردار ادا کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ذاکر حسین دہلی کالج ایک ایسا ادارہ ہے، جہاں طلبہ کی اکیڈمک اہلیت کے ساتھ ساتھ کلچرل فروغ کو خصوصی توجہ حاصل ہے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم اسلم پرویز نے مہمان خصوصی محمود فاروقی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ محمود فاروقی ایک عالمی شہرت یافتہ اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے سینٹ پیٹر کالج، آکسفورڈ یونیورسٹی سے اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا۔ وہاں سے واپس آکر 'دستک' نام سے ایک تھیٹر گروپ قائم کیا ہے، جو شعبۂ تھیٹر میں انتہائی سرگرم عمل ہے۔ ذاکر حسین دہلی کالج میں ہر سال جوش و خروش سے سالانہ جلسہ منعقد کیا جاتا ہے، جس میں بہتر کارکردگی کے لیے طلبہ کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اس موقعے پر جو انعامات دیے جاتے ہیں ان میں کالج کلر، کالج کریسٹ، میرٹ ایوارڈ، این سی سی ایوارڈ اور اسپورٹس ایوارڈ وغیرہ اہم ہیں۔ شعبۂ اردو کی جانب سے اچھی کارکردگی کے لیے گل نواز پروین، ایم اے سال اوّل فرح ناز، ایم اے سال اوّل، عبدالعظیم، بی اے سالِ سوم، انعم عتیق، بی اے سال سوم، محمد حسنین، بی اے سال دوم، اسلم، بی اے سال دوم، اور محمد محسن، بی اے سال اول کو انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر متعدد شعبہ جات سے شائع ہونے والے رسالوں کا اجرا مہمانِ خصوصی محمود فاروقی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس سال شعبۂ اردو کا مجلّہ 'فکرِ نو' خصوصی توجہ کا حامل رہا۔ شعبۂ انگریزی کی استاد رشمی نے انعامات کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر سونو ترویدی نے جلسے کی نظامت کی اور آخر میں ڈاکٹر رتنم واٹل نے اظہارِ تشکر کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اپریل 2014

غالب اکادمی میں حضرت نظام الدین میں سید قمرالحسن کی کتاب 'جن سے الفت تھی بہت' کا اجرا کرتے ہوئے شرکا

کتاب 'جن سے الفت تھی بہت' پر مذاکرہ

نئی دهلی: غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں سید قمرالحسن کی کتاب 'جن سے الفت تھی بہت' پر مذاکرے کے دوران ادیب و دانشور نے خودنوشت اور سفرنامہ کے حوالے سے اہم باتیں بتاتے ہوئے سید قمرالحسن کی کوششوں کو سراہا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے کہا کہ میں ایمانداری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کے تمام مشمولات مکمل صداقت پر مبنی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب کے مطالعے سے مجھے پہلی بار اندازہ ہوسکا ہے کہ کہ سید قمر الحسن مختلف اصناف سخن میں کافی درک رکھتے ہیں۔ پروگرام کے افتتاح میں غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے اس کتاب کی اہمیت اور معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے سید قمرالحسن کی حیات و خدمات کے حوالے سے گفتگو کی۔ کتاب کے مصنف سید قمرالحسن نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جب میں نے آپ بیتی قلم بند کرنے کا ارادہ کیا تو ذہن میں نہ تو کوئی خاکہ تھا اور نہ کوئی واضح پروگرام، شاید یہی وجہ ہے کہ جب میں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور قلم سنبھالا تو قلم نے ہی بغاوت کردی۔ وہ میری اپنی ذات کو نظرانداز کرتا چلا گیا اور لاشعوری طور پر دوسرے، بہت سے کردار میری اس کہانی کا حصہ بنتے چلے گئے اور اس طرح یہ کتاب تنہا میری آپ بیتی نہ رہ کر 'ہماری آپ بیتی' بن گئی۔ پروفیسر ابن کنول نے اپنے خطاب میں کہا کہ افسانوی ادب کی اصناف میں خودنوشت اور سفرنامے کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ یہ کسی بھی عہد کے جغرافیے اور تہذیبی تاریخ کو مکمل طور سے بیان کرتی ہیں۔ ڈاکٹر خورشید اعظمی نے کہا کہ یہ کتاب ایک ایسی خودنوشت اور دلفریب سفرنامہ ہے جس میں آبا و اجداد، اعزا، اقربا، رفقائے کار تلامذہ، چند ناپسندیدہ کردار، پھر آبائی وطن سے لے کر دانش گاہوں مختلف دلکش مقامات کی سیر نیز حرمین شریفین کی زیارت کی یادوں کی بے شمار قندیلیں روشن کردی ہیں جنھیں پڑھ کر قاری کے دل و دماغ منور ومنزہ ہوجاتے ہیں۔ اس موقعے سے دوسرے حضرات نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اپریل 2014

آندھرا پردیش:

نصرت محی الدین کی یاد میں جلسہ

حیدر آباد: مخدوم محی الدین ترقی پسند ادیبوں میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ آج بھی مخدوم ادب والوں میں زندہ ہیں۔ حیدرآباد کو فخر ہے کہ مخدوم جیسا شاعر پیدا ہوا اور آسمان ادب میں اپنی تابانیوں کے ذریعے اردو

ادب کو مالامال کیا۔ ان خیالات کا اظہار زاہد علی خان مدیر اعلیٰ روزنامہ سیاست نے پروانہ ہال گن فاؤنڈری میں منعقد یادنصرت محی الدین کے جلسے سے صدارتی خطاب میں کیا۔ اس موقعے پر زاہد علی خان نے نصرت محی الدین کے شعری مجموعہ 'انتظار نئے موسم کا' جسے محمد حمید الظفر اور فرید ضیائی نے مرتب کیا۔ رسم اجرا انجام دی۔ انھوں نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ نصرت اگرچہ کہ بڑے شاعر نہیں تھے لیکن ان میں مخدوم کی خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ حسین علی خان (المعروف چندرسری واستو) ممتاز صحافی حال مقیم امریکہ، نے اپنی تقریر میں کہا کہ آندھراپردیش کے قیام کے بعد پہلی اردو تحریک کا نصرت ایک متحرک قائد تھا جس نے اردو زبان کے فروغ و ترویج میں اہم رول ادا کیا۔ جمیلہ نشاط چیئرمین شاہین ویمن ویلفیر ایسوسی ایشن نے اپنی تقریر میں کہا کہ نصرت اردو کو سیکولر زبان بنانے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ اس کے علاوہ عمائدین شہر نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ آخر میں ظفر محی الدین نے شکریہ ادا کیا۔ اس جلسے کی نظامت ریشماں تبسم نے انجام دی۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 16 اپریل 2014

جامعہ اردو علی گڑھ کے جلسے میں عدلیہ کے فیصلے کا خیر مقدم

علی گڑھ: جامعہ اردو علی گڑھ سے 1997 کے تحت معلم اردو کی سند حاصل کرنے والے بے روزگاروں کو ہائی کورٹ کے ذریعے جائز تسلیم کرتے ہوئے انھیں کاؤنسلنگ میں شامل ہونے کے لیے درخواست کیے جانے کا جامعہ اردو علی گڑھ نے خیرمقدم کیا ہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ میں منعقدہ ایک اہم میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے جامعہ اردو کے او ایس ڈی فرحت علی خاں نے کہا کہ صرف جامعہ اردو علی گڑھ ہی نہیں بلکہ تمام اردو طبقہ ہائی کورٹ کا شکرگزار ہے جس نے جامعہ اردو علی گڑھ کی معلم اردو کی سند کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب مرکزی اور ریاستی حکومتوں کا فریضہ ہے کہ وہ بھی جامعہ اردو علی گڑھ کی اسناد کو اعلیٰ تعلیم اور ملازمتوں میں مساوی درجہ عطا کریں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے رجسٹرار شمعون رضا نے ہائی کورٹ کے مذکورہ فیصلے کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ اپنے تاریخ ساز فیصلے میں جسٹس وکرم ناتھ نے اردو والوں کو ان کا جائز حق دیا ہے اور اب توقع ہے کہ اردو کے اس عظیم ادارے جامعہ اردو علی گڑھ کو سرکاری سطح پر استحکام حاصل ہونے کی راہیں واہوں گی۔ کنٹرولر امتحانات رضوان علی خاں نے کہا کہ ملک کی عدالتیں روز اول سے ہی جامعہ اردو علی گڑھ کی اسناد کی حمایت کرتی رہی ہیں۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، یکم مئی 2014

جامعہ اردو علی گڑھ کا 75 واں یوم تاسیس

علی گڑھ: جامعہ اردو علی گڑھ نے ملک اور اردو زبان کی جو خدمت انجام دی ہے اس کی مثال علمی دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ اردو علی گڑھ کی مشاورتی کونسل کے چیئرمین پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کیا۔ وہ جامعہ اردو علی گڑھ کیمپس میں جامعہ اردو علی گڑھ کی 75 ویں یوم تصیب تقریب سے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ 1939 سے مسلسل سماج کے محروم طبقات کو اردو میڈیم سے تعلیم کی سہولیات مہیا کرارہی ہے۔ جس سے سماج کے محروم اور پسماندہ طبقات ملک کے قومی دھارے سے جڑرہے ہیں۔ اپنے صدارتی خطبے میں جامعہ اردو علی گڑھ کے او ایس ڈی مسٹر فرحت علی خاں نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ کے 75 سالہ علمی سفر میں متعدد سیاسی رہنما، کئی سابق وزرائے اعظم، سابق صدر جمہوریۂ ہند،

متعدد وزرا اور کئی صوبوں کے وزرائے اعلیٰ جامعہ اردو علی گڑھ سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے مگر افسوس کہ پھر بھی آج تک جامعہ اردو علی گڑھ اپنے استحکام سے محروم ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 17 اپریل 2014

اردو زبان میں ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالبہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جے این میڈیکل کالج میں نفسیاتی امراض کے ممتاز ماہر پروفیسر سہیل احمد اعظمی کی رہائش گاہ پر ایک اہم میٹنگ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت ایس ایس یادو نے کی۔ مرکزی وزارت برائے ریلوے کی جانب سے نامزد کردہ ناردرن سینٹرل ریلوے کی زونل ریلوے مشاورتی کمیٹی کے رکن پروفیسر سہیل احمد اعظمی نے کہا کہ اردو سے پیار کرنے والوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ریلوے سے متعلق تمام معلومات اور ریلوے ٹائم ٹیبل اردو زبان میں بھی شائع ہو اور اردو اخبارات میں بھی ریلوں کے ٹائم ٹیبل کی اشاعت کو یقینی بنایا جائے تاکہ اردو بولنے اور پڑھنے والے افراد ریلوے ٹائم ٹیبل اور ریلوے سے متعلق دیگر اہم معلومات سے مستفیض ہوسکیں۔ میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے ایس ایس یادو نے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو سارے ملک میں بولی جاتی ہے اور یہ زبان فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں بھی اہم رول ادا کرتی رہی ہے۔ عبدالرزاق ناچیز نے کہا کہ اردو زبان نے ملک کی تہذیب و ثقافت کو ہم آہنگی کی ڈور میں پرونے کا کام کیا ہے اس لیے اس زبان کے فروغ کے لیے ہر سطح پر کام ہونا چاہیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اپریل 2014

سرسید کو بھارت رتن دلوانے کی مہم

علی گڑھ: سرسید احمد خاں ایک عام انسان نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے اور برصغیر ایشیا میں جدید تعلیم کی ترویج واشاعت اور ہندو مسلم اتحاد کے میدان میں سرسید

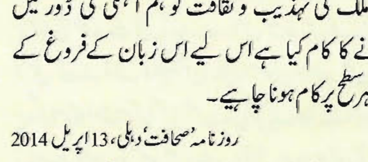

احمد خاں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز فلم ساز اور سماجی کارکن مسٹر مہیش بھٹ نے کیا۔ وہ ماہنامہ دا علی گڑھ موومینٹ اور

انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے اہم اجلاس کا منظر

ملت بیداری مہم کمیٹی (ایم بی ایم سی) کے زیر اہتمام سرسید پبلی کیشنز اینڈ اکیڈمک کنسلٹینسی اور علیشا پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹیڈ کے تعاون سے سرسید احمد خاں کو بھارت رتن سے سرفراز کیے جانے کے تعلق سے وزیر اعظم ہند کے نام جاری ایک اپیل پر دستخطی مہم کا افتتاح کر رہے تھے۔ اس مہم کے تحت اپیل پر پہلا دستخط مہیش بھٹ نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ علیگ برادری دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور ہندوستان کی حکومت کو چاہیے تھا کہ سرسید جیسی عظیم شخصیت کو کافی پہلے بھارت رتن سے سرفراز کیا جاتا۔ انھوں نے کہا کہ سرسید عظیم محبّ الوطن تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ہندو اور مسلم ہندوستان کی دو خوبصورت آنکھیں ہیں۔ وہ ملک کی روایتی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ ماہنامہ دا علی گڑھ موومینٹ کے مدیر اعلیٰ جسیم محمد نے کہا کہ ہماری اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے عظیم محسن سرسید احمد خاں کو محض یومِ سرسید پر ہی یاد کرتے ہیں جو ان کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں سرسید کی تعلیمات کو اپنی زندگی کا لازمی جز بنانا ہوگا اور ان کے مشن کو فروغ دینا ہی ان کو سچا خراجِ عقیدت ہے۔ جسیم محمد نے اعلان کیا کہ سرسید کے دوسوویں یومِ ولادت سے قبل 16 ر اکتوبر 2017 تک ایک کروڑ افراد کے دستخط کراکر وزیرِ اعظم تک پہنچائے جائیں گے۔ انھوں نے مزید اعلان کیا کہ 16 اکتوبر 2017 کو سرسید احمد خاں کے دوسوویں یومِ پیدائش کی تقریب دہلی کے تال کٹورا اسٹیڈیم میں منعقد کی جائے گی۔ ایم بی ایم سی کے قومی صدر پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ سرسید کی تعلیمی پالیسی ہر طبقہ کے لیے تھی۔ انھوں نے ریاستی و مرکزی حکومتوں سے اپیل کی کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں سرسید احمد خاں کو شامل کیا جائے تاکہ نئی نسل کو سرسید کی تعلیمی اور سماجی پالیسی سے روشناس کرایا جاسکے۔

پریس ریلیز جسیم محمد، علی گڑھ، 5 مئی 2014

اے ایم یو میں اردو چیک قبول

علی گڑھ: اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لیے مرکزی اور صوبائی سطح پر وعدے اور دعوے تو بہت کیے جاتے ہیں مگر اس کو عملی جامہ پہنانے میں اٹھنے والے قدم کسی نہ کسی سبب تھم جاتے ہیں لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں واقع اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی شاخ نے ایک قدم بڑھایا ہے جس کی چوطرفہ ستائش کی جارہی ہے، مسلم یونیورسٹی کیمپس میں واقع اسٹیٹ بینک میں اردو زبان میں لکھے ہوئے چیک قبول کیے جارہے ہیں جو ایک خوش آئند پہلو ہے، منیجر اسٹیٹ بینک آف انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شاخ کی مرضی سے شروع کی گئی اس پہل کا علیگ برادری نے استقبال کیا ہے۔ اسٹیٹ بینک کے منیجر پریتم کمار نے بتایا کہ گزشتہ کچھ دنوں سے یونیورسٹی اساتذہ اور ملازمین کی جانب سے مطالبہ کیا جارہا تھا کہ اردو میں لکھے ہوئے چیک تسلیم کیے جائیں، ہم نے لوگوں کا خیال رکھتے ہوئے اردو زبان میں لکھے ہوئے چیک لینے کا ڈسپلے لگایا ہے، انھوں نے بتایا کہ بینک افسران یا حکومت کی جانب سے ایسا کوئی طے شدہ قانون نہیں ہے کہ اردو میں چیک لیے جائیں یہ صرف ہم نے اپنی بینک میں کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بینک کا اصل کام عوام کو بہتر سہولیات دینے کا ہوتا ہے اور اس کوشش سے ہمیں اچھے کسٹومر بھی ملیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 مئی 2014

انجمن ترقی اردو اتر پردیش کا اہم اجلاس

لکھنؤ: انجمن ترقی اردو اتر پردیش کا اہم اجلاس صدر انجمن ترقی اردو اتر پردیش، جناب چودھری شرف الدین کی صدارت میں نعمت اللہ بلڈنگ امین آباد میں منعقد ہوا جس میں مہمان اعزازی کی حیثیت سے ممتاز دانشور پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں لکھنؤ کے علاوہ اتر پردیش کے مختلف اضلاع، رامپور، مرادآباد، امروہہ، بستی، بارہ بنکی، بہرائچ، فیض آباد، اناؤ، کانپور، ہردوئی، رائے بریلی لکھیم پور کھیری وغیرہ سے بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ اجلاس میں ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، حیدر علی، عبدالقدوس قادری، رضوان احمد فاروقی،

ڈاکٹر نسیم اعظمی کی کتاب 'تعلیمی نکات' پر مذاکرے کا منظر

مولانا محمد حاطب صاحب، آل احمد خاں سرور، عبدالرشید انصاری ایڈوکیٹ، رحمت لکھنوی، ڈاکٹر وینا گپتا، شوق امروہی، حسین امین صاحب، قمر الحسن خان، ڈاکٹر انور علی خاں وغیرہ نے اردو سے متعلق روشنی ڈالی، تمام مقررین کی تقریروں کا لب لباب یہ ہے کہ اردو کے سلسلے میں حکومت کے وعدوں پر بالکل یقین نہیں کیا جائے بلکہ خود اپنے طور سے اردو کے لیے جو کر سکتے ہیں وہ کریں اور اپنے بچوں کو لازمی طور سے اردو پڑھائیں۔ اجلاس کی نظامت کے فرائض انجمن کے صوبائی جنرل سکریٹری محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ نے انجام دیے۔ آخر میں جناب چودھری شرف الدین صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اردو اب ایک عالمی زبان بن چکی ہے۔

پریس ریلیز، محمودالظفر رحمانی ایڈوکیٹ، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو اترپردیش، 14 مارچ 2014

اردو کلب کا فروغ اردو پروگرام

ھاپوڑ: اردو ہماری تہذیب کی ضمانت ہے ہم اردو کا زوال دیکھ رہے ہیں اس کے ذمے دار ہم خود ہیں کیونکہ اردو کو ہم نے بھلا دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار فخر الدین میموریل کمیٹی کے چیئرمین خالد مسعود نے اردو کلب کے زیر اہتمام فروغ اردو پروگرام میں بطور مہمان خصوصی کیا۔ خالد مسعود نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے ہمیں کوشاں رہنا چاہیے اور صوبائی سرکار اردو کی بقا کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے اور اردو کے فروغ کے لیے سرکار ہر سطح پر مدد کرے گی۔ پروگرام کے کنوینر ایس اکرام نے بتایا کہ شہر میں اردو کو فروغ دینے کے لیے جگہ جگہ پچ بنا کر اردو کی تعلیم دی جا رہی ہے ساتھ ہی پروگرام میں اردو آرٹ کی بھی نمائش لگائی گئی جس میں سامعین نے طالبات کے کاموں کو سراہا۔ پروگرام کی صدارت حاجی امین انصاری نے اور نظامت قاری حسنین دلکش نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اپریل 2014

ایم نسیم اعظمی کی کتاب 'تعلیمی نکات' پر مذاکرہ

جون پور: 'تعلیمی نکات' اردو میں اپنی نوعیت کی عجیب و غریب کتاب ہے جو عہد حاضر کے تقریباً تمام کورسوں کی تعلیم و تربیت اور ہائی اسکول کے بعد اور ینٹل تعلیم سے لے کر سائنس، ٹکنالوجی، پروفیشنل اور دیگر تعلیم و تربیت، کمپٹیشنوں، کونسلنگ، تعلیمی رہنمائی اور کیریر پلاننگ وغیرہ کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار (24 اپریل 2014) کو 'تعلیمی نکات' پر مذاکرہ کی صدارت کرتے ہوئے اردو کے معروف ادیب و شاعر معلّم اور دانشور طفیل انصاری نے کیا۔ درسگاہِ اسلامی کے سربراہ مولانا عبداللہ فاروق نے کہا کہ دوسری زبانوں میں ایسی کتابیں تو مل جاتی ہیں لیکن اردو میں اس کی بڑی کمی تھی جسے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے 'تعلیمی نکات' سمیت ایسی چھ ضخیم کتابیں تصنیف کر کے اکیلے پوری کر دی ہیں۔ ڈاکٹر سعید اختر نے کتاب کے مشمولات پر روشنی ڈالتے ہوئے 'اردو تعلیم کے منظر نامہ' ایک ایسا آئینہ قرار دیا جس میں ملک گیر پیمانہ پر اردو تعلیم کی صحیح صورت حال سامنے آ گئی ہے۔ پروفیسر پی سی وشوکرما، پریم جونپوری، اجے کمار اور حسان اعظمی نے بھی 'تعلیمی نکات' کو ایک قابل قدر اور طلبا اور نوجوانوں کے لیے انتہائی مفید کتاب بتائی۔

پریس ریلیز، محمد عرفان جون پوری، 27 اپریل 2014

ہریانہ میں اردو کی حالت اتر پردیش سے بہتر

سہارنپور: ہریانہ اور یوپی میں اردو کے فروغ پر ہریانہ اردو اکادمی کے اشتراک سے اردو تعلیمی بورڈ لکھنؤ اور عثمانی شکشا سمیتی کے زیر اہتمام مسلم گرلس انٹر کالج میں سیمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت حاجی فضل الرحمٰن علیگ نے کی۔ اس موقعے پر ذوالقدر خمار کے شعری مجموعہ شاخ گل کا بھی اجرا عمل میں آیا۔ ہریانہ اردو اکادمی کے ڈائریکٹر دیس راج سیرہ نے بحیثیت مہمان خصوصی اظہار خیال کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ یوپی کے مقابلے ہریانہ میں اردو کی حالت بہتر ہے اور ہریانہ سرکار کی سرپرستی سے ہریانہ میں اردو کی ترقی کے امکانات روشن ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مشاعروں اور سیمیناروں کے علاوہ اردو ورکشاپ کے ذریعہ اردو کو ہریانہ کے تمام حصوں میں پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہریانہ اردو اکادمی کی کوشش سے میوات کے علاقے میں پہلی جماعت سے اردو کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ڈی ایڈ کلاس میں اردو کو ایک لازمی مضمون کا درجہ دیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کے طلبا کے لیے جے بی ٹی اردو اساتذہ اور اردو لیکچرر کی تقرری ایک اہم قدم ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہریانہ سرکاری نے اردو کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی سے واقف طلبا کو سرکاری محکموں میں ملازمت کے مواقع دیے ہیں۔ پروفیسر مشرف خطیب نے کہا کہ اردو قارئین کی یوپی میں تعداد بڑھی ہے لیکن معیار کم ہوا ہے۔ شین زبیری، ڈاکٹر جمیل رامپوری، حاجی فضل الرحمٰن علیگ اور صابر علی خاں بھی اظہارِ خیال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اپریل 2014

جموں کشمیر:

جموں وکشمیر میں علامہ اقبال اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا مطالبہ

راجوری: شاعر مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نام سے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی مانگ کرتے ہوئے تحریک بقائے اردو نے علامہ کے 76 ویں یوم وصال کے موقعے پر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں اے ٹو زیڈ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن ہائی اسکول دھنور میں ایک پروگرام کا اہتمام کیا گیا جس میں تحریک بقائے اردو نے ریاست جموں وکشمیر میں علامہ اقبال اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ سرپرست فاروق شاہ بخاری، صدر عرفان علی عارف اور پیر پنجال خطہ کے سربراہ خورشید تانترے نے عظیم شاعر کو تحریک بقائے اردو کی طرف سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے تحریک کے جنرل سکریٹری ذاکر ملک بھلیسی نے بتایا کہ ریاست جموں کشمیر کی سرکاری زبان اردو ہے۔ حیرت ہے کہ اس ریاست میں اردو کا کوئی بھی بڑا ادارہ نہیں کھولا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ علامہ اقبال کشمیری نسل کے ہیں اور یہ علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ ہوتا اگر سرکار ان کے نام پر اس ریاست میں اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں لائے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 24 اپریل 2014

مرکز ادب وسائنس کا پندرہواں جلسہ تقسیم اسناد کا منظر

جھار کھنڈ:

مرکز ادب وسائنس کا پندرہواں جلسہ تقسیم اسناد

رانچی: وائی ایم سی اے آڈیٹوریم رانچی میں 20 اپریل 2014 کو مرکز ادب وسائنس کیا پندرہواں کنوکیشن منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر محمد رضی الدین پرووائس چانسلر، رانچی یونیورسٹی نے کی۔ افتتاحی کلمات میں پروفیسر احمد سجاد نے سب سے پہلے معزز مہمانوں کا استقبال کیا اور عصر حاضر کے خاموش تعلیمی انقلاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ٹرسٹ کے اب تک کی تعلیمی نیز علمی وادبی خدمات کی طرف اشارے کرتے ہوئے بتایا کہ مختلف علمی وادبی موضوعات پر ٹرسٹ نے اب تک چھ کتابیں شائع کی ہیں۔ حالیہ دو کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کے نام ہیں 'کیا برصغیر کی اردو آبادی عذاب مسلسل کا شکار ہے؟' اور 'اکیسویں صدی کا چیلنج اور ملی تعلیمی ایجنڈا' موصوف نے ٹرسٹ میں چلنے والے پچاسوں کورس کے حوالے کے ساتھ اس سال سے ڈیپ (DEEEP) کے نئے کورس اور سوپر 30 اور رحمانی 30 کے طرز پر 'الامین مرکز 30' کو رانچی میں آئندہ ماہ سے شروع کرنے کا مژدہ سنایا۔ سکریٹری انجینئر طارق سجاد نے سکریٹری رپورٹ میں کہا کہ جھارکھنڈ کے دس بارہ اضلاع میں اس ٹرسٹ کی شاخیں کام کرنے لگ گئی ہیں۔ ٹرسٹ کے دس یونٹوں میں 6150 نیز بی سی سی ٹریننگ میں 1999 طلبا زیر تعلیم و تربیت ہیں۔ اسی طرح آن لائن بی سی سی پروگرام میں 3222 طلبا کا تذکرہ کیا۔ صدر جلسہ جناب رضی الدین نے کہا کہ بانی ٹرسٹ احمد سجاد صاحب نے غریب طبقوں کی تعلیمی بازیافت اور آپسی تفریق وفرقہ وارانہ غیر ہم آہنگی کو ملک وملت سے ختم کرنے کی جو لڑائی لڑ رہے ہیں اس کے لیے قابل ستائش ہیں۔ ٹرسٹ کی چیرپرسن ڈاکٹر رفعت آرا کے اظہار تشکر کے بعد مرکز کے ترانہ پر جلسے کا اختتام ہوا۔ دوران جلسہ ٹرسٹ کی ایک ڈوکیومینٹری فلم بھی دکھائی گئی۔

پریس ریلیز، ارشاد، 28 اپریل 2014

راجستھان:

عادل رضا منصوری کا واحد شاعر پروگرام

جودھپور: ''عادل نے شاعری میں اپنے وقت کے اظہار کے ساتھ اساطیر کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے یہاں عشق حقیقی میں عشقِ مجازی مدغم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور نقاد شین کاف نظام نے سروکار اور بزمِ اردو، جودھپور کے زیر اہتمام جے پور کے نوجوان شاعر اور استفسار کے مدیر عادل رضا منصوری کے واحد شاعر پروگرام میں بطور مہمان خصوصی کیا۔ انھوں نے کہا کہ عادل نے اپنے آس پاس کی روایت کو توڑا ہے اور

اشاروں کو غزل میں اہمیت دی ہے اس لیے ان کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ پروگرام کے صدر راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیرمین اے ڈی راہی نے کہا کہ عادل نے اپنے اشعار سے متاثر کیا ہے۔ پروگرام کے آغاز میں برجیش عنبر نے استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے تنظیم کی جانب سے منعقدہ پروگراموں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر نثار راہی نے 'قدیم قامت پر نیا چہرہ اگانے کا ڈھن' عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ عادل کی غزلوں سے گزرتے ہوئے ہر جا جہانِ دیگر نہ سہی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک ایسی دنیا کا دیدار ہوتا ہے جس میں نئے پیکر، تشبیہات، استعاروں کے علاوہ محاورے کا نیا انداز جلوہ گر ہے۔ آخر میں محمد افضل جودھپوری نے شکریہ ادا کیا۔ پروگرام میں ہندی، اردو اور راجستھانی زبانوں کے ادیب اور معزز افراد موجود تھے۔ نظامت کے فرائض اشراق الاسلام ماہر نے انجام دیے۔

بذریعہ ڈاک: ڈاکٹر نثار راہی، سکریٹری بزم اردو، جودھپور، راجستھان، 27 اپریل 2014

مہاراشٹر:

علامہ اقبال کا یوم وفات

ممبئی: اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال کے یوم وفات کے موقعے پر ایک پروگرام کا انعقاد انجمن ترقی اردو (ہند) ممبئی شاخ کی جانب سے احمد زکریا ہال میں کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت انجمن کے صدر پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی اور اردو کے معروف ادیب پروفیسر

یونس اگاسکر، ممتاز شاعر عبدالاحد ساز اور پروفیسر مستنصر دلوی نے اقبال کی شاعری اور شخصیت کے متعلق اظہار خیال کیا۔ پروفیسر دلوی نے مختصر مگر جامع صدارتی تقریر میں کہا کہ اقبال کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کے تناظر میں کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پروگرام میں پروفیسر یونس اگاسکر نے اقبال کی شاعری اور ان کے افکار و خیالات کے متعلق قدرے طویل مقالہ پیش کیا۔ اردو کے معروف شاعر عبدالاحد ساز نے ایک خوبصورت نظم کے ذریعہ علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر اقبال کی مشہور زمانہ نظم شکوہ اور جواب شکوہ کا انگریزی ترجمہ پروفیسر مستنصر دلوی نے پیش کیا اور کہا کہ اقبال کی فکر میں انسانیت نوازی کا جو پیغام ہے اسے سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔

پریس ریلیز، عباس مجاہد، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی ہند، ممبئی، 3 مئی 2014

انجمن اسلام کے طلبا کا کارنامہ

ممبئی: عروس البلاد ممبئی کے مسلم طلبا نے پورے ملک کا نام دنیا میں روشن کیا اور انھوں نے امریکہ میں عالمی سطح پر منعقد ہوائی جہاز کا ڈیزائن تیار کرنے کے مقابلے میں ایک نئے لڑاکو ہوائی جہاز کی ڈیزائن سازی کرکے پوری دنیا میں اول مقام حاصل کیا۔ ریاست میں اقلیتوں کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے انجمن اسلام کی جانب سے

بیاول میں مفت موبائیل ریپئرنگ اور الیکٹریشین تربیتی کورس کا منظر

چلائے جانے والے محمد حاجی صابو صدیق کالج آف انجینئرنگ کے طلبا نے امریکہ کے ٹکساس شہر میں منعقدہ مقابلے میں شرکت کی جس میں ملک کے 25 نامور کالج کے طلبا جس میں آئی آئی ٹی کانپور، ویلور انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے علاوہ پوری دنیا میں واقع انجینئرنگ کالج کے طلبا نے شرکت کی تھی۔ گزشتہ ماہ منعقدہ اس مقابلے کا انعقاد لوکٹ مارٹنگ نامی ادارے کی جانب سے کیا گیا تھا جو ہوائی جہازوں کے ڈیزائن کو منظوری دیتا ہے۔ انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے بتایا کہ یہ نہ صرف پوری قوم کے لیے فخر کا مقام ہے بلکہ اس مقابلے میں ہمارے کالج کے طلبا کی فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے سے پورے ملک کا سر عالمی سطح پر اونچا ہوا ہے اور ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستانیوں اور مسلم طلبا میں صلاحیت کا فقدان نہیں ہے۔ اس موقعے پر انجمن اسلام کے نائب صدر عباس ہٹاوکر، چیئرمین بورڈ آف ووکیشنل ٹریننگ رفیق نائک اور پرنسپل محی الدین احمد نے طلبا کو اس موقعے پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کے شاندار مستقبل کے لیے خصوصی طور پر دعائیں بھی کیں۔ لڑاکو ہوائی جہاز کا ڈیزائن تیار کرنے والی ٹیم نے فیکلٹی ممبر ڈاکٹر سنجے کمار کی سربراہی میں یہ ڈیزائن بنایا تھا جس کے کپتان آدتیہ اجیان تھے جب کہ دیگر اراکین میں عمران مرچنٹ، عبدالقادر پوناوالا، حسین شیخ، مزمل سرکھوت، درپن اگروال، افسان گجراتی اور سارنگ بدر شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 مئی 2014

بیاول میں مفت موبائیل ریپئرنگ اور الیکٹریشین تربیتی کورس

جلگاؤں: اردو سوشل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر اکادمی (اردو سیوا) کی جانب سے اور ڈسٹرکٹ اسپورٹس آفس جلگاؤں کے تعاون سے نوجوانوں کے خود روزگار اسکیم کے تحت مورخہ 17 مارچ تا 31 مارچ 2014 طلبہ و نوجوانوں کے لیے مفت موبائیل ریپئرنگ اور الیکٹریشین کا پندرہ روزہ تربیتی کیمپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس تربیتی کیمپ تقریب کی صدارت ایم رفیق اور حاجی انصار احمد (بھساول) نے کی جبکہ موبائیل ریپئرنگ کورس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین اردو جونیئر کالج کے سابق پرنسپل عبدالرؤف شیخ کے ہاتھوں اور الیکٹریشین کورس کا افتتاح ڈاکٹر محمد وسیم شیخ کے ہاتھوں کیا گیا۔ غلام غوث خان، اختر حسین انجینئر، زیڈ۔ اے خان، گریش چودھری، شکیل احمد، محمد رفیق، ظہیر خان اور رئیس فیض پوری بہ حیثیت مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر ادارہ ہٰذا کے صدر اور ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج کے پرنسپل نے تقریب کے اغراض و مقاصد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو سیوا۔ گزشتہ کئی سالوں سے اپنی تعلیمی، سماجی و ادبی خدمات کے پیش نظر عوام الناس میں ایک معروف و مقبول ادارہ ہے۔ جو طلبہ کی گاہے بہ گاہے رہنمائی بھی کرتا ہے اس تربیتی کورس کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کی مختلف اسکیموں کو بروئے کار لاکر سماج کے بے روزگار نوجوانوں کو خود روزگار کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ جناب ایم رفیق نے اپنے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے ادارہ ھذا کی تعلیمی، سماجی و ادبی سرگرمیوں کی تعریف کرتے ہوئے اپنے مکمل تعاون کا وعدہ کیا۔

پریس ریلیز، رحیم رضا، مہاراشٹر، 15 اپریل 2014

اعزاز و اکرام:

گلزار کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ

نئی دھلی: مشہور شاعر، ہندوستانی فلم ساز اور نغمہ نگار گلزار کو باوقار فلمی اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ یہ اطلاع یہاں جاری ایک سرکاری ریلیز میں دی گئی ہے

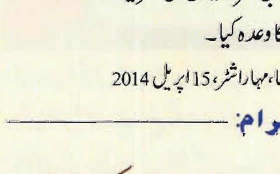

جس میں کہا گیا ہے کہ یہ ایوارڈ ان کو ہندوستانی فلم کو ترقی اور وسعت دینے میں اہم خدمات کے عوض دیا جارہا ہے۔ حکومت یہ ایوارڈ ہر سال اس میدان میں اہم کام کرنے والے افراد کو دیتی ہے۔ مسٹر گلزار یہ ایوارڈ حاصل کرنے والے 45ویں فلمی شخصیت ہیں۔ اس انعام کے تحت ایک سونے کا کنول، دس لاکھ روپے کا نقد انعام اور ایک شال دیا جاتا ہے۔ صدر پرنب مکھرجی یہاں وگیان بھون میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں مسٹر گلزار کو یہ انعام دیں گے۔ گلزار کا اصل نام سمپورن سنگھ کالرا ہے۔ ان کی پیدائش 18 اگست 1936 کو غیر منقسم پنجاب کے دینا ضلع جھیلم (جو اب پاکستان میں ہے) میں ہوئی تھی۔ گلزار اپنے والد کی دوسری بیوی کی اکلوتی اولاد ہیں۔ فلمی صنعت میں انھوں نے بمل رائے، رشی کیش مکھرجی اور ہیمنت کمار کے معاون کے طور پر کام شروع کیا۔ بمل رائے کی فلم بدنی کے لیے گلزار نے اپنا پہلا نغمہ لکھا۔ ان کی شادی راکھی سے ہوئی تھی۔ ان کی ایک بیٹی میگھنا گلزار ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں لیکن اپنی فلمی زندگی میں فلم میں مکالمے، ہدایت کاری، فلم سازی اور فلموں کے لیے نغمے بھی لکھے۔ ان کی تخلیقات ہندی، اردو اور پنجابی میں ہیں لیکن انھوں نے برج بھاشا، کھڑی بولی، مارواڑی اور ہریانوی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اپریل 2014

شریف حسین قاسمی کو قطر کا عالمی اردو ادب ایوارڈ

نئی دھلی: 18 واں 'مجلسِ فروغ اردو ادب ایوارڈ، دوحہ قطر' جیوری کی میٹنگ نئی دہلی میں منعقد ہوئی جس میں اردو فارسی کے ممتاز ادیب و محقق پروفیسر شریف حسین قاسمی کو یہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ پر

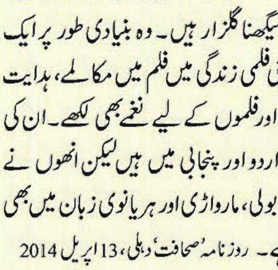

مشتمل ہے۔ جیوری کے چیئرمین پدم بھوشن و ستارۂ امتیاز پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایوارڈ پروفیسر قاسمی کی ادب و تحقیق کے شعبے میں مجموعی خدمات کے لیے دیا جارہا ہے۔ پینل آف جج کا اجلاس پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں منعقد ہوا۔ اراکین جیوری میں پروفیسر شافع قدوائی اور پروفیسر ابن کنول شامل تھے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ پروفیسر شریف حسین قاسمی اردو اور فارسی کے صف اوّل کے ان ادیبوں اور محققین میں ہیں جن کو پایۂ اعتبار و افتخار حاصل ہے۔ وہ گزشتہ 40 برس تک دانش گاہ دہلی میں

درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ہر چند کہ وہ فارسی کے پروفیسر تھے لیکن ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور تحقیقات کا فیضان اردو زبان و ادب کو پہنچا ہے۔ وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان اور ایران کے جید علما میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر 150 سے زائد تحقیقی مقالات بھی لکھے ہیں۔ ان کے اس نوعیت کے کاموں سے اردو علمیات کے ذخیرے میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اردو کے ایسے بے لوث خدمت گزار کی خدمات کا اعتراف کرنا مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کے لیے باعث فخر و انبساط ہے۔ یہ ایوارڈ دوحہ قطر میں ایک پروقار ادبی تقریب میں دیا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 مارچ 2014

پروفیسر ابن کنول شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر مقرر

نئی دہلی: پروفیسر ابن کنول (ناصر محمود کمال) کو دوسری بار شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کا صدر کا مقرر کیا گیا ہے۔ پروفیسر ابن کنول اس سے پہلے 2005 اور 2008 کے درمیان شعبۂ اردو کے صدر رہ چکے ہیں۔ پچھلے 9 اپریل کو ہی شعبہ کے سابق صدر پروفیسر توقیر احمد خان کی مدت

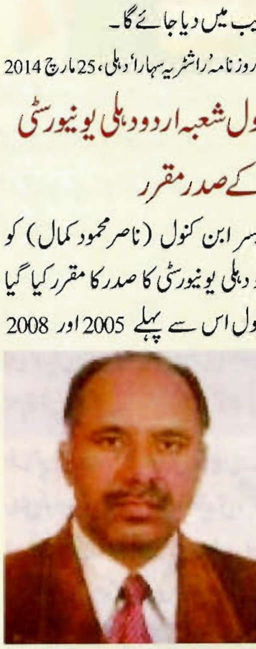

صدارت ختم ہوگئی تھی لیکن یونیورسٹی انتظامیہ کی دوسرے محاذ پر شدید مصروفیت کے باعث یہ کام نہیں ہوسکا تھا۔ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر دنیش سنگھ کی طرف سے باضابطہ انھیں صدر شعبہ مقرر کیا گیا۔ داستان ان کا خصوصی موضوع ہے۔ 'ہندوستانی تہذیب بوستانِ خیال کے تناظر میں'، 'داستان سے ناول تک'، 'تنقید و تحسین'، 'اردو افسانہ اور افسانوی مجموعے 'تیسری دنیا کے لوگ'، 'بند راستے' اور 'خانہ بدوش' ان کی اہم کتابیں ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے علاوہ امریکہ، ماریشس، انگلینڈ، پاکستان اور روس کے عالمی سیمیناروں میں اردو کی نمائندگی کی ہے۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کئی اہم علمی و ادبی اعزازات سے نوازا گیا جن میں دہلی، یوپی، بہار اور ہریانہ اردو اکادمیوں کے علاوہ سر سید ملینیم ایوارڈ، دہلی برائے اردو فکشن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اپریل 2014

پروفیسر آزرمی دخت کو میکش ایوارڈ دیے جانے کی تقریب

پروفیسر آزرمی دخت کو میکش ایوارڈ

آگرہ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارسی ریسرچ کے بانی ڈائرکٹر اور صوفی شاعرہ پروفیسر آزرمی دخت کو 2013 کے لیے میکش ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مقامی ہوٹل گرانٹس میں منعقد سادہ سی تقریب میں پروفیسر آزرمی دخت صفوی کو تنظیم کے نائب صدر سید معراج الدین نے شال اوڑھا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ تنظیم کے سرپرست سید اجمل علی شاہ نیازی نے میکش ایوارڈ سے پروفیسر آزرمی دخت صفوی کو نوازا۔ مہمان خصوصی پروفیسر محمد مزمل حسن وائس چانسلر ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی نے صفوی کو شیلڈ پیش کی، سید فیض علی شاہ نے سپاس نامہ پیش کیا۔ تنظیم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر نسرین بیگم نے پروفیسر صاحبہ کو چاندی کا میڈل پہنایا۔ میکش ایوارڈ یافتہ پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میکش ایوارڈ بڑے بڑے سیکولر افراد کو دیا جاچکا ہے جیسے پروفیسر شہریار، گوپی چند نارنگ وغیرہ۔ ہمارے لیے باعث افتخار اور خوشی کا موقع ہے کہ بزم نے مجھے میکش ایوارڈ سے نوازنے کا فیصلہ کیا۔ موصوفہ نے کہا کہ ہندوستان کی تاریخ و تمدن اور تہذیب میں آگرہ کا انتہائی اہم مقام ہے۔ اس کا ذکر مہابھارت میں آگریوانام سے کیا گیا ہے یعنی جنگل کی سرحد، آگرہ نہ صرف شعر و ادب بلکہ صوفیوں کا مرکز رہا ہے۔ شیخ سلیم چشتی، خواجہ ہاشم اہراری، شیخ محمد غوث وغیرہ اور میکش اکبرآبادی صاحب جن کے نام سے آج یہ جلسہ منعقد ہوا ہے۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر نسرین بیگم نے کہا کہ آج کے وقت میں اردو زبان کے چاہنے والوں کی کمی نہیں ہے، کمی شاید ہم لوگوں میں ہے جو ہم ان تک نہیں پہنچا پا رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اپریل 2014

پروفیسر ستار ساحر کو 'کارنامۂ حیات ایوارڈ'

کڈپہ: انجمن ترقی اردو کڈپہ شاخ کے زیر اہتمام پروفیسر ستار ساحر صدر شعبۂ اردو وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی کا اعزازی جلسہ منعقد کیا گیا۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر مظفر شہ میری حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی صدر شعبۂ اردو نے کہا کہ پروفیسر ستار ساحر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں

مدراس یونیورسٹی نے کارنامۂ حیات ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جلسے کی صدارت انجمن ترقی اردو کڈپہ شاخ کے صدر سید شاہ مصطفیٰ حسین بخاری نے کہا کہ پروفیسر ستار ساحر مخلص اردو دوست ہیں۔ یہ ایوارڈ آپ کو ملنا مسرت کی بات ہے اور مستحق بھی ہیں۔ انجمن کے نائب صدر ستار فیضی شریک معتمد سید شکیل احمد نے پروفیسر ستار ساحر کی شال پوشی گل پوشی کی تحفہ بھی پیش کیا گیا۔

بذریعہ ڈاک: ستار فیضی، نائب صدر انجمن ترقی اردو کڈپہ شاخ (آندھراپردیش)، 18 مارچ 2014

سول سروسز میں کامیاب پہلی مسلم خاتون کو پدم شری ایوارڈ

نئی دہلی: سیول سرویس کلاس-1 میں داخلہ حاصل کرنے والی پہلی اور یونین پبلک سروس کمیشن کی رکن مقرر کی جانے والی پہلی آئی آر ایس مسلم خاتون کو پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروین طلحہ کے لیے یہ ایک قابل فخر لمحہ تھا لیکن اس طویل سفر کے دوران کئی مشکلات اور مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے سنٹرل نارکوٹکس ڈپارٹمنٹ میں بھی خدمات انجام دی ہیں۔ پروین طلحہ کو سول سروسز کے لیے نمایاں خدمات انجام دینے پر یہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔ 70 سالہ پروین طلحہ 1969 میں انڈین ریونیو سروس (کسٹمس اینڈ سنٹرل اکسائز) سے وابستہ ہوئیں جہاں انھوں نے 35 سال خدمات انجام دیں اور 2004 میں انھیں یونین پبلک سروس کمیشن (یو پی ایس سی) کا رکن

منور رانا کو کاویہ گورو اعزاز

دھرہ دون: گرافک ایرا ڈیمڈ یونیورسٹی دہرہ دون کے سالانہ اور عظیم الشان کوی سمیلن میں اتر پردیش اردو اکادمی کے صدر اور معروف شاعر منور رانا کو اتراکھنڈ کا قابل قدر ادبی اعزاز 'کاویہ گورو اعزاز 2014' اتراکھنڈ کے گورنر عزیز قریشی نے پیش کیا۔ اس موقعے پر اتراکھنڈ کے گورنر نے منور رانا کو توصیفی سند، شال اور ایک لاکھ روپے کی رقم کا چیک بطور

اتراکھنڈ کے گورنر عزیز قریشی معروف شاعر منور رانا کو گلدستہ دے کر استقبال کرتے ہوئے

اعزاز پیش کیا۔ گورنر نے کہا کہ منور رانا ہندی اور اردو داں حلقے میں یکساں طور پر مقبول عام ہیں۔ انھیں یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر کے طور پر آنا چاہیے اور بچوں کو اچھے عادات واطوار کی تعلیم دینی چاہیے۔ یونیورسٹی کے چیئرمین کمل گھنشیالا نے منور رانا کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اب تک یہ اعزاز ہندی زبان کے کویوں اور ادیبوں کو دیا گیا ہے۔ پہلی مرتبہ ادارے نے کسی اردو شاعر کو یہ اعزاز بخشا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منور رانا کی غزل، نظم اور نثر جتنی اردو حلقے میں پسند کی جاتی ہے اس سے کہیں زیادہ ہندی زبان کے لوگ پسند کرتے ہیں۔ ادارہ کو یہ اعزاز دے کر فخر محسوس کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل یہ پروقار اور قابل قدر اعزاز پانے والوں میں پدم شری گوپال داس نیرج، پدم شری اشوک چکر دھر، پدم شری سریندر شرما، معروف نغمہ نگار، سنتوش آنند اور ہری اوم پوار کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اپریل 2014

مقرر کیا گیا۔ 2002 میں بحیثیت ڈائرکٹر جنرل ٹریننگ تقرر پر انھوں نے ڈپارٹمنٹ آف کسٹمس اینڈ سنٹرل اکسائز میں تمام کیڈرس کے لیے موثر کام کیے اور اس محکمہ کی کارکردگی کو موثر بنایا۔ پروین طلحہ کو 2000 میں یو پی ایس سی کے لیے نمایاں خدمات پر یہ باوقار ایوارڈ عطا کیا گیا۔ وہ ایک بہترین مصنفہ بھی ہیں اور انھوں نے 'فدائے لکھنو' کتاب تحریر کی جو 22 چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ مظفر علی کی ہدایت میں تیار سیریل 'حسن جاناں' کے لیے انھوں نے مکالمے بھی تحریر کیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 28 اپریل 2014

ظہیر قاضی تیسری مرتبہ انجمن اسلام کے صدر منتخب

ممبئی: ممبئی اور مہاراشٹر ہی نہیں بلکہ ملک کے مسلمانوں کے مایہ ناز تعلیمی، ثقافتی اور سماجی ادارہ انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی تیسری مرتبہ اتفاق رائے سے ادارے کے صدر منتخب ہوئے ہیں بلکہ ان کی پوری ٹیم

اپنی بہترین کارکردگی کے سبب ایک بار پھر منتخب کر لی گئی ہے۔ واضح رہے کہ انجمن اسلام کی ایک اپنی تاریخ ہے اور گزشتہ چند سالوں میں اس نے تعلیمی میدان میں جو ترقی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حال ہی میں کئی میدان میں اس کے طلبا نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس ادارے میں ہندوستان بھر کے لوگ نمائندگی کرتے ہیں اور مسلمانوں کے ہر طبقے اور فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں ممبر ہیں۔ گزشتہ تین سال میں تین نئے کالج کھولے گئے جن میں فارمیسی کالج بھی شامل ہے۔ کئی نئی عمارتوں کا کام تکمیل کو پہنچا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اپریل 2014

ڈاکٹر نگار عظیم فکشن ایوارڈ 2014 سے سرفراز

چنڈی گڑھ: معروف افسانہ نگار محترمہ نگار عظیم صاحبہ کلب (رجسٹرڈ) مالیرکوٹلہ پنجاب کی دعوت پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض ناصر آزاد جنرل سکریٹری افسانہ کلب نے ادا کیے۔ صدارت کے لیے ڈاکٹر منظور حسن سکریٹری پنجاب اردو اکادمی نے شرکت کی۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر نگار عظیم موجود تھیں۔ افسانہ کلب نے ڈاکٹر نگار عظیم کی لمبی افسانوی خدمات اور مقبولیت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں برائے سال 2014 کے لیے اردو فکشن ایوارڈ مومنٹو اور سرٹیفکیٹ کی شکل میں پیش کر کے اپنا ادبی فریضہ ادا کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نگار عظیم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بعد میں ڈاکٹر منظور حسن نے خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے پنجاب اردو اکادمی کے بارے میں روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 15 اپریل 2014

ڈاکٹر عظیم راہی کو تکمیل مشتاق مومن فکشن ایوارڈ

اورنگ آباد: حال ہی میں سہ ماہی 'تکمیل' بھیونڈی نے اپنے سلور جبلی جشن کے موقعے پر جن معروف قلمکاروں کو اردو کی تاریخ ساز ادبی شخصیات سے موسوم تکمیل ایوارڈ سے نوازا ان میں اردو افسانچے کی صنف کو اس درجہ وقار و اعتبار عطا کرنے والے معروف افسانہ و افسانچہ نگار، نقاد، محقق اور کئی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر عظیم راہی کو ان کی طویل تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی، تصنیفی اور تعمیری خدمات کے اعتراف میں صف اول کے افسانہ نگار مرحوم مشتاق مومن سے موسوم مشتاق مومن فکشن ایوارڈ

سے سرفراز کیا گیا۔ افتتاحی سیشن کی صدارت مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری نے فرمائی جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر ریحان، اقبال نیازی، اسلم فقیہ پرنسپل ضیاء الرحمٰن، کامریڈ اسرار احمد انصاری، عبدالرشید طاہر مومن اور ڈاکٹر شیخ عبداللہ شریک محفل تھے۔ دیگر ایوارڈ یافتگان میں ڈاکٹر نذیر فتح پوری، انور قمر، یعقوب راہی، شاہد لطیف اور وکیل نجیب جیسے معروف قلم کار شامل تھے۔ ڈاکٹر عظیم راہی کے احباب نے اس ایوارڈ کے لیے انھیں مبارکباد پیش کی ہے۔

بذریعہ ڈاک: تفہیم الدین، روشن گیٹ، اورنگ آباد، اپریل 2014

ناظم علی، ادریکل پبلک اسکول کے ڈائریکٹر فہیم احمد، ریاض احمد شمسی اور راجیش کمار وغیرہ نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ نظامت کے فرائض ماسٹر محمد فیروز نے ادا کیے اور تمام شرکا کا شکریہ حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 اپریل 2014

پاپولر میرٹھی 2014 کا اکبرالہ آبادی ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے

پاپولر میرٹھی کو 2014 کا اکبرالہ آبادی ایوارڈ

دھرادون: اتراکھنڈ کے گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی نے ہری دوار میں ادبی اور ثقافتی تنظیم کی طرف سے منعقد مشاعرے میں شرکت کی۔ اس موقعے پر انھوں نے مشہور مزاحیہ شاعر ڈاکٹر پاپولر میرٹھی کو 2014 کا اکبرالہ آبادی ایوارڈ کے علاوہ 51 ہزار روپے کا چیک، یادگاری نشان دیے۔ اس موقعے پر گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی نے کہا کہ ہمارے شعرائے کرام نے ملک کی یکجہتی اور باہمی ہم آہنگی قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہی نہیں آزادی کی تحریک میں بھی اپنی تخلیقات کے ذریعے عام لوگوں میں قومیت کے جذبات کو بیدار کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اوم پرکاش نور، شاہد حسن، ڈاکٹر کمل کانت بدھکر، ڈاکٹر ممتاز سنگھ، یوسف ظہیر، سبھاش ملک، ثقلین جوالپوری، ڈاکٹر چھایا شکلا وغیرہ کے درمیان شاعر ڈاکٹر پاپولر میرٹھی نے اپنے خیالات کا اظہار کیے۔ نظامت افضل منگلوری نے کی۔ اس موقعے پر سنسکرت یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر مہاویر اگروال، بی ایچ ایل کے جنرل منیجر ڈاکٹر پرکاش چندر وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 مئی 2014

عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کا سالانہ تقسیم ایوارڈ جلسہ

نئی دھلی: اساتذہ کی عادات واطوار کا اثر بچوں پر براہِ راست پڑتا ہے اس لیے تعلیم گاہوں میں تربیت یافتہ اور باکردار اساتذہ کا ہی تقرر ہونا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ایمریٹس دہلی یونیورسٹی ڈاکٹر عبدالحق نے برہم پوری میں منعقد عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کا سالانہ جلسہ اور تقریب تقسیم ایوارڈ کے دوران کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی مولانا محمد رحمانی مدنی مہتمم جامعہ سنابل نے کہا کہ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی لازمی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اخلاقیات کے بغیر تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ معصوم مرادآبادی نے کہا بہتر سماج کے لیے بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کا ماحول غالب رہنا چاہیے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید احمد خاں نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ مقامی ایم ایل اے چودھری متین نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ اس موقعے پر جن حضرات کو ایوارڈز دیے گئے، ان میں ڈاکٹر ذکی الدین (حکیم الیاس خاں دہلویؒ ایوارڈ معالجاتی و تحقیقی خدمات)، ڈاکٹر ناہید پروین (حافظ حکیم فضل الدینؒ ایوارڈ برائے طبی و تحقیقی خدمات)، حکیم نورالدین قاسمی (مولانا عبداللہ مہاجر مدنی ایوارڈ برائے دواسازی)، قاری عبدالغفار (مولانا روض الدین قاسمیؒ ایوارڈ برائے ملی و تعلیمی خدمات)، نریندر کمار (حکیم سراج الدین ذکائی ایوارڈ برائے فوٹو جرنلزم) وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ شمال مشرقی دہلی کے 50 سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں کے تقریباً 350 فرسٹ کلاس پوزیشن پانے والے بچوں کو بھی انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر چودھری

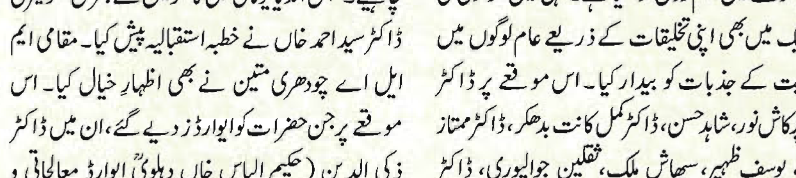

عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کا سالانہ تقسیم ایوارڈ جلسہ کا منظر

ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی انجمن ترقی اردو کے نائب صدر مقرر

امروھه: امروہہ کے کئی تعلیمی اداروں وسماجی سیاسی وثقافتی تنظیموں سے وابستہ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی کو انجمن ترقی اردو اتر پردیش کا نائب صدر مقرر کیا گیا ہے۔ انجمن کے امروہہ دفتر سے موصول اطلاعات کے مطابق انجمن ترقی اردو کے ریاستی صدر چودھری شرف الدین ومحمود الظفر جنرل سکریٹری نے ڈاکٹر ہاشمی کو مذکورہ ذمے داری سپرد کی ہے، اس سلسلے میں انجمن کے مقامی دفتر پر ایک مبارکبادی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ڈاکٹر ہاشمی کی ادبی خدمات کی پذیرائی کرتے ہوئے ممبران انجمن نے اس نئی ذمے داری پر موصوف کو مبارکباد بھی پیش کی ادر خوشی کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 23 اپریل 2014

شمس رمزی کو عبدالحکیم ایوارڈ

چنئی: عبدالحکیم مسلم ہائی اسکول چنئی میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ جس کے مہمان خصوصی شاعر شمس رمزی رہے۔ جب کہ شیبان قادری امروہوی، احسان مکرم پوری، صبا عزیز، انور بارہ بنکوی مہمانان ذی وقار رہے۔ مشاعرہ

میں ڈاکٹر جاویدہ حبیب، ڈاکٹر سید سجاد حسین، ڈاکٹر علیم صبا نویدی، انور بارہ بنکوی، رحمت آرا کراچی کی کتابوں کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ مشاعرے کی صدارت مختار بدری نے کی۔ مشاعرے میں شمس رمزی کو شعری ادبی صحافتی اور تنقیدی خدمات کے لیے عبدالحکیم ایوارڈ سے نوازا گیا، ان کے علاوہ شیبان قادری امروہوی، احسان مکرم پوری، صبا عزیز، انور بارہ بنکوی وغیرہ کو بھی اردو خدمات کے لیے عبدالحکیم ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مئی 2014

رسم اجرا:

'باتیں میر کارواں کی'

دھلی: نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری نے ممتاز عالم دین اور امیر شریعت بہار حضرت مولانا سید نظام الدین (جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کی حیات و خدمات پر مبنی نوجوان قلمکار و صحافی عارف اقبال کی تالیف کردہ تازہ ترین کتاب 'باتیں میر کارواں کی' کی رسم اجرا

'باتیں میر کارواں کی' کا نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری اجرا کرتے ہوئے

اپنی رہائش گاہ (وائس پریسیڈنٹ ہاؤس) میں انجام دی۔ اس موقعے پر انھوں نے مؤلف کتاب کو مبارکباد پیش کی اور اس اہم کام پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ماشاء اللہ اس کم عمر میں آپ نے بہت ہی اچھا اور عمدہ کام کیا ہے۔ انھوں نے مؤلف کتاب کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ ابھی آپ کو اور بھی بہت سارے علمی کام کرنا باقی ہیں۔ اس موقعے پر مفتی احمد نادر القاسمی (اسلامک فقہ اکادمی)، انجینئر محمد آصف رضا (دہلی) بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اپریل 2014

وحدت نامہ

سہارنپور: ڈاکٹر کیدار ناتھ پربھاکر نے وحدت نامہ جیسی اہم کتاب لکھ کر قابل تعریف کام کیا ہے۔ اس کتاب سے ہمیں تصوف کے بارے میں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پنجاب ہریانہ ہائی کورٹ کے جسٹس سوریہ کانت نے وحدت نامہ کے اجرا کے بعد رام تیرتھ ہال میں شہر اور بیرون شہر سے آئے اہل علم حضرات کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ جسٹس سوریہ کانت کے خطاب سے قبل وحدت نامہ کا اجرا سوریہ کانت بجنور کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج رضی احمد چشتی بی بی بلجیت کور حم سردار پی پی سنگھ موتی ڈاکٹر پی ڈی گرگ ڈاکٹر کے پی سنگھ ڈاکٹر سنت پرکاش سنگھ اور رام تیرتھ مرکز پاکستان چیئر کی آفس انچارج نکہت خاں کے ہاتھوں عمل میں آیا وحدت نامہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے جسٹس سوریہ کانت نے کہا کہ جو راستہ تصوف کا ہمیں رام تیرتھ نے دکھایا ہے اس پر چل کر ہی ہم ملک میں امن و آشتی کا ماحول بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وحدت نامہ ایک ریڈی میڈ ٹول ہے جو چار زبانوں میں تحریر کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وحدت کو سمجھنے کے لیے دماغ کا آلودگی سے پاک ہونا ضروری ہے رضی احمد چشتی نے کہا کہ وحدت نامہ رام تیرتھ کے کلام کا ایسا مجموعہ ہے جو انسان اور اللہ کے درمیان جو راز ہے اس کو بے پردہ کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے اندر جو آنکھ ہے اگر ہم اس کا استعمال کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ واحد ہے۔ رضی احمد چشتی نے کہا کہ اقبال اور سوامی رام تیرتھ دونوں ہی ہم اوست کے قائل تھے۔ انھوں نے کہا کہ انسان اور اللہ کے بیچ جو پردہ ہے اسی کو فنا کرنے کا نام وحدت ہے۔ وحدت نامہ کے مصنف ڈاکٹر کیدار ناتھ پربھاکر نے کہا کہ ہمارے اور اللہ کے بیچ سب سے بڑا حجاب یہ جلوئے ہیں جو اللہ نے تمام عالم میں کر رکھا ہے ہم اور آپ بھی جلوئے کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر مینا کشی موہن نے کہا کہ صرف کتابیں پڑھنے سے ہم بہت کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ امرتسر سے آئے بزرگ شاعر پی پی سنگھ موتی نے سوامی رام تیرتھ کا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 اپریل 2014

پروفیسر سید حسنین کے مونوگراف کا اجرا

نئی دھلی: مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کے شعبۂ اردو کے سابق صدر آنجہانی پروفیسر حسنین پر مونوگراف کا اجرا نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اجرا کا یہ پروگرام نائب صدر جمہوریہ کی رہائش گاہ کے آڈیٹوریم میں

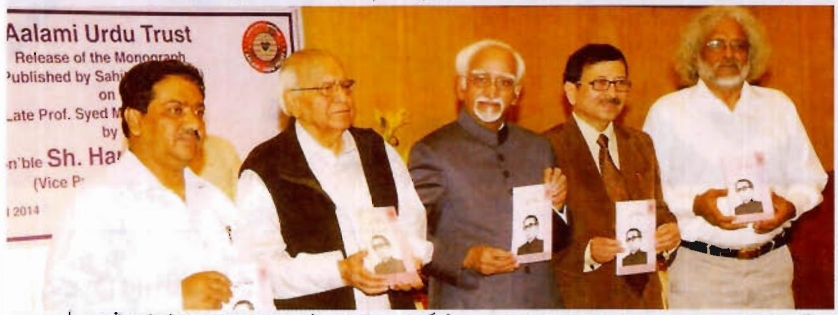

تصویر میں نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری، معروف نقاد و ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر سید احتشام حسنین، پروفیسر شہزاد انجم اور عالمی اردو ٹرسٹ کے بانی اے رحمن پروفیسر سید محمد حسنین کے مونوگراف کے اجرا کی تقریب کے دوران

عالمی اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا، جس میں ملک کی اردو ادب سے وابستہ اہم شخصیات، صحافی اور دانشوروں نے شرکت کی۔ یہ مونوگراف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر شہزاد انجم کے قلم کی تخلیق ہے جسے ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا ہے۔ اس موقعے پر نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے آنجہانی سید حسنین کی خدمات اور اردو ادب میں ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے اردو کے معروف نقاد و ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی اور پروفیسر حسنین کے تعلقات پر روشنی ڈالی اور یہ بھی کہا کہ پروفیسر حسنین کی خدمات نہ صرف اردو ادب بلکہ انڈین لٹریچر میں ناقابل فراموش ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر حسنین کے صاحبزادگان پروفیسر سید احتشام حسنین سابق وائس چانسلر حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی اور پروفیسر سید امتیاز حسنین نے بھی شرکت کی۔ پروفیسر سید احتشام نے عالمی اردو ٹرسٹ اور اس کے بانی و روح رواں اے رحمن کا شکریہ ادا کیا جن کی کاوشوں سے مذکورہ پروگرام ممکن ہو سکا۔ مذکورہ پروگرام میں جسٹس رفعت عالم، دوردرشن کے ڈائریکٹر جنرل ایس ایم خان، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی، مشہور شاعر چندر بھان خیال، ڈاکٹر مشتاق صدف اور معروف شاعر منور رانا نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 اپریل 2014

'دیوارِ قہقہہ'

نئی دھلی: دہلی کی ادبی تنظیم اور یکل ایجوکیشنل سوسائٹی کی طرف سے غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں معروف ادیب اور صحافی فاروق ارگلی کی تازہ ترین کتاب 'دیوارِ قہقہہ' کی رسم اجرا کے سلسلے میں ہمالیہ ڈرگس کے چیئرمین ڈاکٹر فاروق کی صدارت میں مجلسِ مذاکرہ اور 'شامِ قہقہہ' کے نام سے طنزیہ مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اردو کے عظیم طنز و مزاح نگار ادیبوں اور شاعروں کے فن و شخصیت پر مبنی دلچسپ تحقیقی کتاب 'دیوارِ قہقہہ' کی رسم اجرا ڈائرکٹر جنرل دوردرشن نیوز مسٹر ایس ایم خان نے انجام دی۔ اپنے خطاب میں مسٹر خان نے کہا کہ اردو زبان کو دنیا کی کوئی اردو دشمن طاقت نہیں مٹا سکتی۔ انھوں نے فاروق ارگلی کی ادبی خدمات کو تاریخ ساز اور ناقابلِ

فراموش قرار دیا۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ فاروق ارگلی نے اردو کی علمی ادبی شخصیات پر جو شاندار تحقیقی کام کیا ہے وہ اردو کی نوجوان نسل بلکہ دانشوروں اور تحقیق وتنقید کے کام کرنے والوں کے لیے بھی افادیت اور معلومات کا بہترین وسیلہ ہے۔ ممتاز محقق اور ادیب سید طالب زیدی نے فاروق ارگلی کی ادبی خدمات اور شخصیت پر اپنے دلچسپ مقالے میں انھیں دورِ حاضر میں اردو زبان و تہذیب کا محافظ و مجاہد قرار دیا۔ صحافی عزیز برنی نے بتایا کہ ان کے دورِ ادارت میں راشٹریہ سہارا کی جو شاندار خدمت انجام دی وہ اردو تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ اس موقعے پر فاروق ارگلی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اوریکل ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے فاروقی ارگلی کی عزت افزائی روایتی دستار بندی سے کی گئی اور ان کی پچاس سالہ ادبی صحافتی خدمات کے اعتراف میں خصوصی 'اردو ایوارڈ' اور 'ردائے ادب' سے سرفراز کیا گیا اور صدر جلسہ ڈاکٹر سید فاروق نے اپنی صدارتی تقریر میں فاروق ارگلی کی خدمات کو پوری اردو دنیا کے لیے باعثِ فخر قرار دیا۔ اس یادگار موقعے پر منعقد شامِ قہقہہ میں سید اسد رضا، اسرار جامعی، احمد علوی، ڈاکٹر نشتر امروہوی، اقبال فردوسی، ڈاکٹر رضی امروہوی اور پروفیسر خالد محمود نے اپنے طنزیہ مزاحیہ کلام سے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ نظامت کے فرائض پروگرام کنوینر ڈاکٹر ایم آر قاسمی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اپریل 2014

'دیوانِ شیدا'

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عبدالمجید خواجہ چیئر کے زیرِ اہتمام ان کے کلام 'دیوان شیدا' کی رسم رونمائی کرتے ہوئے جامعہ کے کارگزار وائس چانسلر پروفیسر ایس ایم ساجد نے کہا کہ جامعہ کے بانیان اور اکابرین نے تن من دھن کی قربانیاں دیں اور اس ادارے کو اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ انھی اکابرین میں سے ایک عبدالمجید خواجہ بھی تھے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی جامعہ کے لیے وقف کردی تھی۔ ان کے کلام 'دیوانِ شیدا' کی اشاعت سے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ انھوں نے دیوان کے مرتب پروفیسر شہزاد انجم کو مبارکباد پیش کی۔ عبدالمجید خواجہ چیئر کی یہ کوشش رہی ہے کہ خواجہ صاحب کے شعری سرمایے کو بھی منظرِ عام پر لایا جائے تاکہ ان کی شاعری سے لوگ واقف ہوسکیں۔ پروفیسر خالد محمود نے 'دیوانِ شیدا' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ شیدا کی شاعری کئی معنوں میں بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ دیوان شیدا کے مرتب پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ عبدالمجید خواجہ کی شاعری کا یہ مسودہ پریم چند آرکائیوز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں موجود ہے۔ اس مسودے اور کئی دیگر تحریروں کو پیش نظر رکھ کر اس دیوان کو ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کی طبیعت شعر گوئی کی طرف شروع سے مائل تھی۔ وہ تفننِ طبع کے طور پر اپنے اشعار لوگوں کو پڑھ کر سناتے اور اپنے پاس رکھ لیتے۔ پریم چند آرکائیوز جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ڈائریکٹر پروفیسر صبیحہ زیدی نے عبدالمجید خواجہ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر مفصل روشنی ڈالی۔ عبدالمجید خواجہ کے پوتے راجن حبیب خواجہ سابق سکریٹری حکومت ہند نے شیخ الجامعہ اور جامعہ کے سبھی دوستوں، بزرگوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مئی 2014

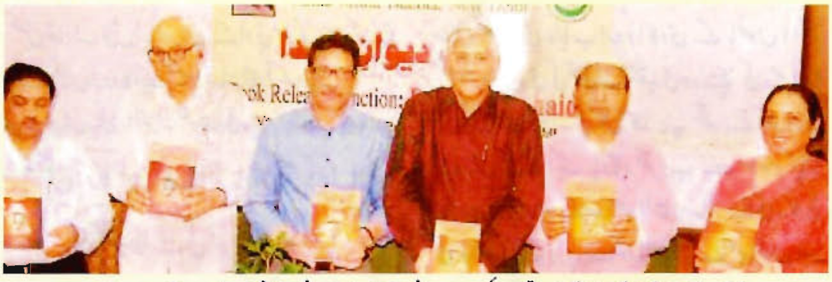

کتاب 'دیوان شیدا' کے اجرا کے موقعے پر دائیں سے پروفیسر صبیحہ زیدی، پروفیسر خالد محمود، جناب راجن حبیب خواجہ پروفیسر سید محمد ساجد، پروفیسر محمد ہاشم قریشی، پروفیسر شہزاد انجم

'چائے کی دوکان'

نئی دهلی: مشہور و معروف صحافی اور قلم کار جناب سالک دھامپوری کے طنز و مزاح کے مجموعہ 'چائے کی دوکان' کا 14 اپریل 2014 کو ممبئی میں حامد بلڈنگ، میں اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت معروف صحافی و اے پی فلم پروڈکشن کے ذمے دار آصف پلاسٹک والا نے کی۔ آصف پلاسٹک والا نے کہا کہ مالک دھامپوری سیاسی، سماجی، ادب، افسانہ، طنز و مزاح سے لے کر دینی و ملی موضوعات پر انتہائی ایمانداری اور بے باکی سے لکھا ہے۔ پروگرام کے اختتام پر نہال صغیر نے سبھی افراد کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 16 اپریل 2014

'جنگ آزادی کے مجاہد کون'

مراد آباد: مراد آباد کی سرزمین جس نے بڑے بڑے سیاست دانوں شاعروں اور مصنف پیدا کیے تو تاریخ کو یاد رکھنے والے کو ایسے لوگوں کو بھی پیدا کیا جنھوں نے آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اردو صحافت نے ہندوستان کی آزادی میں اپنا کیا کردار ادا کیا جس کو کتابوں کی صورت میں پیش کیا۔ اس تعلق سے نگر نگم ہال میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ جشن میں جنگ آزادی کے مجاہد کون کا اجرا بھی عمل میں آیا اس کتاب کے مصنف مرتضیٰ اقبال تھے پروگرام کی سرپرستی شعبہ اردو ایم ایچ ڈگری کالج کے صدر ریٹائرڈ پروفیسر صابر سنبھلی نے کی۔ صدر جلسہ مولانا رئیس اشرف نے جمہوریت میں صحافت اور صحافت کی ذمے داری اور صحافت کی تفصیل کا ذکر کرتے ہوئے اس کی مشکلات اور اس کی اہمیت پر زور دیا۔ مہمانِ خصوصی روزنامہ آگ کے ایڈیٹر احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ صحافت کل بھی اہم تھی اور آج بھی اس کا اہم مقام ہے اور اس کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 21 اپریل 2014

'کاماریڈی ماضی اور حال کے آئینے میں'

نظام آباد: کاماریڈی ضلع نظام آباد کے نامور افسانہ نگار، ادیب اور محقق رحیم انور کی نویں تصنیف 'کاماریڈی ماضی اور حال کے آئینے میں' کی رسم اجرا 5 اپریل فاروقی ہال بمکان ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اردو گری راج

گورنمنٹ کالج اسلام پورہ کھوجہ کالونی بزرگ شاعر و مدیر گونج جناب جمیل نظام آبادی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ناظم علی پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ نے رحیم انور کی منی کہانیوں کی بھرپور ستائش کی اور منی کہانی کو اردو افسانہ کا متبادل قرار دیا۔ جناب جمیل نظام آبادی نے رحیم انور کا

مکمل تعارف پیش کیا اور ان کے ادبی سفر کو بیان کرتے ہوئے انھیں اردو کا ایک عظیم افسانہ نگار قرار دیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی، نظام آباد، 7 اپریل 2014

نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں ترکی زبان کے مخطوطات کی فہرست کا اجرا

نئی دھلی: رضا لائبریری رامپور کی مختلف زبانوں کے مخطوطات کی فہرست سازی مہم کے تحت نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی میں ترکی زبان کے مخطوطات کی فہرست کی رسم اجرا رویندر سنگھ آئی اے ایس سکریٹری وزارت ثقافت، حکومت ہند کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس سے قبل اردو، فارسی اور پشتو زبان کے مخطوطات کی فہرست بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے رویندر سنگھ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں پروفیسر عزیز الدین حسین ڈائرکٹر رضا لائبریری رامپور کو مبارکباد دینا چاہوں گا، کیونکہ یہ نہایت ہی اہم کارنامہ ہے۔ عزیز الدین اس طرح کے کام کرتے رہتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ اسی طرح آگے جاری و ساری رہے گا۔ آخر میں ارون کمار سکسینہ نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2014

تنقیدی دریچے

مالیرکوٹله: گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن مالیرکوٹلہ پنجاب کی بزم اردو کی جانب سے بیسویں صدی کی ایڈیٹر ڈاکٹر شمع افروز زیدی اور دلی اردو اکادمی کی سابق رکن ڈاکٹر نگار عظیم کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب منعقد ہوئی۔ بزم اردو کے سرپرست اور کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد اقبال نے دونوں قلمکاروں کا حاضرین سے تعارف کراتے ہوئے ان کی تخلیقی اور تصنیفی خدمات سے روشناس کرایا۔ انھوں نے بیسویں صدی میگزین کی تاریخی اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اسے زندہ رکھنے کے لیے ڈاکٹر شمع افروز زیدی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ تقریب کی صدارت پرنسپل کلدیپ سنگھ سیکھوں نے کی۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے تقریب کو خطاب کرتے ہوئے مصوری اور تختہ سیاہ پر لکھنے کے زور پر بھی روشنی ڈالی اور اپنا کلام سنا کر حاضرین سے خوب داد لی۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے تدریس اردو کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مالیرکوٹلہ میں اردو زبان وادب کی آبیاری پر اظہار مسرت کیا۔ تقریب میں پرنسپل ڈاکٹر محمد اقبال سابق سکریٹری پنجاب اردو اکادمی کے ہاتھوں ڈاکٹر شمع افروز زیدی کی تصنیف 'تنقیدی دریچے' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ پرنسپل کلدیپ سنگھ نے صدارتی خطبے میں اسے ایک یادگار تقریب سے موسوم کیا۔ نظامت بزم اردو کے صدر عبدالستار مسافر نے کی۔ کالج کی جانب سے ہرپریت کور ڈھلوں نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 اپریل 2014

'دستکوں کے نشان'

نئی دھلی: نئی نسل کے معروف شاعر اور انجمن محبان اردو ہند قطر کے نائب صدر ندیم ماہر کے شعری مجموعہ

'دستکوں کے نشان' کا اجرا یہاں ایمس کے سابق صدر شعبہ آرتھوپیڈکس پروفیسر محمد فاروق کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ڈاکٹر شہپر رسول نے کہا کہ ندیم ماہر کا مجموعہ شاعری 'دستکوں کے نشان' اصل میں فن کی دستکوں کو سامعین کے گوش گزار کرنے کے ضمن میں بہترین وسیلہ ثابت ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ندیم ماہر بہت تازہ کار اور خوش کار لہجے کے شاعر ہیں۔ اس موقعے پر آئیڈیا کمیونیکیشنز کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے کہا کہ ندیم ماہر کی ادبی و سماجی خدمات کا دائرہ ہندوستان سے لے کر خلیج ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قطر کے بے حد فعال صدر ہیں اور قطر میں اردو کی بستی کو آباد و شاد رکھنے میں ان کا رول بے حد اہم ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اپریل 2014

ڈاکٹر یاسر ندیم کی دونئی کتابوں کی رسم اجرا

دیوبند: عصر حاضر کے محقق، مصنف اور دارالعلوم دیوبند کے نوجوان فاضل ڈاکٹر مفتی یاسر ندیم الواجدی کی دونئی کتابوں کا اجرا 'حرا گارڈن' میں عمل میں آیا۔ 1300 صفحات اور 75 ہزار عربی، انگریزی اور اردو اندراجات پر مشتمل 'القاموس العصری' اور دوسری کتاب 'تجدید دین شریعت اور تاریخ کی روشنی میں' کا اجرا امریکہ سے تشریف لائے مولانا قاری عبداللہ سلیم مدیر معہد تعلیم الاسلام شکاگو امریکہ و سابق صدر القراء دارالعلوم دیوبند اور مفتی ابوالقاسم نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر دارالعلوم وقف دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا سید احمد خضر مسعودی کشمیری نے مصنف کی ان دونوں کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کیا، بالخصوص 'تجدید دین' کو انھوں نے اپنی نوعیت کا منفرد کارنامہ قرار دیا، انھوں نے حلقۂ دیوبند کے مجددین پر بصیرت افروز روشنی ڈالی اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو جامع المجددین قرار دیا، دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا خضر محمد کشمیری نے اپنے خطاب میں علم کو اس امت کی امتیازی خصوصیت قرار دیا اور یاسر ندیم کی ان دونوں کتابوں کو علم کے اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی بتایا، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے استاذ اور کل ہند فقہ اکادمی کے سکریٹری مولانا عتیق احمد بستوی نے اپنے بصیرت افروز خطاب میں کہا کہ یاسر ندیم الواجدی کی یہ دونوں کتابیں اپنے موضوع پر بالکل اچھوتی اور منفرد ہیں۔ اجلاس کی صدارت کررہے مولانا ابوالقاسم نعمانی نے مصنف اور ان کے والد اور ان کے خاندان کے افراد کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تجدید دین کا مطالعہ کیا ہے اور میں پوری بصیرت کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ مصنف نے اپنے اسلاف کے منہج سے سرمو بھی انحراف نہیں کیا۔ اس تقریب میں امریکہ سے تشریف لائے مولانا عبدالرحمٰن سلیم، مولانا سعد سلیم اور مولانا سلیمان سلیم، اور مولانا احمد متین اور مولانا محمد امین (الہ آباد) وغیرہ نے بھی بطور خاص شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 اپریل 2014

'رنگ و آہنگ'

رتناگری: محمد دانش غنی کے تحقیقی، تنقیدی اور تاثراتی مضامین کا مجموعہ 'رنگ و آہنگ' کا اجرا گوگٹے جوگیلکر

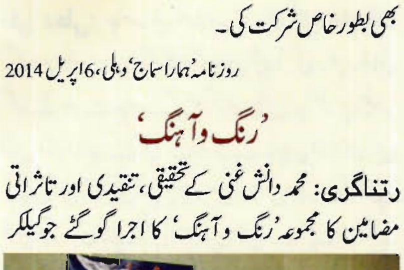

کالج، رتناگری کے زیر اہتمام عمل میں آیا۔ اجرا کی رسم کالج ہذا کے پرنسپل ڈاکٹر سبھاش دیوصاحب نے ادا کی

ستار فیضی کی کتاب 'دھنک' کے اجرا کا منظر

اورانھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ دانش جیسا نوجوان اور باصلاحیت شخص ہمارے کالج کا ایک حصہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ دانش کی یہ کتاب اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ادب کے تئیں سنجیدہ ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ان کی اس طرح کی کاوشیں ہمارے سامنے آتی رہیں گی۔

پریس ریلیز، محمد دانش غنی گوگیٹ جوگلیکر کالج، رتنا گیری، 18 مارچ 2014

دھنک

کڈپہ: ہندوستان کی اردو ڈرامہ نگاری وادب اطفال میں کڈپہ ضلع کے ادیب یوسف صفی، شاعر ستار فیضی نے قومی سطح پر اپنی شناخت اردو ادب میں پیدا کی۔ ڈرامہ کی صنف پر پوری توجہ کے ساتھ کام کرنے میں یوسف صفی ادب اطفال میں خصوصی مقام حاصل کیا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر مظفر شہ میری صدر شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدر آباد نے کیا۔ کڈپہ میں اردو کلچرل اینڈ لٹریری ایسوسی ایشن کا 37 واں سالانہ جلسہ نیک نام خان کلا چھترم میں منعقد ہوا جس میں کڈپہ کے مشہور شاعر ستار فیضی کی ادب اطفال کی کتاب 'دھنک' کا رسم اجرا مظفر شہ میری کے ہاتھوں سے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ یہ دونوں ایلسما اردو ادب کی دو آنکھیں ہیں۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تروپتی جامعہ وینکٹیشور صدر شعبۂ اردو پروفیسر ستار ساحر اور کیرالا ریاست کی شنکر آچاریہ یونیورسٹی کے پروفیسر عطاء اللہ سنجری کی حیثیت سے شامل ہوئے۔

بذریعہ ڈاک: ڈاکٹر اقبال خسرو، معتمد عمومی، کڈپہ، آندھرا پردیش، 9 مارچ 2014

'پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا'

علی گڑھ: بزم ادب خواتین علی گڑھ کی ماہ اپریل کی ادبی نشست ممتاز شاعرہ بیگم صبیحہ سنبل کی رہائش گاہ میرس روڈ پر واقع 'اسکوائر ٹاور' پر منعقد ہوئی جس میں ممتاز شاعرہ اور افسانہ نگار بیگم آصف اظہار علی کے دوسرے افسانوی مجموعہ 'پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا' کا اجرا لیڈیز کلب کی سکریٹری بیگم عذرا فاروقی کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ بزم کی سکریٹری بیگم راشدہ خلیل نے بیگم آصف اظہار علی کے دوسرے افسانوی مجموعہ پر تحریر کردہ اپنے مضمون میں کہا کہ بیگم آصف اس بزم کی دیرینہ رکن ہیں اور انھوں نے بزم کو مستحکم اور معتبر بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ بیگم آصف اظہار علی نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا جب کہ صبیحہ سنبل نے اپنی نئی غزل پیش کی۔ آخر میں بزم کی سکریٹری محترمہ راشدہ خلیل نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 29 اپریل 2014

'شیشہ احساس' اور 'گستاخی معاف'

انجمن اردو دنیا کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید مجیب الرحمٰن بزمی کے دو شعری مجموعے 'شیشہ احساس' (سنجیدہ کلام) اور

'گستاخی معاف' (طنزیہ ومزاحیہ کلام) کی رسم اجرا مقامی محمد علی جوہر اکادمی دھوروا رانچی کے جلسہ گاہ میں کی گئی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے رانچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر پروفیسر انوار احمد خاں نے شرکت کی۔ مرکز ادب وسائنس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر احمد سجاد نے جلسے کی صدارت کی اور صدر انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ پروفیسر ابوذر عثمانی نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ مذکورہ حضرات نے اس موقعے پر بزمی صاحب کی شاعری اور ان کے دونوں مجموعہ کلام پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے انھیں صالح فکر اور مشرقی اقدار کا ترجمان بتاتے ہوئے ایک کہنہ مشق شاعر قرار دیا۔

بذریعہ ڈاک: سید مجیب الرحمٰن بزمی، رانچی، جھارکھنڈ، 10 اپریل 2014

وفیات

سید شکیل دسنوی

کٹک: اردو کے مشہور وممتاز شاعر، ادیب اور نقاد سیّد شکیل دسنوی کا 4 اپریل 2014 کی شب 12 بجے اشونی اسپتال کٹک (اڑیسہ) میں انتقال ہوگیا۔ تدفین قدم رسول قبرستان میں ہوئی۔ ان کی عمر 73 برس تھی۔ وہ گزشتہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ پسماندگان میں چار بھائی عقیل منظر حسن، فرید منظر حسن، نفیس منظر حسن، رفیق منظر حسن

کے علاوہ دو بیٹے آصف شکیل اور راشد حسن ہیں۔ سیّد شکیل دسنوی کی پیدائش مرکز علم وادب دِسنہ (بہار) میں 20 فروری 1941 کو ہوئی تھی۔ مرحوم پیشے سے اِنجینئر تھے مگر مزاج شاعرانہ رکھتے تھے۔ موصوف کے چار اہم شعری مجموعے 'زندگی اے زندگی' (1981)، 'تنہا تنہا' (1989)، 'کتنی حقیقت کتنا خواب' (2005) اور 'دلِ ناآشنا' (2006) کے علاوہ 'اندازِ بیاں اپنا'، 'باز دید' اور سانجھ بھئی چودیش شائع ہوکر اہل نظر سے داد وتحسین حاصل کرچکے ہیں۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر معصوم شرقی، اڑیسہ، 5 اپریل 2014

منصور عمر

دربھنگہ: یہ خبر باعث غم واندوہ ہے کہ اردو کے معروف شاعر وناقد پروفیسر منصور عمر کا انتقال 23 اپریل کو دن کے دس بجے پٹنہ میں ہوگیا۔ پروفیسر منصور عمر ایک صاف گو انسان تھے اور ان کی تحریروں میں حق بیانی جھلکتی تھی۔ انھوں نے رانچی یونیورسٹی رانچی سے ایم اے، پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی اور 1982 میں ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں بحیثیت اردو لیکچرر بحال ہوئے تھے۔ وہ 1982 سے ہی دربھنگہ شہر کے سی ایم کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ رہے۔ ان دنوں وہ صدر شعبہ بھی تھے۔ ان کی نصف درجن تنقیدی وتحقیقی کتابیں اور شعری مجموعے

منظرعام پر آچکے ہیں جوان کی تنقیدی وتحقیقی بصارت اور تخلیقی ذہن کے آئینے دار ہیں۔ بالخصوص اختر انصاری پر ان کی تحقیقی کتاب وحوالہ جاتی کتب کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر منصور عمر ایک فعال شخصیت کے حامل تھے، انھیں علم عروض پر عبور حاصل تھا۔ ان کے شعری مجموعے 'گرم سورج کا لہو، ردائے ہنر، باغ خوش اسلوبی، علمی حلقے میں قبولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ کتاب بہار کے چند نامور شعرا پروفیسر منصور عمر اور ڈاکٹر مظفر مہدی نے مشترکہ طور پر ترتیب دی تھی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 24 اپریل 2014

اطہر سہارنپوری

نئی دھلی: جعفرآباد کی کشمیری بلڈنگ علاقے میں رہنے والے معروف شاعر اطہر حسین جعفری (اطہر سہارنپوری) کے نارائنا فیکٹری میں اچانک حادثے کا شکار ہونے سے موت ہوگئی۔ مرحوم کی عمر 70 برس تھی۔ پسماندگان میں بیوہ سمیت دولڑکیاں اور دولڑکے محمد انجم جعفری اور انور جعفری جو کئی برسوں سے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شعر و شاعری اور اردو صحافت سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اطہر سہارنپوری کی نعت، غزل، نظم اور مرثیہ کے بہترین شاعر تھے جن کے کئی شعری مجموعے منظرعام پر آچکے ہیں۔ مرحوم کے لڑکوں نے مزید بتایا کہ والد مرحوم برسوں سے نارائنا واقع فیکٹری میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے جہاں ان کے سر پر اچانک لوہے کی وزنی چیز آگری جس سے موقعے پر ہی موت ہوگئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اپریل 2014

عبدالرب کاردار

نئی دھلی: ماہر تعلیم، نامور ڈرامہ نگار 'عبدالرب کاردار' مورخہ 18 اپریل 2014 کو شب سینے کے انفیکشن کے سبب بی ایل کپور ہسپتال پوسارروڈ میں انتقال کرگئے۔ کاردار صاحب نے مان جاؤ بیگ، سنگ تراش اور غالب کی واپسی جیسے مشہور ڈرامے لکھے تھے، جنھیں متعدد مرتبہ اسٹیج کیا گیا۔ غالب کی واپسی 6 سے زیادہ مرتبہ ایوانِ غالب دہلی میں 'ہم سب ڈرامہ گروپ' کے ذریعے پیش کیا گیا اور ارباب علم وفن سے خوب داد و تحسین حاصل کی تھی۔ آپ نے بحیثیت اردو استاد سرودیہ بال ودیالیہ نمبر 1 جامع مسجد دہلی، ہمدرد پبلک اسکول، نیوہورائزن اسکول نظام الدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل اسکول جعفرآباد میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 22 اپریل 2014

صوفی عبدالعزیز قادری

سھارنپور: مشہور شاعر ومزاح نگار اور صحافی نصرت ظہیر کے والد صوفی عبدالعزیز قادری کا 86 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انھیں چند روز قبل طبیعت بگڑنے پر سرکاری اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ مرحوم کے انتقال

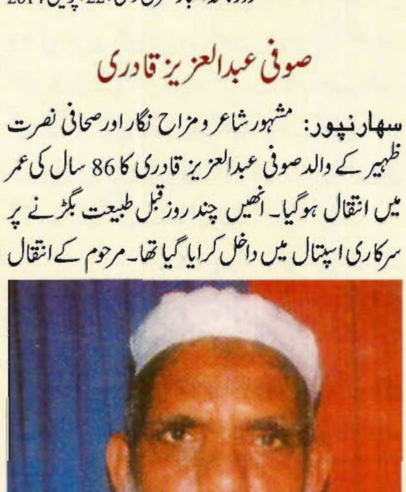

پر انجمن زندہ دلان سہارنپور اور انچ مقبول میموریل سوسائٹی نے رنج وغم کا اظہار کیا۔ نصرت ظہیر طویل عرصے سے دہلی میں قیام پذیر ہیں اور قومی اردو کونسل کے رسالے 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' سے وابستہ ہیں۔ کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے صوفی صاحب کے انتقال پر اظہارِ تعزیت کیا۔ انچ مقبول میموریل سوسائٹی کی جانب سے جاری تعزیتی تحریر میں مرحوم کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا ہے۔ انجمن زندہ دلان سہارنپور کی تعزیتی میٹنگ قاری اسحاق حافظ سہارنپوری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ قاری اسحاق مرحوم سے قریبی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ عمدہ شاعر تھے۔ ان کا نعتوں کا مجموعہ 'توفیق ثنا' منظرعام پر آکر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کرچکا ہے۔ قومی کمیشن برائے لسانی اقلیات کے کمشنر پروفیسر اختر الواسع نے بھی ان کے انتقال پر گہرے غم کا اظہار کیا۔ تین سال قبل سہارنپور میں ان ہی کے ہاتھوں 'توفیق ثنا' کا اجرا عمل میں آیا تھا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اپریل 2014

خراجِ عقیدت

قمر رئیس کی پانچویں برسی

نئی دھلی: معروف نقاد اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر قمر رئیس کی پانچویں برسی کے موقعے پر شعبے کے اساتذہ نے ان کی خدمات کے

اعتراف میں یادگاری جلسہ منعقد کیا۔ پروفیسر قمر رئیس نے شعبے میں 1959 سے 1997 تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ وہ ایک متنوع شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے بتایا کہ پروفیسر قمر رئیس نہ صرف معروف نقاد تھے بلکہ ایک شفیق استاد بھی تھے۔ ان کے دورِ صدارت میں شعبۂ اردو نے پوری اردو دنیا میں ایک خاص وقار حاصل کیا۔ انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے عالمی سطح پر نمایاں کام انجام دیا اور وہ کئی برس تک ازبکستان میں درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ پروفیسر قمر رئیس ایک عرصے تک انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری رہے اور مشترکہ تہذیب واقدار کی نمائندگی عالمی سطح پر کرتے رہے۔ ترقی پسندی کے حوالے سے وہ برصغیر کی ایک نمایاں شخصیت تھے۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے بحیثیت تنقید نگار ان کی حیثیت کو نمایاں کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں پریم چند تنقید پر انھوں نے خصوصی توجہ دی، لیکن ان کی زیادہ دلچسپی ترقی پسند نظریات کے فروغ میں تھی۔ اس کے علاوہ دیگر اساتذہ نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اپریل 2014